زندگی کے ساتھ ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

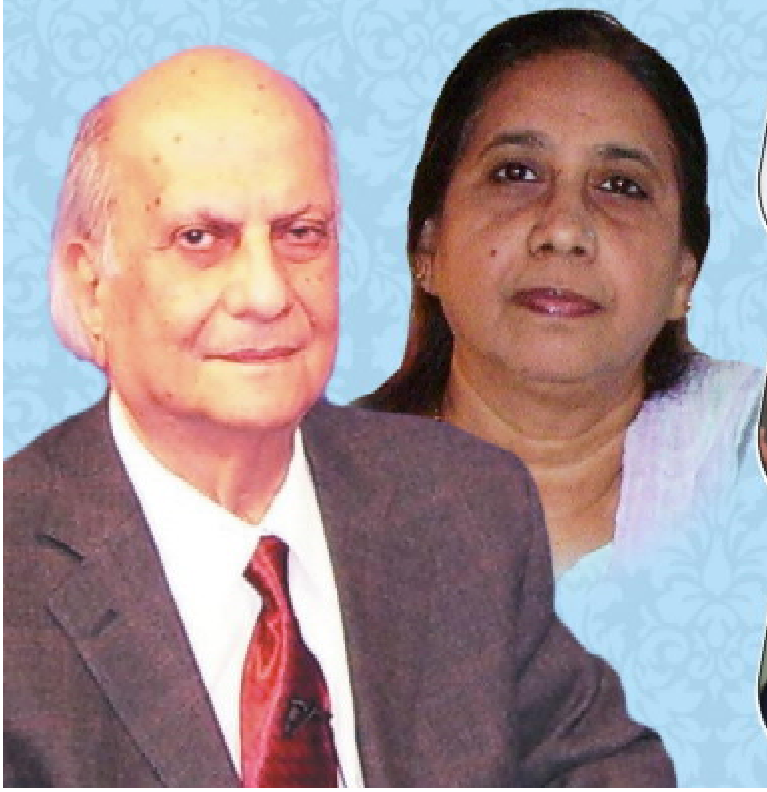

..... بند گلی میں شام .....

''بند گلی میں شام'' ایک ایسے لکھنے والے کی یادداشتوں پر مبنی تحریر ہے، جنہوں نے اپنی افتادِ طبع کے سبب خود کو شعر و ادب کے وقتی ہنگاموں سے ہمیشہ دور رکھا، مگر اپنی تخلیقات کی بدولت اردو ادب کے قاری اور ناقد کو اپنی موجودگی کا برابر احساس دلاتے رہے۔ یادنگاری ایک طرح سے خود کو آواز دینا ہے یا پھر گزرے ہوئے کل کو پکارنا۔ توصیف تبسم کو اپنے طویل ادبی سفر میں بعض معروف اور غیر معروف ادبی شخصیات کو قریب سے دیکھنے، اُن کی دلچسپ باتیں سننے اور اُن سے گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ اُنہوں نے اِن تمام باتوں کو کمال دیانتداری سے بعد میں آنے والوں کے سپرد کر دیا ہے کہ ''بند گلی میں شام'' لکھنے والے کی مختصر سوانح ہی نہیں بلکہ کسی حد تک اُن کے اپنے عہد کی اجمالی ادبی تاریخ بھی بن گئی ہے۔ تحقیقی نقطۂ نظر سے بھی یہ کتاب اہم ہے کیونکہ اس میں بعض بڑی ادبی شخصیات کے بارے میں ایسی باتیں محفوظ ہو گئی ہیں جو کہیں اور دستیاب نہیں۔ پیرایۂ بیان اتنا دلچسپ ہے کہ بیان کردہ حقائق و واقعات پر کہانی کا سا گمان ہوتا ہے۔

..... آفتاب اقبال شمیم

دستیابی: عکاس پبلی کیشنز، اسلام آباد۔ قیمت: ۳۵۰ روپے

..... تیری آنکھوں کے ساتھ۔۔میں .....

محترمہ عذرا اصغر کی زندگی کا یہ اجمال میں نے اس لیے پیش کیا ہے کہ ''تیری آنکھوں کے ساتھ.....میں'' کے عنوان سے اب جو نثر پارہ میرے سامنے ہے یہ اصغر مہدی کی وفات کے بعد پرانے کاغذات سے برآمد ہوا ہے۔ عذرا اصغر نے اسے 1997ء میں لکھنا شروع کیا تھا، لیکن اس کو اختتام تک نہیں پہنچایا تھا۔ وجہ شاید یہ تھی کہ اصغر مہدی کے ساتھ ان کا سفر حیات جاری تھا اور اس تحریر میں مزید اضافہ کے امکانات موجود تھے۔ لیکن جب یہ تحریر بازیافت ہوئی تو اصغر مہدی مختصر سی علالت کے بعد اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور اس نثر پارے میں عذرا اصغر کی اپنی یادوں کے علاوہ وہ خطوط بھی محفوظ تھے جو اصغر مہدی نے کم نویس ہونے کے باوجود انڈونیشیا سے موجی، مالی کی دادو اور ڈوڈو، ایا کی نانو صاحبہ کو تسلیم کہہ کر تفصیل سے لکھتے تھے۔ اپنی بیگم کے نام لکھے گئے ان ذاتی خطوط میں ایسی کیفیات ہیں جو فطرت کے دل خوش کن نظارے سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگر الگ چھپتے تو خطوط کی ٹیکنیک میں یہ ''شوہر نامے'' سفر نامے سے بھی موسوم کیے جا سکتے تھے لیکن عذرا اصغر نے اپنے ماضی کی بازیافت سے اسے ذاتی یادوں کا گہوارہ بنا دیا ہے۔

..... ڈاکٹر انور سدید

دستیابی: 14۔ رحمان ہاؤسنگ سوسائٹی۔ B.O.R جوہر ٹاؤن لاہور۔ قیمت: ۱۵۰ روپے

..... یہ اقبالیے .....

شجاع الدین غوری صاحب نے جس خوش ذوقی اور عرق ریزی کے ساتھ اقبالؔ کے حوالے سے مزاحیہ تحریروں کو یکجا کیا ہے، اُس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ ہر مضمون دلچسپ اور معلوماتی ہے اور اس حقیقت کا غماز ہے کہ جو ذرّہ جس جگہ ہے، وہیں آفتاب ہے۔ مزاح نگاروں نے اقبالؔ کے کلام کے ایسے ایسے پہلو دریافت کیے ہیں اور اُن پر ایسی ایسی ماہرانہ خامہ فرسائی کی ہے کہ پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ میں اتنی عمدہ دستاویز پیش کرنے پر آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اقبالؔ کے افکار پر فلسفیانہ انداز میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا، لیکن اِس اَدبی کاوش کی انفرادیت اور اوّلیت بہر حال برقرار رہے گی۔

..... ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ معین۔ قریشی

دستیابی: فضلی بک، ویلکم بک کراچی۔ بک ہوم لاہور، اشرف بک راولپنڈی۔ قیمت: ۱۷۰ روپے

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۲۰، شمارہ: ستمبر، اکتوبر ۲۰۱۱ء

بانی مدیر اعلیٰ
سید ضمیر جعفری

○○○

مدیر مسؤل
گلزار جاوید

○○

مدیران معاون
بینا جاوید
فاری شا
محمد انعام الحق

○

مجلسِ مشاورت

○○○

قارئین چہارسُو

○○○

زرِ سالانہ

○○○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

○

رابطہ: 537/D-1، ویسٹریج-III، راولپنڈی، پاکستان۔
فون: (+92)-51-5462495,5490181
فیکس: (+92)-5562022
موبائل: (+92)-333-5358114
ای۔میل: chaharsu@gmail.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شعیب حیدر زیدی

تزئین ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عظمیٰ رشید

کمپوزنگ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تنویرالحق

قرطاسِ اعزازِ افضل

آنکھوں کی زباں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اقبال بھٹی ۶

تمنائے ثمر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عبداللہ جاوید ۹

براہِ راست ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ گلزار جاوید ۱۰

تمثال نگاری ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ستیہ پال آنند ۱۵

خلوت خانۂ دل ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اکرام بریلوی ۲۱

حصارِ امکاں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ الیاس عشقی ۲۷

چمکا جو چاند ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ صابر وسیم ۲۹

بھاگتے لمحے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اے خیام ۳۰

عبداللہ جاوید کے افسانے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مبین مرزا ۳۱

چاند کمہلا گیا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فیصل عظیم ۳۳

دخترِ آب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عبداللہ جاوید ۳۷

ماہ و نجم کا رشتہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فاری شا ۴۵

قرطاسِ اعزازِ اعلیٰ

مجلسِ چہارسو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عطیہ سکندر علی ۴۷

چراغِ رُخِ زیبا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شہناز خانم عابدی ۴۹

شبنمی اسلوب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تسلیم الٰہی زلفی ۵۲

خواب کا رشتہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ توقیر حسن ۵۵

میانِ خواب و حقیقت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شفیق احمد شفیق ۵۷

حقیقت زندگی ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سہیل جاوید ۶۰

نیاگرا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شہناز خانم عابدی ۶۱

خیال خاطر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عروب شاہد ۶۸

طلوعِ خورشید

توصیف تبسم، امین راحت چغتائی۔ ۷۰

افسانے

اسطوخودوس ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شاہد جمیل ۷۱

قصور کس کا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شائستہ عالم ۷۴

گڑیا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عمران مشتاق ۷۵

مدد چاہتی ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ رینو بہل ۷۷

قیامت کی چال ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ گلزار جاوید ۸۰

حیرت سرائے

شہریار، امین راحت چغتائی، منظر ایوبی، سعید قیس، سرور انبالوی، خیال آفاقی، جین جوہر، آصف ثاقب، شباب للت، حسن عسکری، مہندر پرتاپ چاند، قیصر نجفی، مناظر عاشق، سجاد مرزا۔ ۸۳

خاکہ

یاد کرتا ہے زمانہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ نند کشور وکرم ۹۱

پتھریلی زمیں

پرواز انبالوی، خورشید رضوی، عارف شفیق، زہیر کنجاہی، ندیم ہاشمی، سیفی سرونجی، ابراہیم اشک، نوید سروش، حفیظ انجم، ارشد محمود، کرشن گوتم، نعیم الدین ظفر، رضی محمد، مراق مرزا، زاہدہ عابد۔ ۹۳

ہوا کے دوش پر

عام آدمی کی داستان حیات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ فیروز عالم ۹۸

فکرِ فردا

نبیؐ کا گھر منور ہو گیا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ صفوت علی صفوت ۱۰۴

مجلسِ شورہ

ستیہ پال آنند، توصیف تبسم، گلزار، منظور ثاقب، یونس صابر، نوشی گیلانی، کوثر صدیقی، انوار فیروز، یوگیندر بہل تشنہ، حسن عسکری، رب نواز مائل، جہانگیر اشرف، روپا صبا۔ ۱۰۵

ایک صدی کا قصہ

تن بوس ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ دیپک کنول ۱۱۲

ورثہ

مولانا الطاف حسین حالی، عبدالمجید سالک ۱۱۵

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وقار جاوید ۱۱۶

قرطاسِ اعزاز

نام: محمد عبداللہ خاں جاوید

قلمی نام: ا۔جاوید یوسف زئی (ساٹھ کی دہائی کے وسط تک)
۲۔عبداللہ جاویدؔ (زبان خلق کی عطا)

پیدائش: غازی آباد (یو۔پی۔بھارت) ۱۶ دسمبر ۱۹۳۱

والد: محمد اسمٰعیل خاں (مرحوم)

والدہ: شمس النساء بیگم (مرحومہ)

اجداد: ددھیال۔یوسف زئی افغان، ننھیال۔ایرانی

تعلیم: ایم۔اے۔انگریزی وامریکی ادب، ایم۔اے اردو، ایل ایل۔بی

پیشہ: ا۔وکالت ۲۔تدریس

قلمی ابتداء: ۴۲۔۱۹۴۱

استعداد: شاعری، افسانہ نگاری (اردو۔انگریزی) ڈرامے، تنقید (اردو)

کالم نگاری: روزنامہ جنگ۔ ہفتہ وار اعظم (کراچی)۔ روزنامہ جسارت (کراچی)۔ ہفتہ وار ٹورانٹو ٹائمز۔ ہفتہ وار اردو پوسٹ (ٹورنٹو)۔

تصانیف: بیادِ اقبال (مضامین) ۱۹۶۹
موجِ صدرنگ (شاعری) ۱۹۶۹
حصارِ امکاں (شاعری) ۲۰۰۳
خواب سماں (شاعری) ۲۰۰۶
بھاگتے لمحے (افسانے) ۲۰۱۰

زیرِ ترتیب: تنقیدی مضامین
کالمے اور انشائیے (انتخاب)
ادبی کالم (انتخاب)
ادبی مضامین اور خاکے (انتخاب)
افسانے (انتخاب)

نام: شہناز خانم عابدی

شریکِ حیات: عبداللہ جاوید

پیدائش: جھانسی (انڈیا)

والد: سید اصغر علی عابدی

والدہ: سروری بیگم

وطنیت: سندھ۔پاکستان

تعلیم: ایم۔اے اردو ادبیات (جامع سندھ)
بی۔ایڈ (جامع سندھ)
ڈی۔ایچ۔ایم۔ایس (ہومیو پیتھک کونسل۔پاکستان)

پیشہ: ہومیو پیتھک فزیشن

تدریس: پروفیسر۔میٹیریا میڈیکا

ادبی زندگی: ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔افسانے اور مضامین مختلف ادبی جرائد میں شائع ہونے لگے البتہ کتابی صورت میں پیش کرنے کا خیال بہت تاخیر سے آیا۔
۱۹۹۵ سے ۱۹۹۸ تک پندرہ روزہ جریدہ ''اعظم'' کے شعبہ ادارت سے منسلک رہیں (یہ جریدہ اردو اور ہندی کے ممتاز افسانہ نگار، شاعر اور نقاد ڈاکٹر اعظم کریوی کی یاد میں شائع ہوتا تھا)

استعداد: افسانے، مضامین۔

تصنیف: خواب کا رشتہ (افسانوں کا پہلا انتخاب)

زیرِ ترتیب: افسانوں کے مزید دو انتخاب
ادبی خاکوں اور مضامین کا مجموعہ

رفاقت زندگی کی
رفاقت قرطاس وقلم کی
عبداللہ جاوید و شہناز خانم عابدی

اردو شعر وادب میں روایت اور جدت کے ترجمان جریدے ''چہارسُو'' کی ایک اور 'جدت' قرطاس اعزاز کی تاریخ میں پہلی بار صاحب قلم میاں بیوی کی خدمت میں بہ یک وقت قرطاس اعزاز کی پیش کش احساس طمانیت اور ادائیگی فرض کے ساتھ۔

''آنکھوں کی زباں''

(جناب عبداللہ جاوید کے غزلیہ کلام سے مختصر انتخاب)

اقبال بھٹی (یو۔کے)

○

زندگی کٹتی ہے کچھ اہلِ کرامات کے ساتھ
زہر کا جام جو دیتے ہیں مدارات کے ساتھ

ہم مسافر ہیں شبِ تار کے، پر جانتے ہیں
ان اندھیروں کا تسلط ہے فقط رات کے ساتھ

رات کے ساتھ مہ و نجم کا رشتہ ہے مگر
جیسے ظالم کا تعلق ہو مراعات کے ساتھ

نام لو یا کہ نہ لو یاد کرو یا نہ کرو
ذکر اس شخص کا چھڑ جاتا ہے ہر بات کے ساتھ

چاند کے چہرے کو دیکھا تو یہ دل میں سوچا
رات آئی ہے تری یاد کی سوغات کے ساتھ

شہر کا شور ابھی جاگ رہا ہے سو لو
شہر سو جائے تو بیدار رہو رات کے ساتھ

وقت کے ساتھ وہی لوگ فنا ہوتے ہیں
صُلح کر لیتے ہیں جو کہنہ روایات کے ساتھ

ہم کو شکوہ نہیں ابیات کی نا قدری کا
لوگ کیا کرتے ہیں قرآن کی آیات کے ساتھ

ہم تو بندے ہیں، خدا کا بھی تصور جاوؔید
ہر زمانے میں بدل جاتا ہے حالات کے ساتھ

☆

○

صلوں کو درمیاں پر لکھ دیا
کیا ملیں جب آسماں پر لکھ دیا

ساتھ کیسا ساتھ، سب کچھ خواب یا
خواب اک چشمِ گماں پر لکھ دیا

آپ ہی کے ہو گئے سو ہو گئے
آپ ہی کو لوحِ جاں پر لکھ دیا

بات جب نوکِ زباں پر رک گئی
دل نے آنکھوں کی زباں پر لکھ دیا

ہم ہی خود دورِ زماں میں کھو گئے
ہم نے خود دورِ زماں پر لکھ دیا

زندگی اس طور سے بخشی گئی
نام اک ریگِ رواں پر لکھ دیا

رہتے ہیں جاوؔید جی اس گھر کے بیچ
ہم نے اک کچے مکاں پر لکھ دیا

☆

○

شام کی تنہائی کے سنّاٹوں میں کون تھا
روح کو چونکانے والی آہٹوں میں کون تھا

دن نکلنے سے بہت پہلے نکل آتا تھا کون
تیرگی میں پھیلتی نیلاہٹوں میں کون تھا

وہ جو مصری کی ڈلی سا تھا گھُلا ماحول میں
زندگی کی سختیوں ، کڑواہٹوں میں کون تھا

سرد راتوں کے تسلسل سے نمٹنے کے لیے
برف موسم میں چھپی گرماہٹوں میں کون تھا

روز وشب معمول بنکر، بن گئے تھے بوجھ جب
روز وشب ڈستی ہوئی اُکتاہٹوں میں کون تھا

خواہشوں کے جنگلوں میں آگ لگجانے کے بعد
جلتی بجھتی چاہ کی اکساہٹوں میں کون تھا

کون تھا جاوؔید دل کے گوشۂ تاریک میں
گوشۂ تاریک کی اجلاہٹوں میں کون تھا

☆

○

دُکھے دل کو ، دُکھانا، سوچنا تھا
جب آئے تھے تو جانا، سوچنا تھا

جو در تھا بند ہم پر اس گلی میں
اسی در کو کھلانا، سوچنا تھا

زمانے سے لڑائی تھی تو لڑتے
زمانے سے نبھانا، سوچنا تھا

سرائے تھی، سرائے تھی یہ دنیا
لگا تھا، آنا جانا سوچنا تھا

فسانے سب حقیقت بن رہے ہیں
تو کیا لکھنا، لکھانا، سوچنا تھا

☆

اپنے سائے میں کوئی دھوپ کا مارا ٹھہرا
پھر بھی سائے سے بہت ربط ہمارا ٹھہرا

ہائے وہ وقت کہ جب ساتھ ہمارے تم تھے
ہم نے اس وقت کو رو رو کے پکارا ٹھہرا

دو کناروں کی طرح مل نہ سکے ساتھ رہے
عمر بھر بیچ میں بہتا رہا دھارا ، ٹھہرا

بہتے پانی میں کوئی عکس نہ ٹھہرا سالم
منتشر ہوگیاجب چاند ہمارا، ٹھہرا

○

بدن کے گھر سے نکل جاؤنگا' کسی لمحے
ڈھلان پر ہوں پھسل جاؤنگا کسی لمحے

ہوں مشتِ خاک تو اُڑ جاؤنگا کسی جانب
جو برف ہوں تو پگھل جاؤنگا کسی لمحے

بندھا ہُوا ہوں شب و روز کے اُجالوں سے
خود اپنی چھاؤں میں ڈھل جاؤنگا کسی لمحے

وہ سرد آگ ہے جس نے مجھے لپیٹا ہے
نظر نہ آئے گی جل جاؤنگا کسی لمحے

جو حرف حرف گزاری ہے زندگی اب تک
سو حرف حرف میں ڈھل جاؤنگا کسی لمحے

حصارِ زیست میں اک عمر کاٹ دی جاوؔید
حصار سے بھی نکل جاؤنگا کسی لمحے

☆

○

اگر سیلاب کا چہرا نہ دیکھا
تو گویا آپ نے دریا نہ دیکھا

رکھیں آنکھیں کھلیں گو ہم نے دل کی
مگر دل سا کوئی اندھا نہ دیکھا

عبث تھا بھاگنا دنیا کے پیچھے
جو بھاگے ان سے پھر کیا کیا نہ دیکھا

فقیری تو گنوانے کا ہنر ہے
وہ پیالہ کیا جسے ٹوٹا نہ دیکھا

پڑی جب روشنی پرچھائیں ناچی
کوئی بھی ناچنے والا نہ دیکھا

رہے سب پیڑ کے سائے کے نیچے
کسی نے پیڑ کو جلتا نہ دیکھا

گلی میں ہم نے اکثر دھوپ تاپی
کسی دیوار کا سایا نہ دیکھا

زمانے نے بہت سے لوگ دیکھے
کوئی مجھ سا، کوئی تجھ سا نہ دیکھا

وہ سب دیکھا فلک نے جو دکھایا
زمیں نے آج تک کیا کیا نہ دیکھا

ق

مگر جو آدمی دکھلا رہا ہے
زمیں نے آج تک سوچا نہ دیکھا

کبھی جاوید یہ دنیا سے پوچھو
یہاں کیا دیکھنا تھا کیا نہ دیکھا

☆

''تمنائے ثمر''

عبداللہ جاوید

''نامہ بر'' میں شامل ڈاکٹر سید سعید نقوی کے اٹھارہ افسانوں میں ''جگ بیتی''، ''ابدی کھیل'' اور ''بغاوت'' فیبل (FABLE) کہلائے جا سکتے ہیں باقی افسانے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے۔ ڈاکٹر صاحب سچ مچ طبیب ہیں یعنی آدمیوں کے ڈاکٹر ہیں، ادب یا فلسفے کے نہیں لیکن اپنی کتاب میں ''ذاتی مکالمہ'' کے تحت وہ ادبی تخلیق کو کسی ماہرِ نباتیات کے طور پر بیج کے اپجنے اور سایہ دار درخت کی شکل اختیار کرنے کے مماثل قرار دیتے ہوئے اپنی تخلیقی کاوش کو ایسے بیج سے مشابہہ بتاتے ہیں جو ناموافق زمین اور اجنبی فضا میں مناسب آبیاری کی بدولت نمو پذیر ہوگئی ہو۔

ڈاکٹر سید سعید نقوی کو میں نیا مبتدی لکھنے والا افسانہ نگار نہیں مانتا اگر کوئی بیج ناموافق حالات میں اپج نہ پائے اور جیسے ہی موافق حالات میسر آئیں، اپنی تمام تر تخلیقی توانائیوں کے ساتھ پھوٹ پڑے، ابھرے اور پلک جھپکنے میں کسی تناور درخت کی مانند شاخ شاخ، پات پات، پھولے پھلے تو کیا آپ ایسے بیج اور درخت کو نیا کہیں گے؟ میرے محترم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی کیا خوب شعری اظہار فرمایا تھا:

تمنائے ثمر رکھتا تھا دانا
نکالا خاک سے اس نے خزانا

تراش اس میں سے جو صورت تو چاہے
ہے سنگِ نا تراشیدہ زمانا

ڈاکٹر سید سعید نقوی کے اندر افسانہ نگاری کا بیج عرصۂ دراز سے اپنی تمنائے ثمر کے ساتھ مناسب موقع اور مہلت کا منتظر تھا۔ یہ جو امجد اسلام امجد کو ان کے افسانوں کی فضا سرتاسر حشر دکھائی دیتی ہے میرے اس خیال کو مزید تقویت پہنچا رہی ہے۔ وہ نیویارک میں قیام پذیر ہیں لیکن ان کا قلم پاکستان میں برسوں قبل کی فضا میں اپنا تخلیقی کام سرانجام دے رہا ہے اور یوں اس تخلیقی خلا کو پُر کر رہا ہے جو ناموافق حالات کے باعث پیدا ہو گیا تھا۔ عین ممکن ہے اپنے مستقبل کے افسانوں میں وہ مشرق سے مغرب میں آ جائیں کیونکہ قلم کار اور وہ بھی تخلیقی قلم کار عصری زمانی و مکانی حقائق سے کامل چشم پوشی اختیار نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر سید سعید نقوی کا افسانہ لکھنا ایک جانب ان کی اپنی شخصیت کی تکمیل کا باعث ہوگا تو دوسری جانب اردو زبان و ادب میں ایک پختہ کار افسانہ نگار کے اضافے کا سبب بنے گا۔

میں نے ''نامہ بر'' میں شامل سارے افسانے پڑھے ہیں۔ ان میں موضوع، اسلوب اور ٹکنک کا تنوع اس قدر زیادہ اور واضح ہے کہ ایک آدھ افسانے سے کوئی نتیجہ نکالنا قریب قریب ناممکن ہے۔ ذکر میں چند ایک افسانوں کا کروں گا۔ میرا طریقۂ کار نہ تو ہوا میں معلق ذاتی تاثرات پیش کرنے سے متعلق ہے اور نہ ہی افسانوں کے خلاصے (سمری) دینے سے ہے۔

کتاب کا پہلا افسانہ ''پتلی تماشا'' بے حد پختہ کاری سے لکھا ہوا افسانہ لگتا ہے۔ اس میں بہت کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ کہانی کا بھی یہی حال ہے۔ کہانی ہے بھی اور نہیں بھی۔ دیکھو تو بیانیہ سیدھا، سادھا اور روایتی، سوچو تو طلسماتی، علامتی اور تجریدی۔ اس افسانے کے ڈانڈے ہمارے داستانی ادب سے جا ملتے ہیں اور ہماری اس ثقافت سے بھی جو اب معدوم ہوتی جا رہی ہے۔ اس میں تماشہ دکھانے والے کے خارج اور باطن کا ہمدردانہ پیتھاس (Pathos) سے بھرپور مطالعہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک دو پتلیوں کے وسیلے سے تجرید و تجسیم کی طلسماتی دنیا تشکیل دی گئی ہے۔ پڑھنے والا حقیقت اور رومانس، ہستی و نیستی، جبر و قدر کی کشاکش میں یوں گھرا ہوا سا ہوتا ہے جیسے آج کی دنیا کا آدمی۔ افسانہ ادھورا ادھورا سا ہے اور یہ تاثر چھوڑتا ہے کہ زندگی میں کچھ بھی تو مکمل نہیں ہے پھر افسانہ کیوں اور کیسے پورا ہو۔

''سراب'' ٹیلنکی مہارت سے بنا ہوا دل ہلا دینے بلکہ دہلا دینے والا تاثر سے بھرپور افسانہ ہے جس میں پاکستان کے زوال پذیر معاشرے کی چند ایک مثبت اقدار کو مغربی (امریکی) ترقی یافتہ معاشرے کی چند ایک منفی اقدار کے مقابل دکھایا ہے۔ اس میں گنجائش ہونے کے باوجود افسانہ نگار پردے سے باہر نہیں نکلتا اور افسانہ اپنے آپ کا خود ہی ابلاغ کرتا ہے۔ ''جگ بیتی'' میرے افسانے ''مشورت'' کے قریب ہے۔ اس کا سبب ہم عصریت ہے۔ اس موضوع پر مزید افسانے متوقع ہو سکتے ہیں۔ ''ابدی کھیل'' ایسا افسانہ ہے جس کی فکریات میں عزم للبقا کے عام روایتی نظریے کے پہلو بہ پہلو تشدد کا عزم للقوہ بھی موجود ہے اور حیرانی کی بات یہ کہ ان نظریات کے بالا ہی بالا نظریۂ جبر و قدر بھی اپنا ابلاغ کرواتا ہے۔ افسانے کا عنوان ''ابدی کھیل'' افسانے کو مزید اونچا اٹھا رہا ہے اس افسانے کا اختتامی فقرہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ''بغاوت'' افسانوی ابلاغ کا مثالی روپ ہے۔ بیانیہ بے حد رواں، شگفتہ اور ڈرامائی ہے۔ افسانے کی پوری فضا طنزیہ ہے۔ جگہ جگہ آئرنی (IRONY) سٹائر (SATIRE) میں بدلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ''آخر شب'' شاعرانہ انصاف (POETIC JUSTICE) پر مبنی ہے۔ ''بندگلی'' میں حقیقت اور تخیل آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ افسانے کا اختتام ایک لاجواب فقرے پر ہوتا ہے۔

باقی صفحہ ۷۶ پر ملاحظہ فرمائیے

براہِ راست

زیرِ نظر مکالمے سے استفادے کے بعد آپ ہماری رائے سے متفق ہونگے کہ جناب عبداللہ جاوید قلکار ہی نہیں ایک ادارہ، انجمن اور انسٹیٹیوٹ کی حیثیت رکھتے ہیں! ایسی صورت میں جاوید صاحب کی نسبت کسی بھی نوع کی حاشیہ آرائی چاندنی کو چاند اور خوشبو کو پھول سے روبرو کرنے کے مترادف ہے!! ضرورت جبکہ اس امر کی ہے کہ رشحاتِ جاوید کی روشنی میں عمل اور اعمال کو درست کرتے ہوئے اپنی زبان، ادب اور قومی ورثے کی درستگی کے لیے وہ سب کچھ کیا جائے جو ہمارے بس میں ہے، اس کام کے لیے جس چیز کی ضرورت ہمیں سب سے زیادہ ہونا چاہیے وہ آپ اس کم فہم کی نسبت بہتر طور پر جانتے ہیں!!!

گلزار جاوید

☆ آپ کی کامیابی کے پیچھے خاندان کے علمی، ادبی پس منظر کا کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے۔ کچھ تفصیل ہمارے قارئین کو بتلایئے تا کہ گفتگو کا آغاز درست سمت میں کیا جائے؟

☆☆ ددھیال کا تعلق قلم سے بہت زیادہ تلوار، تیر و تنگ سے تھا۔ ہمارے جدامجد کو انگریز سرکار نے یوسف زئیوں کی ایک آزاد و خودمختار ریاست سے اپنے ایک قانون کے تحت محروم کر کے ریاست پر قبضہ کر لیا تھا اور ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ خاندان کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔

نانا حضرت عبدالحنان ایران سے تحصیل علم کی خاطر اُس زمانے کی عالمی شہرت یافتہ درس گاہ محمود گاؤں کے مدرسے آئے جو جنوبی ہند کے شہر بیدر میں قائم تھا اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد شمس آباد، حیدر آباد (دکن) میں وکالت کی۔ بعد میں ممبئی چلے گئے جہاں کاروبار کیا اور اپنی باقی زندگی ممبئی اس کے مضافات، احمد آباد (گجرات) میں تبلیغ اسلام و تعلیم میں صرف کر دی۔ نانا حضرت نے میری والدہ محترمہ کو خانہ داری کے علاوہ دینی اور مروجہ دنیوی، عربی، فارسی، ادب و منطق سے بہرہ ور ہونے دیا۔ میری پہلی معلّمہ میری والدہ محترمہ ہی رہیں۔ میری نانی امّی ایک پیدائشی آرٹسٹ تھیں۔ اُن کے ساتھ میں گتّے کی مدد سے گڑیوں کے گھر بنانے میں جُٹا رہتا تھا۔ ہم نے ایک سینما ''کرشنا ٹاکیز'' کا خوبصورت نمونہ (ماڈل) بھی تیار کیا تھا۔ اس میں ٹارچ کے سیل اور بلبوں (قمقموں) کی مدد سے روشنی کا انتظام بھی کیا تھا۔ وہ بے حد معصوم طبع خاتون تھیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ میں چالاکیوں سے فطری بیزاری رچ بس گئی اور شاید آج بھی ہے۔

لیجیے صاحب نہ جانے کیا کیا بیان کر گیا جبکہ آپ کے سوال کا سیدھا صاف جواب تو یہ ہے کہ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ میری کس کامیابی کو آپ نے موضوع بنایا ہے۔ میں تو بھئی اس حد تک ہی کامیاب ہوں کہ کوئی آپ جیسا مہربان میرا لکھا ہوا پڑھ لیتا ہے۔ ایک بات اور جب چالیس کی دہائی کے اواخر میں مجھ ہائی اسکول اسٹیوڈنٹ کی نظمیں، قطعات، افسانے اور ایکانکی ڈرامے ادبی رسائل (بڑوں کے) میں شائع ہونے لگے تو میری یعنی جاوید یوسف زئی کی اصل شناخت میرے دو ایک قریبی دوستوں ہی تک محدود تھی۔ مدیرانِ جرائد سے مراسلت کا کام بھی میرے ایک دوست شہنشاہ (عبدالرحیم خاں) نے اپنے ذمّے لے رکھا تھا۔ خاندان کے افراد سے میری ابتدائی ادبی مصروفیات ''چکّی'' برسات اور جھولے کے گیتوں سے آگے نہیں بڑھی۔ وہ جاوید یوسف زئی سے برسوں ناواقف رہے۔

☆ آپ کی کتاب دوستی اور وسیع المطالعگی بھی اکثر داد کی مستحق ٹھہرتی ہے۔ کس طرح کے موضوعات اور کتب آپ کی توجہ حاصل کرتے ہیں۔ اب تک کس کس کو پڑھا اور کس کس کو سہا؟

☆☆ پڑھتا رہتا ہوں۔ یہ تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ کچھ پڑھا ہے کیونکہ جو پڑھنے سے رہ گیا ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ اس کے مقابلے میں جو پڑھنے میں آیا اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ شرمسار ہوں۔ علاّمہ اقبال کی نظم ''فلسفہ زدہ سید زادے سے'' سید زادے حذف کر دیجیے۔ میں فلسفہ زدہ ہوں۔ البتہ مذکورہ نظم میں علامہ اقبال نے چند مفکروں کے بارے میں جو رائے دی ہے، اس سے آج بھی متفق نہیں ہوں۔ اقبال کی واضح خیالی (کلیئر تھنکنگ) سے انگشتِ بدنداں ہونے کی حد تک مرعوب و حیراں ہوں۔

☆ آپ کے اس تصور سے اتفاق کر لیا جائے کہ فکر خلاؤں میں اڑنے والی شے ہے جو شاعروں کی زد میں ہوتی ہے تو کیا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ آپ تعلّی کا شکار ہیں، شاعروں کے بارے عام رائے اس سے مختلف بلکہ متضاد ہے!

☆☆ میں نے یہ نہیں کہا کہ فکر خلاؤں میں اڑنے والی شے ہے۔ میں نے کہا ہے۔

لاکھ اُڑتی پھرے خلاؤں میں
فکر ہم شاعروں کی زد میں ہے

''لاکھ'' کو نظر انداز نہ کیے جانے کے لیے ملتجی ہوں۔ ہم شاعروں سے میری مراد اردو میں میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ، دنیا کی دوسری زبانوں کے اکابر شاعر ہیں۔ میں ان کی جوتیوں کے آس پاس، کہیں ہونے کا عرض گزار ہوں۔ اور یوں ''تعلّی'' کا مرتکب ہو رہا ہوں۔

☆ کہا جاتا ہے کہ عبداللہ جاوید کی شاعری میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو اعلیٰ شاعری کے لیے لازمی تصور کیے جاتے ہیں۔ آپ کے خیال میں وہ اوصاف کیا ہیں؟

☆☆ میرے خیال میں شاعری وہ ہے جو لفظوں کے لبالب بھرے ہوئے کوزوں میں ہر عصر کی مکانی و زمانی حقیقتوں کے وجدان کو ممکنہ حد تک لامکانی و لازمانی وجدان کے ارتسامات سے برقیا کر، بوند بوند داخل کرے۔۔۔ اور اعلیٰ شاعری۔۔۔ یا مرے اللہ۔۔۔! یہ آپ نے کتنا مشکل سوال پوچھ لیا۔

غنچے تری زندگی پہ دل ہلتا ہے
بس ایک تبسم کے لیے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس جہاں میں بابا
یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

درج بالا قطعہ میرے خیال میں شاعری ہے البتہ مندرجہ ذیل شعر اعلیٰ شاعری ہے۔

کہا میں نے کتنا ہے گُل کو ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

☆ آپ کے شعری اظہار میں جدّت اور تازہ کاری کے بھی لوگ معترف ہیں۔ وضاحت سے اپنی جدت طرازی اور تازہ کاری کی بابت روشنی ڈالیے؟

☆☆ جدت اور تازہ کاری شعروادب میں قریب قریب لازم اور واجب ہیں بصورت دیگر لکھنا، لکھانا، رسمی، روایتی اور بلاجواز ہو کر رہ جاتا ہے۔ جن کرم فرماؤں نے میرے شعری ابلاغ واظہار میں اور فکشن پر مبنی تخلیقات خاص طور پر افسانوں میں تازہ کاری اور جدت کی نشاندہی فرمائی، ان کا ممنون ہوں۔ میرا پہلا شعری مجموعہ ''موجِ صد رنگ'' ۱۹۶۹ء کے اواخر میں آئینہ ادب لاہور کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ اس میں شامل نظموں اور غزلوں کو ساٹھ کی دہائی میں منظرِ عام پر آنے والے دیگر شعری مجموعوں کے مشمولات کے ساتھ رکھ کر دیکھنے پر خود میں بھی اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ میرے پاس بہت کچھ ہٹا ہوا، اجنبی اجنبی سا، نیا نیا سا ہے۔ میں نے زبان کو اردو + فارسی کی حدود سے ممکنہ حد تک باہر نکال کر اردو + ہندی میں ڈھالنے کی کوشش کی، فارسی زدہ عروض کو ماتروں کی وساطت سے پنگل کے پڑوس میں پہنچایا۔ اس ضمن میں عظمت اللہ خاں اور آرزو لکھنوی کی پیش قدمیوں سے تاثر قبول کیا۔ دوہا شاعری سے استفادہ کیا۔ موضوعات میں حسنِ قاتل (فیٹل بیوٹی) کا موضوع میری نظموں کے واسطے سے اردو میں پہنچا۔ یہ اس حسن قاتل سے مختلف ہے جو اردو غزل میں آغاز سے موجود ہے۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی ایک شہر میں قاتل رہا ہے

ساٹھ کی دہائی کی نظمیں ''لب بستگی'' اس کی نشاندہی کرتی ہیں زندگی کی ''لایعنیت'' کا موضوع جو مابعد جدیدیت سے مخصوص ہے آج سے پچاس، ساٹھ سال قبل میری نظموں میں حسیّاتی اور فکری سطح پر بھرپور انداز میں پیش کیا ہوا ملتا ہے۔ اس طرح وقت کے موضوع پر میرے نظریات علامہ اقبال کے ''سلسلۂ روز وشب'' کی موجودگی میں بھی اپنا ایک علیحدہ مقام بنا چکے ہیں۔

میں نے شعروادب کی تحریکات کی خارجی لپیٹ میں آ کر کچھ نہیں لکھا، جب تک ان تحریکات کو اپنے اندرون میں نمو پاتے محسوس نہیں کیا۔ میری شاعری میں، افسانوں میں علامات ملیں گی لیکن وہ علامتی شاعری یا فکشن نہیں ملے گا جس کو میرے چند ہم عصر لکھنے والوں نے روایت سے بغاوت یا جدت کی جستجو میں خود پر مسلط کیا اور خارجی سطح تک محدود رکھا۔ میری نومبر ۱۹۶۱ء کی نظم ''بھاگتے لمحے بدلتے روپ'' اردو میں ''بائیوگرافیکل'' سوانحی مزاج کی پہلی ایسی نظم ہے جس میں زندگی کو بھگتنے کے ساتھ نتائج تک پہنچنے کی مساعی کو بھی شعری فکر اور حسیّت کے ساتھ کاغذ پر مرتسم کیا گیا ہے۔ میری سب سے بڑی خوبی اور بُرائی یہی رہی کہ مزاج میں شہرت گریزی اتنی زیادہ ہے کہ جہاں دھماکہ کرنا لازمی تھا، وہاں بھی دھماکہ نہ کیا۔

☆ احباب کی ایک معقول تعداد آپ کے تجربات کی طرف بھی توجہ دلایا کرتی ہے مگر نشاندہی کوئی نہیں کرتا کہ آپ کو کب، کہاں، کس نوعیت کے تجربات کا وقت میسر رہا؟

☆☆ میں روایت سے بغاوت کو نہیں مانتا لیکن شعروادب میں جدت کی ایک زیریں لہر کو مستقل طور پر فعال مانتا ہوں۔ تجربات اور اندرونی و بیرونی تحریکات کو اس زیریں لہر سے مربوط دیکھتا ہوں۔ میرے اس سوال کے جواب کو پچھلے سوال کے جواب سے متصل کر لیا جائے (ازرہِ کرم) میں نے دوہے نما غزلیں کہیں۔ ایک سطری، دوسطری اور تین سطری نظمیں لکھیں۔ تین سطری نظموں میں ''پھول'' نظموں کا اضافہ کیا۔ پھول نظمیں ایسی تین سطری نظمیں ہیں جن کا پہلا مصرع یا سطر لفظ ''پھول'' سے شروع ہوتی ہے۔

پھول پہ دکھ کر پاؤں
جب واجا نے مونچھ مروڑی
رویا سارا گاؤں

(لفظ راجا نہیں واجا ہے۔ بلوچی میں سردار کو کہتے ہیں)

☆ ''حقیقت، علامت، انفرادیت، اجتماعیت، عقلی دلائل اور جذباتی مناظر یک جان ہو کر جاوید کے اسلوب کا اعلان کرتے ہیں'' مذکورہ رائے آپ کے فنی اسلوب کو گنجلک نہیں بناتی؟

☆☆ اگرچہ سوال آج کے ادبی منظرنامے سے مربوط معاملات سے منسلک ہے لیکن اس کا جواب ''موج صد رنگ'' کے پیش لفظ مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۶۸ء میں مل سکتا ہے (ص ۱۳۔۱۴ موج صد رنگ)

''چہارسُو''

''.....میرا ایمان ہے کہ خیال، جذبے، احساس، الفاظ، شعری سانچہ، آہنگ، فضا، رمز وکنایہ، استعارہ وتشبیہ، جُدا جُدا عناصر نہیں بلکہ ایک فرد، ایک غزل، ایک نظم یا کسی بھی صنف میں ایک مکمل تخلیق درحقیقت ایک کامل اکائی ہے جس میں سارے عناصر ایک جان، ایک قالب ہو کر سمائے ہوئے ہوتے ہیں۔ شعر خواہ آسمان سے نازل ہو یا زمیں سے نمو پائے۔ دل کے نہاں خانے میں پلے یا ذہن کے تاریک گوشوں میں پرورش پائے اپنے تمام عناصر تشکیلی کو اپنے وجود میں سمیٹے ہوئے بلکہ بڑی حد تک خلط ملط کیے ہوئے تخلیق ہوتا ہے۔ میری رائے میں شاعری صناعی نہیں بلکہ خلاقی ہے اور خلاّقی کو خالص شعوری عمل سمجھنا قرینِ قیاس نہیں۔ ہنری جیمس کہتا ہے ''ہم تاریکی میں کام کرتے ہیں''۔ شعر وارد ہوتا ہے لایا نہیں جاتا۔ جب وہ آتا ہے تو اپنے ساتھ وہ سب کچھ لاتا ہے جس کو ہم فارم، اسلوب، آہنگ اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں.....'' میں اپنے اسلوب کو گنجلک محسوس نہیں کرتا۔

☆ آپ کے ہاں الفاظ کا دائرہ اکثر بحور سے وسیع کیوں ہوا کرتا ہے؟

☆☆ میرؔ پڑھتے ہوئے بھی کسی مقام پر ایسا محسوس ہوتا ہوگا۔ میں نے بحور پر جو کام کیا ہے اور اردو + فارسی اور اردو + ہندی کو قریب کرنے کی جو مساعی کر چکا ہوں اس کا ذکر پیچھے موجود ہے۔ میرے کلام میں ایک آدھ شعر میں ''شتر گربہ'' مل سکتا ہے۔ شہر، سحر، نذر کے تلفظ میں گڑبڑ بھی مل سکتی ہے نہ جانے کیوں جان کر بھی رہنے دیا۔ یوں بھی تلفظ کے معاملے میں سخت گیری اردو کے حق میں مُضر ہے۔

☆ ایک ہی وقت میں روایتی اور عطفی تراکیب کا استعمال قاری کو متجسس کیوں کرتا ہے؟

☆☆ قاری کو تنگ کرنا جو ہوا۔

☆ آپ کے ہاں ذات سے فرار کن معنوں میں اور کب سے ہے؟

☆☆ فرار کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی۔ صاحب نے پنجرے میں نہیں بلکہ پنجروں کے طلسمات میں بند کر رکھا ہے۔

پنجرہ ہے/ پنجرے کے باہر بھی/ شاید/ پنجرہ ہے/ باہر کے باہر بھی شاید/ پنجرہ ہے۔۔!!

ذات سے فرار مندرجہ ذیل معنوں میں بھی ہے اور جانے کب سے ہے۔

روح رستے میں، جسم گھر میں ہے
زندگی حالتِ سفر میں ہے

☆ گھر کی ویرانی سے مراد کیا ہے اور کیوں یہ آپ کی شاعری میں جا بجا نظر آتی ہے؟

☆☆ گھر کی ویرانی سے ایک تو وہ ویرانی ہے جو دشت کو دیکھ کر غالبؔ کو گھر یاد دلاتی ہے۔ دوسرے وہ ویرانی ہے جو وطن کی حالتِ زار کے خیال سے دل کے گھر میں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے۔

☆ اگر کوئی شخص آپ کے کلام میں طنز، تلخی، چراندھ کی نشاندہی کرے تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟

☆☆ میرے کلام میں طنز تلخی تک نہیں پہنچتی، چراندھ تک تو قطعی نہیں کوئی قاری اس پر اصرار کرے تو میرا جواب ہوگا ''میں آپ کی رائے سے پورے احترام کے ساتھ اختلاف کرتا ہوں'' معاف کیجیے۔

☆ کچھ لوگوں کے خیال میں آپ نے اپنی ایک دنیا بنالی ہے جس سے باہر آنا آپ پسند نہیں کرتے؟

☆☆ باہر آنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ میری شاعری، میرے افسانے اور میری تحریر قاری کو میری اپنی دنیا میں لے آتی ہے۔ مجھے اور کیا چاہیے۔ اسی سبب سے میں ایکسپریشن، کمیونیکیشن کی جگہ ٹرانسپورٹیشن میں یقین رکھتا ہوں۔

☆ قاری کی ذہنی صلاحیت کے مطابق معنی اور مطالیب میں تبدیلی سے مراد کیا ہے۔ قاری اگر آپ کی سطح تک نہ پہنچ پائے تو آپ خود کو منوانے کے لیے اس کی سطح پر جانے کو تیار ہیں؟

☆☆ میں اگر چاہوں بھی تو ایسا نہ کر سکوں گا۔ قاری ہی کو تھوڑا تھوڑا کر کے مجھے سمجھنا پڑے گا۔ اگر ہر قرأت پر قاری مجھ میں کچھ نیا دریافت کرے گا تو اس کو نئی حیرانی اور نئی خوشی ملے گی۔

☆ عبد اللہ جاوید کی شاعری کو صناعی کے بجائے خلاّقی گردانے والے آپ کو کس رتبے پر فائز کرنے کے خواہش مند ہیں؟

☆☆ اس سوال کا جواب ان ہی مہربانوں سے لیجیے۔

☆ آپ کو مظہر جانِ جاناں، نیاز بریلوی، عبدالحی تاباں اور میر درد کا سفیر گردانے والے کس امر کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں؟

☆☆ اس سوال کو میر دردؔ تک محدود رکھیے۔ وہ صاحب تکیہ صوفی بزرگ تھے۔ میں بھی تصوف سے عملی طور پر جُڑا ہوں لیکن پورا شاعر ہوں۔ میرؔ نے دردؔ کو آدھا شاعر مانا تھا۔

☆ مرزا اسد اللہ غالب نے اپنے بارے غیب سے مضامین کی نشاندہی کی تھی۔ آپ کے بارے ایک صاحب بے نیازی کے پردے میں شعر نازل ہونے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں؟

☆☆ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ ایک بہت بڑا نام ہے۔ میں بہت چھوٹا آدمی ہوں۔ اتنے بڑے آدمی کے کہے ہوئے سے روگردانی کس طرح کر سکتا ہوں۔ ''موجِ صدرنگ'' کے پیش لفظ میں چھوٹے آدمی کی لفظیات میں اس موضوع پر بھی کچھ نہ کچھ عرض معروض کر دیا ہے۔

☆ موجِ صدرنگ اور حصارِ امکاں کے درمیان کونسی دو دنیاؤں کا فرق ہے؟

☆☆ حصارِ امکاں کی دنیا جو آج کی دنیا بھی ہے کمزور ملکوں کی پٹائی اور طاقتور ممالک کی ڈھٹائی کی دنیا ہے۔ موجِ صد رنگ کی دنیا دو بڑی طاقتوں کے درمیان چیک اور بیلنس کی اور سرد جنگ کی دنیا تھی جیسی بھی تھی آج کی دنیا سے بہتر تھی۔ شعروادب کے حوالے سے وہ جدیدیت کی دنیا تھی جبکہ حصارِ امکاں اور اس کے بعد کی دنیا مابعد جدیدیت کی دنیا ہے۔

☆ نظم کے آخر میں مختصر سطر کا التزام ''بلینک ورس'' کی خواہش کا بلارادہ سفر ہے یا بلاارادہ؟

☆☆ آپ کے سوال کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جو کچھ ہے بلا ارادہ ہے۔

☆ اگر کوئی صاحب آپ کی نظموں پر ہندی دوہے کے اثرات کی نشاندہی کریں تو آپ کا فرمان کیا ہوگا؟

☆☆ اگر چند نظموں کی حد تک کہا جائے تو قبول کرلوں گا۔

☆ آنند صاحب کے بقول آپ کی بیشتر نظموں کا مزاج اور مواد غزل سے مستعار ہے جس کے باعث ان کا ابلاغ اُس طرح نہیں ہو پاتا جس طرح آپ چاہتے ہیں؟

☆☆ آنند صاحب کی رائے کا اُلٹ میرے خیال میں زیادہ صحیح ہے میری بیشتر غزلوں کا مزاج اور مواد نظم سے مستعار ہے۔

☆ ایک اور رائے کے مطابق آپ نے نظم کے مقابلے غزل کو کم اہمیت دی ہے اور اس کا جواز مغربی تہذیب وتمدن ہے جو اردو غزل کو گاہے وحشی، نیم وحشی اور از کار رفتہ گردانتا ہے؟

☆☆ مسلمان ہوں خواہ کتنی ہی اصناف (چار سے کم) سے رشتہ جوڑوں ہر ایک کو اس کا حق دونگا۔

☆ آپ کے تخلیقی سفر میں طویل وقفے کی بابت قاری قطعی طور پر بے خبر ہے؟

☆☆ اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔ بے خبری ہی بہتر ہے۔ میرے مندرجہ ذیل شعر سے سبق لیں۔

باخبر ہونے میں کیا کیا نہیں کھویا ہم نے
اس سے بہتر تو یہ تھا بے خبری کے ہوتے

☆ یہ بات تو درست ہے کہ آپ نے افسانہ نگاری کو اُس قدر توجہ اور وقت نہیں دیا جس قدر شاعری کو دیتے رہے۔ قاری یہاں اس کا سبب جاننے میں برحق ہے؟

☆☆ جاوید یوسف زئی کے قلمی نام کے تحت شائع شدہ افسانوں کی ایک فائل اپنے ساتھ لایا تھا وہ غائب کردی گئی۔ اس کے بعد جب بھی کوئی افسانہ لکھا، کسی پرچے میں بھجوانے سے پہلے ہی گم ہوگیا۔ انگریزی زبان میں براہِ راست ٹائپ کیے ہوئے چار چھ افسانوں کا بھی یہی انجام ہوا۔ ایک عرصہ تک لکھنے سے ہیٹا رہا لیکن افسانے میرے وجود کے آس پاس منڈلاتے رہے۔ عدیم الفرصتی آڑے آنے لگی افسانے زیادہ وقت ہی نہیں فرصت مانگتے ہیں۔

☆ کچھ لوگوں کے خیال میں آپ نے بیگم صاحبہ کو بطور افسانہ نگار تسلیم کرانے کی غرض سے خود کو افسانہ نگاری سے اُس وقت تک دُور رکھا جب تک بیگم صاحبہ مستند افسانہ نگار تسلیم نہ کرلی گئیں؟

☆☆ یہ خیال حقیقت پر مبنی نہیں ہے البتہ یہ حقیقت ہے کہ ان کو کتاب لانے پر مجبور کرنے کی غایت سے میں اپنے افسانوں کی کتاب لانے پر رضامند ہوا۔

☆ آپ کا گھریلو رہن سہن مسلم اور مشرقی ہے مگر آپ کے بیشتر موضوعات اور کردار مغربی ہوا کرتے ہیں؟

☆☆ میرے بیشتر افسانوں کے موضوعات پاکستان سے متعلق ہیں اور ''لوکیل'' بھی پاکستان اور ہندوستان سے جُڑا ہے۔ پاکستان میں غیر ملکی ایجنٹوں کی سرگرمیوں کے موضوع پر میرے افسانوں ''میری بیوی'' ''عورت اور بچہ'' کو ایک طرح کی اولیت حاصل ہے۔ ''دسواں مکان'' ارون دھتی رائے کی زبان میں ''پوگرام'' فسادات کے موضوع پر میرا اہم افسانہ ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ مغربی دنیا کو میں نے افسانوں سے یکسر باہر کردیا ہے۔

☆ کچھ لوگ آپ کے افسانوں میں ٹکراؤ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ آپ کے خیال میں یہ ٹکراؤ کس قسم کا ہے اور اس کا جواز کیا ہے؟

☆☆ میرے افسانوں کی دنیا ٹکراؤ کی دنیا ہے۔

☆ صوفیائی افکار کی نشاندہی بھی آپ کے ہاں کی جاتی ہے۔ اس حوالے سے وضاحت اور استراحت ضروری ہے؟

☆☆ چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی اگر جواب میں یہ کہوں کہ میں خود بھی نہایت چھوٹے درجے کا صوفی ہوں اور وہ بھی صوفیائے ملامیہ کے اڑوس پڑوس والا۔

☆ کیا آپ اس رائے سے متفق ہیں کہ آپ کے ہاں جاپانی فلسفی Nishida kitar کے اثرات نمایاں ہیں یقیناً اس کا کوئی سبب رہا ہوگا؟

☆☆ میں اس رائے سے متفق نہیں ہوں۔ معذرت

☆ عیسیٰؑ، حسینؓ، سقراط، بقراط، کرشن، سدھارتھ کو آپ نے اپنے اندر کا کیں کیونکر بنا لیا اگر بنا لیا تو اُن سے کس طرح کی قربت اور فیض حاصل کیا؟

☆☆ قبضہ مافیا کے لوگ ہیں مجھ پر قابض ہوگئے۔ جلال الدین رومی کے نام کا اضافہ فرمالیجیے۔

☆ دنیا کی بڑی اکثریت موجودہ عالمی قیادت کو کم فہم، کم علم اور عاقبت نا اندیش گردان رہی ہے جبکہ آپ اُس کی Sensibility کو سراہتے نظر آ رہے ہیں؟

☆☆ مجھے زیادہ سطح کے اوپر اوپر ہی دیکھا اور جانچا جارہا ہے۔

☆ یہ بات تو طے ہے کہ آپ نے جس معیار کا ادب تخلیق کیا ابلاغ اُس انداز سے نہ ہوسکا۔ اس کا سبب مشاعروں اور مجلّوں سے آپ کی دوری ہے یا اور بھی عوامل کارفرما رہے ہیں؟

☆☆ قدردانہ کلمات کا شکریہ۔ اور بھی عوامل ہیں ایک میں خود ہوں۔

☆ آپ نے جس قدر بھی تخلیقی کام کیا اُسے سراہنا اور داد نہ دینا صریحاً زیادتی ہوگی مگر تراجم کے حوالے سے آپ پر کچھ ذمہ داریاں لازم تھیں۔ کم از کم میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور فیضؔ کا آپ پر کچھ حق تو بنتا ہے؟

☆☆ اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنا میرے بس کا کام نہیں تھا یہ آپ نے ایک سانس میں تین ناموں میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے ساتھ چوتھا نام کیسے لے لیا۔ مجھ سے نہ لیا جائے گا۔ معذرت

☆ ترقی یافتہ دنیا کے لوگوں کی اکثریت تیسری دنیا کو جاہل، اُجڈ، گنوار تصور کرتی ہے۔ یہاں کی زبان، ادب بلخصوص اردو کے بارے اُن کی رائے آپ کے خیال میں کیا ہے؟

☆☆ ایسا بھی نہیں، اتنا بھی نہیں۔ یہاں کی چند بڑی جامعات میں اردو چیئر ہیں (Chair) اور ان میں اضافہ جاری ہے اور وہ دن دور نہیں کہ ہر قابل ذکر جامعہ میں اردو کا شعبہ ہوگا۔ اردو ادب اور ادیبوں کا نام توقیر سے لیا جاتا ہے۔ یہ اور بات خود اردو والے گروہی سیاست اور اوچھے ہتھکنڈوں سے باز نہیں آرہے ہیں۔

☆ اس وقت عالمی ادب میں اردو کی کوئی شناخت ہے اگر نہیں تو مستقبل کے حوالے سے کس طرح کی اُمید باندھی جاسکتی ہے؟

☆☆ اثر، رسوخ اور پیسے کے زور پر اردو کی کم معیار تخلیقات کو عالمی ادب میں داخل کیا جارہا ہے۔ اس کا کیا تدارک ہوسکتا ہے۔۔۔؟

☆ آپ کے خیال میں اردو زبان و ادب آج کے تہذیبی ٹکراؤ کا مقابلہ کب تک اور کس حد تک کرنے کی طاقت رکھتے ہیں نیز اس زبان، ادب اور اُس سے وابستہ افراد کا مستقبل آپ کس طرح کا دیکھتے ہیں؟

☆☆ آپ نے ایک بڑا مسئلہ چھیڑ دیا ہے۔ میں جس صورت حال سے خائف ہوں اس کا تعلق اردو کو آگے نسلوں تک پہنچانے کے مسائل سے ہے۔ ان مسائل کو ترجیحی اولیت درکار ہے اور ہم ہیں کہ ان کو مسائل کے طور پر دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
زیں راہ کہ تو می روی بہ ترکستان است

بھائی گلزار جاوید آپ نے انٹرویو کے بہانے مجھ عزلت گزیں اور گوشہ نشیں کو خود ستائی کا موقع فراہم کیا اور میں نے اس موقع سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ ''چہارسُو'' کے پڑھنے والوں سے معذرت خواہ ہوں۔

بقیہ: ''چمکا جو چاند رات کا''

عبداللہ جاوید کی شاعری ایک جیتی جاگتی زندگی کے منظر نامے میں ان سوالات کو جنم دیتی ہے جو کسی بھی فرد یا معاشرے کو درپیش ہوتے ہیں اور جن کا ادراک کیے بغیر انفرادی اور اجتماعی زندگی کو قابل قبول اور قابلِ رشک نہیں بنایا جاسکتا۔ ان کے ایسے اشعار کا انتخاب ایک مشکل امر ہے کیونکہ ان کا ہر شعر اپنے اندر زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کا احاطہ کرتا ہے۔ ان کے اب تک شائع ہونے والے تینوں شعری مجموعے ''موج صد رنگ'' ''حصارِ امکاں'' اور ''خواب سماں'' مکمل مطالعے کا مطالعہ کرتے ہیں۔ مطالعہ کرنا بھی درست جملہ نہیں ہے بلکہ یہ ہر اہلِ ذوق کو تفصیلی مطالعے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کسی بھی شاعر کی حیثیت کا تعین کرنے کے لیے اُس کے مجموعی تاثر کی سطح مرتب کرنا ضروری ہوتا ہے۔ عبداللہ جاوید کی غزلیں اور نظمیں سب اپنے ''کُل'' سے منسلک نہیں یہ اپنے جزو میں بھی بھرپور تاثر رکھتی ہیں اور مجموعی حیثیت میں بھی ایک ایسا منظر نامہ تشکیل دیتی ہیں جو شاعری کو بامعنی بنا دیتا ہے۔ ان کی شاعری میں مایوسی، ناامیدی اور پژمردگی کی کیفیت نہیں بلکہ رجائیت اور اُمید کا تاثر غالب ہے جو انسان کو باعمل اور متحرف رکھتا ہے بلکہ ان کی شاعری کا بنیادی کریکٹر دیوانگی کی حد کو چھو لیتا ہے۔

دشت ستم کی پیاس لہو سے بجھا گئے
دیوانے ریگ زار میں گلشن کے لیے

عبداللہ جاوید کی شاعری تازہ اور زندہ رہنے کے اوصاف سے معمور ہے اور طویل مدت تک تشنگانِ شعر کے ذوق کی تسکین کرتی رہے گی۔

بقیہ: عبداللہ جاوید کے افسانے

تھا (بلکہ نہ لکھنا ہی بہتر تھا)۔ چنانچہ اب تک عبداللہ جاوید صاحب کا اپنے افسانوں کے بارے میں جو بھی اندازِ نظر رہا ہو اور چاہے آئندہ جو بھی وہ سوچ رکھتے ہوں، انہیں ان افسانوں کو مرتب بہرحال کرنا چاہیے۔ جو چند سرسری باتیں سطورِ گزشتہ میں ان کے افسانوں کی بابت کہی گئی ہیں وہ ادب کے ایک ادنیٰ قاری کے محض تاثرات کا درجہ رکھتی ہیں۔ جبکہ یہ افسانے اس سے زیادہ توجہ کے طالب ہیں اور!

امید ہے کہ اپنی مجموعی صورت میں جب وہ یکجا ہو کر سامنے آئیں گے تو سنجیدہ اہلِ نقد سے ضرور توجہ حاصل کریں گے اور خیال انگیز گفتگو کا باعث ہوں گے۔

عبداللہ جاوید کی تمثال نگاری

ستیہ پال آنند

(یو۔ایس۔اے)

یہ مضمون عبداللہ جاوید صاحب کی نظمیہ شاعری تک ہی محدود ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری اس کے دائرے سے باہر ہے۔ موضوع، مضمون اور متن (بشمولیت اسلوب، اظہار اور زبان) اس مضمون میں صرف اس حد تک زیر بحث آئیں گے، جس تک وہ امیج، استعارہ اور علامت سے متعلق ہیں۔

اس مضمون میں 'امیج'، 'استعارہ'، 'علامت'، تین اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں، جو mutually inclusive بھی ہیں اور الگ الگ بھی زیر بحث لائی جا سکتی ہیں۔ تینوں تمثال نگاری میں ممد و معاون ہیں اس لیے ان کی تشریح و تفسیر ضروری ہے۔ میں کچھ مضامین سے ان کے بارے میں اقتباسات دے رہا ہوں تا کہ واضح ہو جائے کہ جب میں ان کا اطلاق عبداللہ جاوید صاحب کی شاعری پر کرتا ہوں تو ان سے میری مراد کیا ہے۔

استعارہ کے معنیاتی سانچے MATRIX کو سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے اس کے اندر پوشیدہ امیج پر توجہ مرکوز کرنا پڑے گی۔ امیج کی ایج کے پروسس کو کئی سطحوں پر پرکھا جا سکتا ہے۔ (Marks, David. 1983) لیکن دو سطحیں ہماری بحث کے لیے موزوں ہیں۔ ایک تھیوری کو COMPUTATION کی تھیوری کہا گیا، اور دوسری کو ALGORITHMS کی تھیوری کا نام دیا گیا۔ پہلی تھیوری میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ انسانی ذہن میں پہلے سے موجود مختلف النوع حصص کو جمع کر کے ذی حس انسان (اس تناظر میں ''شاعر'') Picture Processing Module تیار کرتا ہے۔ یہ حصص آپس میں گتھم گتھا پیوست ہوتے ہوئے ایک تصویر کی شکل بن جاتے ہیں۔ دوسرے Module میں مختلف حصص کو ایک ایک کر کے صرف ان عناصر کو پورے امیج میں مدغم کیا جاتا ہے، جو مکمل طور پر اس سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ''پھول توڑتی ہوئی لڑکی'' پہلی قماش کے امیج میں شمار ہوگا۔ ''پھول توڑتی ہوئی لڑکی کے گال پر ایک تِل اور ایک تتلی'' دوسری قسم کے امیج میں شمار ہوگا۔''

(ستیہ پال آنند: ''استعارہ کیا ہے''، مشمولہ ''سمبل'' راولپنڈی)

امیج سیدھی سادی ذہن میں متشکل کی گئی، تصویری مفہوم پر مبنی ایک شبیہہ ہے جو ساکن بھی ہو سکتی اور متحرک بھی۔ عام طور پر یہ صرف قوت باصرہ کو ہی متوجہ کر سکتی ہے لیکن بسا اوقات یہ عناصر اربعہ میں سے ایک سے زیادہ عناصر کو بھی اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ ساکن امیج آرٹسٹ کی بنائی ہوئی سٹِل لائف پکچر still life picture کی طرح ہے، جبکہ متحرک امیج ایک تیز چلتے ہوئے slide show کی حیثیت رکھتا ہے۔

(ستیہ پال آنند، ''نصیر احمد ناصر کی شاعری میں روشنی کا استعارہ'' مشمولہ ''مونتاج'' لاہور)

علامت استعارے کی جیومیٹری کے ایک سے زیادہ قوسوں، زاویوں اور گولائیوں پر انحصار رکھتی ہے۔ کبھی اس کا ماخذ صرف ایک باصری پیکر ہے اور کبھی یہ تاریخ، اسطورہ یا مذہب سے اخذ کی گئی اصطلاحات کو عصر حاضر کے چوکھٹے میں رکھ کر اپنے معانی تلاش کرتی ہے۔ کچھ اصطلاحات، جیسے صبر ایوبی، عدل نوشیرواں، سدِّ سکندری، پچھمن ریکھا، چودہ برس کا بنباس وغیرہ، اپنا تصوریری مفہوم کھو چکنے کے باوجود اپنا علامتی مفہوم رکھتی ہیں

(''علامت کیا ہے''، مشمولہ ''فنون'' لاہور)

یہ طویل اقتباسات شاید اس مضمون کی طبع نازک پر گراں گذریں، لیکن ان کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ اگر مجھے جاوید صاحب کی شاعری کو ایک خاص فریم آف ریفیرنس میں رکھ کر دیکھنا ہے، تو ان تین اہم اصطلاحات کے بارے میں اپنا عندیہ بیان کرنا ضروری تھا۔

آج سے بیالیس برس پیشتر، یعنی 1968ء میں اپنے شعری مجموعہ ''موج صد رنگ'' کے دیباچہ میں عبداللہ جاوید نے لکھا تھا:

چونکہ تخلیق کا عمل ایک نیم تارک، نیم روشن فضا میں ظہور پذیر ہوتا ہے، اس لیے لازماً ابہام کا حامل ہوتا ہے۔ ہر لفظ معنویت کی ہلکی پھلکی پرچھائیں لیے ہوتا ہے۔

یہی حال کسی مصرعے یا شعر کا ہے۔ ایسے صورت میں شاعری میں ابہام ناگزیر ہے... یوں بھی ابہام ابلاغ میں رکاوٹ کا موجب نہیں ہوتا بلکہ اس امر میں ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس سے معنی میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور قاری کی ذہنی صلاحیت کے مطابق معانی اور مطالب میں تبدیلی کے امکانات رہتے ہیں۔

جب عبداللہ جاوید لکھتے ہیں، ''قاری کی ذہنی صلاحیت کے مطابق معانی اور مطالب میں تبدیلی کے امکانات رہتے ہیں ۔۔۔'' تو وہ ''قاری اساس تنقید'' کی تھیوری کی پیش بینی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہمیں علم ہے کہ اس تھیوری کا چرچا جدیدیت کی تحریک کے سیلاب کے بعد اس کی باقیات کے طور پر شروع ہوا اور 1968ء میں ابھی اردو میں وہ ''گرنتھ'' نہیں لکھے گئے تھے جو یورپی نظریہ ساز تنقید نگاروں کے ترجمے یا چربے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اس برس چھپی ہوئی یہ کتاب ان مشمولات کا احاطہ کئے ہوئے ہے جو اغلباً اس سے بھی پہلے کے دس بیس برسوں کے دورانئے میں لکھی گئیں۔ ظاہر ہے کی ایک بیدار مغز شاعر کے طور پر جاوید صاحب شاعری کی اساس کے بارے میں ''آگاہ'' تھے، جو کہ بہت سے دیگر ہم عصر شعرا کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا۔ اس شعری

مجموعے کی طبع دوم (2006ء) کے پیش لفظ میں اگر شاعر نے ان الفاظ میں ترمیم و اضافہ کی ضرورت محسوس نہیں کی تو یہ اندازہ لگانا بھی غلط نہیں ہوگا کہ وہ اپنے موقف پر اب بھی قائم ہیں۔ دوئم شاعری میں صراحت یا قاری تک اس کے معانی کی ترسیل کے سلسلے میں جو بات انہوں نے تحریر کی ہے، وہ صنف غزل کے نسبتاً کم کشادہ تنقید کی زبان کے دائرے میں 'ابہام' کی اصطلاح سے پہچانی جاتی ہے۔ نظم کے بارے میں لکھتے ہوئے آج کا تنقید نگار یا ریسرچ اسکالر ایک مختلف قسم کی technical palance of literary criticism استعمال میں لاتا ہے۔ بہرحال عبداللہ جاوید صاحب نے ان سطروں میں بھی ان cliches کا سہارا نہیں لیا جنہیں نقاد دہراتے دہراتے تھک گئے ہیں۔ ''نیم دروں نیم بروں''، ''صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں'' وغیرہم ...تنقید کی اس current coinage سے تو ہم سب آگاہ ہیں، لیکن عبداللہ جاوید کی پیکریت اور تمثال سازی سے مملو ''نیم روشن فضا''، ''معنویت کی ہلکی پھلکی پرچھائیں'' 'ابہام' کے تصویری مفاہیم کے طور پر آج سے بیالیس برس پیشتر شاید پہلی بار استعمال میں لائی گئی ہوں۔

میں اب تفصیل سے جاوید صاحب کے تین بڑے شعری مجموعوں ''موجِ صد رنگ''، ''خواب ساماں'' اور ''حصارِ امکاں'' کا جائزہ لینے کی سعی کروں گا، صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ وقت کے ساتھ امیج، استعارے اور علامت کے استعمال میں ان کے فنِ شعر میں کیا تبدیلی رونما ہوئی۔

''موج صد رنگ'' (جیسا کہ گذشتہ صدی کی ساٹھ کی دہائی میں رواج تھا) بنیادی طور پر غزلیات کا مجموعہ ہے۔ اٹھاون غزلیات کے بعد تیس کے لگ بھگ نظمیں بھی ہیں، لیکن ان نظموں میں بھی (ایک دو کو چھوڑ کر) صنف غزل کی بین المتونیت کے توشہ خانے سے مستعار تشبیہوں، اشاروں اور کناؤں پر زیادہ تکیہ کیا گیا ہے۔ بنیادی امیج تصویری مفہوم پر قناعت کرتے ہوئے علامت اور استعارہ سازی میں کم کم مدد و معاون ثابت ہوا ہے۔ تو بھی کچھ نظموں میں اس بات کے شواہد ملتے ہیں کہ جاوید صاحب ان پر قانع نہ رہ کر (غزلوں میں کم اور نظموں میں زیادہ) ان تجربات کو اپنی گرفت میں لینے کی سعی کرتے رہے ہیں، جن کی وجہ سے آج کی نظمیہ شاعری اپنی الگ شناخت رکھتی ہے۔ صرف یہ بات کہہ دینا شاید کافی نہ ہو کہ چونکہ غزل، (بالخصوص کلاسیکی اور نیم کلاسیکی غزل)، موضوعات کی سطح پر ایک مدت سے یادِ ماضی، اور ہجر و وصال کو 'من و تو' کے چوکھٹے میں رکھ کر پیش کرتی آ رہی ہے، اس لیے ان نظموں میں بھی یہ اثرات نمایاں ہیں۔ کیوں کہ کچھ نظموں میں ان موضوعات کا متن میں رچاؤ یکسر نیا ہے۔ مثال کے طور پر ''نقشِ دوام''، ''یہ بھی کیا کم ہے''، ''دلاسا''، ''ہوا''، ''قلوپیطرا''، ''بے ساختہ ہنسنے کی ادا'' ''لب بستگی''، ''زیست''...ان نظموں میں یادِ ماضی کو ایک سہانا خواب یا ایک قبیح عذاب تسلیم کرتے ہوئے متشکل کیا گیا ہے۔ لیکن جاوید صاحب کلاسیکی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر بھی ایک ایسا اسلوبِ بیان اور لفظیات کا ایک ایسا بہاؤ اور آہنگ بروئے کار لاتے رہے ہیں جو کلاسیکی غزل کا خاصہ نہیں ہے۔ اسی طرح ہجر و وصال کے oft-celebrated موضوع کو ''واپس آجاؤ''، ''جدائی''، ''مکالمہ''، ''رسوائی'' اور اس زمرے کی ایک یا دو اور نظموں میں اگر برتا بھی گیا ہے تو پیش پا افتادہ کلیشے زدہ اندازِ بیان سے قسم کا aesthetic distance رکھ کر۔ وقت، زماں اور مکاں کا موضوع ''بھاگتے لمحے، بدلتے روپ''، ''عرفانِ نفس'' اور ''نوشتۂ دیوار'' میں نبھایا گیا ہے اور ان میں یقیناً وہ سب کچھ موجود ہے جس کی توقع جدید شاعری کے ایک اچھے شاعر سے کی جاتی ہے

دو نظمیں جن کی طرف خصوصی توجہ مبذول ہوتی ہے اور جو دیگر نظموں سے مختلف بھی ہیں اور treatment کی سطح پر ممتاز بھی، وہ نسبتاً طویل ہیں۔ ''جسم کی آواز'' ایک اعلامیہ ہے جو جسم کو روح پر فوقیت دیتے ہوئے ''جسم'' کو صیغہ جمع میں رکھتا ہے۔ اسی طرح ''بھاگتے لمحے بدلتے روپ'' میں 'وقت کے روشن لمحوں' کے ریشمی ملبوسات کے تار تار ہونے کی دہائی ہے۔ اسی نظم کے پانچویں بند سے یہ بھی واضح ہے کہ بیانیہ اور اعلامیہ کیسے کئی بار امیج کو تشبیہ تک متشکل کرنے کے بعد استعارے اور علامت سے کسی حد تک کنّی کترا جاتا ہے۔ تو بھی آخری سطر تک زرِ متروک میں سے بھی پائی پائی وصول کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔

وقت کے ساتھ گزرتے گئے روشن لمحے
زیست کی قوسِ قزح رنگ سے محروم ہوئی
رات کا روپ لُٹا
سحر کا جادو ٹوٹا
فصلِ گل حسن سے بیگانہ ہوئی
اور خزاں
حیف خالی ہوئی اسرار سے رومانوں کے!!

زیست کی قوسِ قزح، رات کا روپ، سحر کا جادو، (یہاں 'سحر' کے تلفظ میں شاید سہو ہے)، فصلِ گل کا حسن، اور خزاں کے رومانوں کے اسرار... بے حد خوبصورت الفاظ ہیں جو بصری امیج کو کانسیپٹ سے منسلک کرتے ہوئے پیش ہوتے ہیں لیکن اپنی تصویری جیومیٹری میں مخلوط استعارہ بنتے بنتے رہ جاتے ہیں... اور پھر صرف ایک لفظ ''حیف'' کے المناک اعلامیے سے ایک نیا جامہ اوڑھ لیتے ہیں۔ لیکن اسی بند کی حسب ذیل سطریں ایک دیگر منظر نامہ پیش کرتی ہیں، جہاں شاعر کی قدرت استعارے اور علامت کو بخوبی اپنی مٹھی میں جگنو کی طرح قید کر لیتی ہے،

وقت کے ساتھ
زمانے کا فسوں بھی ٹوٹا
دیکھتے دیکھتے ہر ریشمی پردہ سرکا
کھینچ کر پھینک دیا

وقت نے ہر شے کا لباس
زیست بھی ہوگئی
عریاں
زن فحبہ کی طرح!!

قطع نظر اس بات کے کہ ''فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن'' کی تقطیع میں یہ صرف چار سطریں جنہیں قطع و برید سے آٹھ بنا دیا گیا ہے، استعارے کی سطح پر ایک الگ ہی منظر نامہ پیش کرتی ہیں۔ ''لباس'' ''پردہ''..اور انہیں بیدردی سے کھینچ کر پھینکنا ایک متحرک بصری امیج ہے لیکن اس کا دوسرا کنارہ اسے استعارے میں بدل دیتا ہے۔ ''زیست بھی ہوگئی عریاں زنِ فحبہ کی طرح''۔

مجھے یہ باور کرنے میں کوئی عار نہیں کہ اپنے پیش لفظ میں 'ابہام' اور 'قاری اساس تنقید' پر رائے زنی کرنے والا شاعر اس شعری مجموعے میں خود 'نیے دروں نیے بروں' کو شاں تھا کہ اپنے اس تجربے کو کیا حتمی شکل دے جس سے وہ غزل کی روایت سے باہر آ کر استعارے اور علامت کے توسط سے وہ بات کہہ سکے جسے اظہاریہ، بیانیہ یا اعلامیہ کے لبادے میں ملبوس کر کے کہنے کی عادت ثانی اس عہد کے تقریباً سبھی شعرا کو تھی۔ اس سے دو قدم آگے جائیں تو کہا جا سکتا ہے کہ اس مجموعے میں اس بات سے بھی پرہیز کیا گیا ہے کہ دور دراز سے کھینچ کر لائے ہوئے ایسے استعاروں، تشبیہوں، اشاروں سے پرہیز کیا جائے جو اپنی ملفوفیت کی وجہ سے کسی بھی نظم کا حسن سنوارنے کے بجائے اسے بگاڑ دیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ رمز اور استعارے کا برمحل استعمال ہی شعر کو حسن بخشتا ہے لیکن گنجلک استعارے معنی کے موتی کو ڈبیا میں، ڈبیا کو ایک صندوق میں اور صندوق کو سمندر کی گہرائی میں ڈبو دینے کا وہ عمل ہے، جو سہلِ ممتنع کی ضِد ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ جاوید صاحب نے اس مجموعے کی منظومات میں سہلِ ممتنع سے کام لیا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ صراحت کی اکہری سطح پر قناعت نہ کرتے ہوئے جہاں جہاں وہ رمز اور علامت کا سہارا لیتے ہیں، خوش سلیقگی سے اسے پھر اپنے اظہار کے انداز اور الفاظ کے استعمال سے صراحت کی طرف موڑ کر لے آتے ہیں۔ مفہوم کی ادائیگی براہ راست ہونے کے باوجود قاری تک کوئی پیغام پہنچانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ جو بات اظہر من الشمس ہے وہ یہ ہے کہ کہیں بھی شعریت سے عاری درشت یا کھردرا لہجہ (جو رواج کے طور پر جدید تر نظم کا شعار بن چکا ہے) نہیں ہے۔ جاوید صاحب نہ صرف نظم کی 'شعریات' سے واقف ہیں بلکہ اس کے لوازمات کو اس خوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ عام قاری محظوظ تو ہوتا ہی ہے لیکن باز آفرینی کے طور پر نظم کے مکرر مطالعہ سے ایک آگاہ قاری یہ بھی معلوم کر لیتا ہے کہ شاعر نے کس خوبی سے ان لوازمات کو برتا ہے۔ کچھ سطریں جن میں آسانی سے سمجھ آ سکنے والے استعاروں کا چلن ہے، یہ ہیں۔

یہ گذرتا ہوا لمحہ ہے اک آزاد پرند
برق رفتاری سے اُڑتا ہی چلا جاتا ہے
ایک موہوم حقیقت ہے، حقیقت ہی سہی
اک بدلتی ہوئی شے
جس کا نہ ادراک ہوا
اور گزرا ہوا لمحہ ہے گرفتارِ قفس
(موئن جوڈارو)

(''آزاد پرند'' اور ''گرفتارِ قفس'' غزل کے استعاراتی توشہ خانے سے مستعار ہوتے ہوئے بھی ''گزرتے ہوئے لمحے'' کے حوالے سے نئے تو ہیں ہی لیکن صراحت کا دامن بھی نہیں چھوڑتے۔)

عبداللہ جاوید صاحب کی وہ منظومات جو نسبتاً نئی ہیں، اس مجموعے کی منظومات سے ایک الگ مخلوق ہیں۔ یہ ان کے دو دیگر شعری مجموعوں میں شامل ہیں۔ ''حصارِ امکاں'' 2003ء میں شائع ہوا۔ اس میں نظموں کی تعداد پہلے مجموعے سے کہیں زیادہ ہے۔ غزلوں اور نظموں کے سیکشن الگ الگ نہیں کیے گئے۔ کچھ غزلیں بھی مسلسل غزل کے زمرے میں شامل کی جا سکتی ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر شعوری کا لاشعوری طور پر غزل گوئی کی نسبت نظم نویسی کی طرف 'مائل بہ کرم' ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے بعد کا، یعنی تیسرا شعری مجموعہ ''خواب سماں'' 2006ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس میں حصۂ غزل کو سرکا کر پیچھے کر دیا گیا ہے۔ (یاد رہے کہ پہلے مجموعے میں یہ سرفہرست تھا!) اونظموں کے برعکس تعداد کے علاوہ اہمیت میں بھی غزلیات اس مجموعے میں ایک ایک غیر اہم ضمیمہ سی دکھائی دیتی ہیں۔ یعنی شاعر، آہستہ آہستہ، لیکن پوری شدّ و مد کے ساتھ صنف غزل سے جیسے پیچھا چھڑانے کے درپے ہے۔

ان دو شعری مجموعوں کو، پہلے مجموعے کے تناظر میں رکھ کر کچھ اور اندازے بھی لگائے جا سکتے ہیں۔ جہاں اپنے طور و طریق میں جاوید صاحب کچھ شعری عادات سے دست بردار ہو گئے ہیں وہاں کچھ دیگر قاعدوں کو انہوں نے نہ صرف بدستور قائم رکھا ہے، بلکہ انہیں پہلے سے بھی زیادہ مستحکم کر دیا ہے۔ یہ قاعدے stylistic devices کے زمرے میں آتے ہیں اور ایک Conditioned Reflex (عادتِ ثانیہ) کی طرح ان کے ساتھ چلتے آئے ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے ان کا لیکھا جوکھا کرنا ضروری ہے۔

ہیئت سے مراد جہاں بہت کچھ اور بھی ہے، وہاں عروضی ارکان کی بنیاد پر، یا اس سے انحراف کرتے ہوئے، سطروں کی تراش خراش ہے۔ عام طور پر کسی بھی شاعر میں یہ عادتِ ثانیہ ایک سی رہتی ہے اور کسی مخصوص نظم کے موضوع اور متن کے باہمی تعلق سے اگر اس نظم میں شاعر اپنی عادت سے گریز کرتا بھی ہے تو عارضی طور پر ہی وہ اس گریز کو 'برداشت' کرتا ہے۔ کسی بھی نظم کی ایک سطر عروضی ارکان کے انسلاک سے ایک ایسی ''اینٹ'' ہے، جو دیگر 'اینٹوں کی بنیاد در بنیاد بنتے ہوئے نظم کے پورے ڈھانچے کو استوار کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ سطر کی تراش میں تجربہ کاری کی ایک صورت اینٹوں کے ساخت اور سائز کو

چھوٹا یا بڑا کرنے سے متعلق ہے اور بیشتر شعرا اپنی جدّت پسندی کی وجہ سے ایسا کرتے آئے ہیں۔(انگریزی میں E.E. Cummings کی مثال دی جاسکتی ہے۔) جاوید صاحب شروع سے ہی اپنی منظومات میں مختصر سطر کا التزام برتتے آئے ہیں۔ان کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں کہ اگر ان کی سطروں کی طوالت کی پروا نہ کی جائے اور کسی بھی بحر کے عروضی ارکان کی طرح انہیں لکھا جائے تو ان کی نظم 'بلینک ورس' سے نظمِ معرّا کی صورت اختیار کرلے گی۔ملاحظہ ہو

فکر تلوار ہے
احساس سم قاتل ہے
فکر و احساس میں سمبندھ
نہ ہونے پائے
ذہن میں ٹیس اٹھے
رُوح نہ رونے پائے۔

فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن ۔۔میں یہ تین مصارع باقاعدگی سے تقطیع کئے جاسکتے ہیں۔ملاحظہ ہو

فکر تلوار ہے، احساس سم قاتل ہے
فکر و احساس میں سمبندھ نہ ہونے پائے
ذہن میں ٹیس اٹھے، روح نہ رونے پائے

خوبصورتی اس امر میں مضمر ہے کہ جب تک قاری شاعر کی محولہ بالا چھ سطور کو پڑھنے کے بعد اپنے عروض دان ہونے کے ثبوت کے طور پر انہیں تین سطروں میں نہ لکھے (جیسے کہ میں نے کیا ہے) اسے اس بات کا احساس تک نہیں ہوگا کہ جو کچھ وہ پڑھ رہا ہے وہ ایک نظمِ معرا ہے۔یہی امر جاوید صاحب کے اس طریق کار کی کامیابی کی معراج ہے۔اس لحاظ سے میں جاوید صاحب کو تصدق حسین خالد، میراجی، قیوم نظر اور فیض احمد فیض کے زمرے میں کھڑا پاتا ہوں جنہوں نے یہی انداز اپنایا۔خالد کی نظم ''راہ دیکھی نہیں'' اور میراجی کی نظم ''کلرک کا نغمۂ محبت'' میں ان دو اصناف یعنی معرّا نظم اور آزاد نظم کو بہم دگر ہم آغوش کر دیا گیا ہے۔فیض اپنی کئی نظموں میں قوافی کو مرتب نہیں کرتے اور بیچ بیچ میں ایک دو مصارع معرّا کے انداز میں بھی لکھ دیتے ہیں۔اس سے ایک قسم کا تنوع پیدا ہوتا ہے۔قیوم نظر کی نظم ''اپنی کہانی'' بھی معرا نظم اور آزاد نظم کے انضمام کا ایک نادر نمونہ ہے۔

ایک اور نظم ''واپس آجاؤ'' سے امر کی تائید مزید کی جاسکتی ہے۔یہ نظم ''موج صد رنگ'' میں شامل ہے اور ''فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلن'' سے تقطیع کی جاسکتی ہے۔لیکن کہیں کہیں سالم سطر کو دو یا دو سے بھی زیادہ ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔پہلی پانچ سطریں یہ ہیں:

نصف شب بیت چکی، سرد ہوا چلتی ہے
گھر کے سب لوگ ہیں خوابیدہ نہ جانے کب سے
پاس کے کمروں سے خرّاٹوں کی گونج آتی ہے
اور احساس پہ چھائی ہوئی کہرے کی گھٹا
گہرے ہوتے ہوئے سنّاٹے میں کھو جاتی ہے۔

یہ مصارع خارجی اور داخلی دُنیاؤں میں ربط تلاش کرنے کے لیے 'ابتدایہ' کے طور پر لکھے گئے ہیں۔پہلا مصرع گھر سے باہر کی دنیا کو ایک نظر سے دیکھتا ہے۔دوسرا اور تیسرا مصرع گھر کے اندر، لیکن 'پاس کے کمروں' کا احوال نامہ بیان کرتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ واحد متکلم کا اپنا ایک الگ کمرہ ہے۔چوتھے مصرعے میں 'خارج' کے macrocosm سے 'داخل' کے microcosm کی طرف مراجعت ہے۔اور خارجی ماحول داخلی (ذہنی، جذباتی) ماحول میں تبدیل ہو جاتا ہے۔اس کے فوراً بعد، نئے بند کی پہلی سطر کو دو لخت کر دیا گیا ہے۔

گھر کے باہر بھی
سکوتِ شبِ غم طاری ہے۔

اگر مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ ایسا کیوں کیا گیا تو میرا غیر مُبہم جواب یہی ہوگا کہ اس سطر کا پہلا ٹکڑا ''گھر کے باہر بھی'' خود میں آزاد ہے۔کلمۂ رَبط ''بھی'' (بمعنی 'نیز'، 'اور'، 'علاوہ')، البتہ اس کو پہلے بند کے (نصف شب بیت چکی، سرد ہوا چلتی ہے) سے مربوط کرتا ہے۔اس لحاظ سے اس سطر کے باقی ماندہ حصّے کو اس سے الگ کرنا عین واجب تھا۔اس سطر کا دوسرا ٹکڑا ''سکوتِ شبِ غم طاری ہے'' ایک بار پھر 'خارج' کے عوامل سے چل کر 'اندر' تک رسائی حاصل کرنے کی سعی ہے۔اگر شاعر صرف ''سکوتِ شب'' کہہ دیتا تو یہ سعیٔ لا حاصل بن جاتی، لیکن جونہی 'شب' کو 'شبِ غم' کہہ دیا گیا، امیج کا جذبے سے تعلق قائم ہوگیا۔

اسی نظم میں سطر کی تراش کئی مقام پر بے حد خوش نما پھول کھلاتی ہے۔مثلاً

نیند آتی ہی نہیں
نیند نہیں آتی ہے

اس کم بخت فارسی عروض (جس کا طوق اردو نے ایک مُردہ Albatross کی طرح اپنے گلے میں پہنا ہوا ہے) کو کیا کہیے کہ اس میں اردو جملہ سازی کے صوتی محاکات کی قدم قدم پر نفی کی جاتی ہے۔اسی مصرعے کو لے لیجیے۔دونوں ٹکڑے آپس میں جُوڑ کر ''فاعلاتن، فعلاتن، فعلاتن، فعلن'' کے پیمانے سے بخوبی تقطیع کیے جاسکتے ہیں، لیکن جونہی یہ سطر دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوئی، نتیجہ ہمّت افزا نہیں رہا۔

''نیند آتی'' (فاعلاتن)، ''ہی نہیں نی'' (فعلاتن) ''د نہی آ (فعلاتن)، ''تی ہے'' (فعلن) یعنی شاعر جب سطر کو قطع کرتا ہے تو وہ اردو یا ہندوی جملہ سازی کی رُو سے صوتی محاکات کا پورا خیال رکھ رہا ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ فارسی عروض کی نفی کر رہا ہے۔

E.E. Cummings نے لکھا تھا کہ اس کے سوچنے کا انداز بھی اس کی نظموں کی ہیئت کی طرح ہی ریزوں، ٹکڑوں اور قتلوں pieces, bits and fragments میں بٹا ہوا ہے۔ گویا اس نے ہیئت کو (سطروں کی تراش کے حوالے سے) تخلیقی قوت کا ظاہری نتیجہ تسلیم کرتے ہوئے خود پر ہی اس بات کا اطلاق کیا تھا کہ اس کے سوچنے کا ڈھنگ ''لخت لخت'' ہے۔ جاوید صاحب کی 'لخت لخت' منظومات پڑھتے ہوئے راقم الحروف کو تو ایسی کوئی بات دکھائی نہیں دی جس سے یہ حتمی نتیجہ فرض کر لیا جائے کہ ان کے ذہن میں شعری انکھوے پھوٹنے کا منظر نامہ ایک ثابت و سالم تجربہ نہیں ہے۔ سبھی نظریہ ساز نقاد کم از کم اس مفروضے پر متفق ہیں کہ form کو subject پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ اس لحاظ سے مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہے، کہ جاوید صاحب کے ہاں ہیئت کی لخت لخت خوش نمائی ان کے شعری تجربے کا ''اظہاریہ'' ہے نہ کہ تخلیقی لمحے کے وقت کا ذہنی ''افشاریہ''!

اب میں ایک اور طریق کار کا سہارا لیتے ہوئے جاوید صاحب کی کچھ منظومات کے متن میں مشمولہ ان فکری اور شعری ائتلاف کو دیکھوں گا جو استعارے کی مختلف سطحوں پر علیحدہ معنویت لیے ہوئے وارد ہوتے ہیں۔ اس طریق کار سے دیکھنے میں ان کی نظموں میں تین اقسام کی تمثال نگاری کا سراغ ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مختصر مضمون میں سب نظموں کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے میں اس انتخاب کو صرف کچھ ایک نظموں تک ہی محدود رکھوں گا۔

یہ تین اقسام ہیں:

۱۔ مرکب۔ ۲۔ مخلوط۔ ۳۔ مجرد

ان کی permutation and combination سے دو اور اقسام متشکل ہوتی ہیں۔ یہ ہیں

۴۔ مجرد مخلوط۔ ۵۔ مجرد مرکب

مرکب تمثال سازی کی مثالیں دونوں کتابوں میں شاید ایک سو سے بھی زیادہ ہوں گی۔ لیکن یہ ان کی مختصر ترین نظموں میں سرکردہ دکھائی دیتی ہیں۔ کچھ مثالیں یہ ہیں

آزار لوحِ جاں پہ
محبت نے لکھ دیے
کانٹے کسی کی پھول سی
صورت پہ لکھ دئے

(آزار لوحِ جاں پہ۔ خواب سماں)

محولہ بالا نظم کو غزل کے مطلع کے طور پر لکھا جا سکتا تھا لیکن تب تمثال سازی اس فارمیٹ میں گُم ہو جاتی۔ ایک اور مثال یہ ہے۔

عشق نے
بے قراریاں بخشیں

عشق نے کب کسے
قرار دیا

عشق نے
پہلے چھین لی دستار
بعد میں
پیرہن اتار دیا

عشق نے
لمحہ لمحہ زخم دیے
عشق نے
لحظہ لحظہ مار دیا

(''عشق نے''۔ خواب سماں)

اس بات سے قطع نظر کہ یہ مکمل نظم دراصل بحرِ خفیف (فاعلاتن مفاعلن فعلن) کے صرف چھ مصارع سے عبارت ہے، اس کی تراش خراش اور 'سطور سازی' نے اسے مرکب تمثالوں کو آسانی سے دیکھنے اور سمجھنے کی قدرت عطا کر دی ہے۔

مخلوط تمثال سازی کی مثالیں تو بیسیوں ہیں (اور تینوں مجموعوں میں موجود ہیں) لیکن اس کا بہترین نمونہ میں نے ''خواب سماں'' ہی کی ایک نظم میں پایا۔

بلند و بالا چبوترے کی
ہر ایک دہلیز پر دیے ہیں
نیا دیا
لے کے آنے والے
یہ سوچتے ہیں

کہاں جمائیں دیا کہ جس کی
لرزتی اور کانپتی لو
بلند و بالا چبوترے کی
تمام تر رفعتوں کو چھو لے

یہ نظم الفاظ کی کئی پرتوں میں معنی در معنی سموئے ہوئے ہے، لیکن بلند و بالا چبوتر ا اور دہلیز جو کسی درگاہ، خانقاہ، سادھی کی نشاندہی کرتے ہیں خود میں صرف ایک امیج سے آگے نہیں بڑھتے۔ جلتے ہوئے دیے کا لایا جانا اور اسے (کچھ تلاش کے بعد) ایک ایسی جگہ رکھنا جہاں وہ چبوترے کی ساری رفعتیں (روحانی چوٹیاں) سر کر لے، ایک اکہرے امیج کی تمثال سازی کرتے ہوئے

اسے پہلے مرکب اور پھر مخلوط بنا دیتا ہے۔''حصار امکاں'' میں شامل ''محدود سچائی'' نسبتاً طویل ہے لیکن اس میں مخلوط تمثال سازی بے حد خوبصورتی سے ابھر کر آتی ہے۔

دائیں ہاتھ پہ سونا رکھو
بائیں ہاتھ پہ چاندی
اور کہو''جو کچھ میں بولوں
سچ بولوں
سچ کے سوا ایک حرف نہ بولوں

اس پر بھی جو کچھ تم بولو
میں اس کو
اک ایسا جادو مانوں گا
جو سونے کے اور چاندی کے
اور ہر''میں'' کے
سر پر چڑھ کر بولتا ہے
جو اک خاص چمانے کی مخصوس ترازو
ہاتھ میں تھامے
زیست کی ہر شے تولتا ہے
اور کہتا ہے
''جو کچھ میں بولوں سچ بولوں
سچ کے سوا اک حرف نہ بولوں''

عدلیہ، انصاف کا ترازو، ملزمین اور گواہان کا قرآن، یا انجیل یا گیتا پر ہاتھ رکھ کر حلف لینا....اس microcosm کا اطلاق کل دنیا کے macrocosm کرنے کے جاوید صاحب کی تکنیک سے ہم آگاہ ہیں، لیکن اس نظم میں مخلوط تمثال سازی اپنے عروج پر ہے۔

مجرد تمثالیں عموماً غزل کے اشعار میں پائی جاتی ہیں۔ خنجر، زخم، تیر، تفنگ، تلوار، ساحل، موج، کنارہ، طوفان، نا خدا، دشت، کارواں، میرِ کارواں، محمل، آشیانہ، قفس، بے بال و پر ہونے کی کیفیت... یہ روایتی استعارہ سازی کی تمثالیں ہیں۔ فی زمانہ سنگ و آہن، امیرِ شہر، غریبِ شہر، دار و رسن، پا بہ زنجیر ہونا وغیرہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ مجرد تمثالیں ہیں۔ جدیدیت کے دور میں مجرد تمثالوں کو بھی حاشیہ آرائی سے مخلوط بنانے کی روش عام رہی، ۔ مابعد جدیدیت میں بھی کسی حد تک اس چلن کو روا رکھا گیا ہے۔

چونکہ جاوید صاحب مختصر اور مختصر ترین نظموں میں ید طولےٰ رکھتے ہیں اس لیے مجرد تمثالیں ان کی منظومات میں بھی اسی طرح در آتی ہیں جیسے غزل کے اشعار میں ۔ میں منظومات کا حوالہ دیے بغیر اور نظموں کے مکمل بند یا سطور کا اقتباس دیے بغیر کچھ ایک مثالیں نیچے لکھ رہا ہوں شمع کی بے جان لو، طبع کی دھیمی سی ضو، بدیسی لکڑ بھگے، سگانِ وحشی، اُلٹا پیالہ، اونٹ کا مشکیزہ، شاخِ ببول، گہر، خاک، قطرۂ آب، یہ سب دیکھی بھالی دنیا کے آبجیکٹ یا سبجیکٹ ہیں۔ لیکن کچھ تمثالیں ایسی بھی ہیں جو یکسر نئی ہیں۔ خون کا پمپ، مشینوں کے آقا، ذہن کا کمپیوٹر، گیند گلوب کی، عقبی لان، ...ایسی کئی اور بھی ہیں۔

تشبیہ بنیادی طور پر ہم طرحی یا ہم رنگی کی مشابہت ہے۔ تماثل، تشاکل اور تجنیس (لفظی یا خطی) بھی اسی قماش کے ہنر ہیں۔ امیج سے آگے بڑھیں تو خشت در خشت پرتوں کی تعمیر میں قیاس، قیافہ، التباس و انطباق ۔۔ان سب عوامل کے توسط سے ہم استعارہ سازی کرتے ہیں۔ بقول غالب

بسانِ کاغذِ آتش زدہ، نیرنگِ بے تابی
ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر

عبداللہ جاوید صاحب 'جدیدیت' کے اس حد تک حامی نہیں ہیں کہ وہ افشار و انتشار پر تکیہ کرتے ہوئے اپنے نفسِ مضمون سی ہی بھٹک جائیں۔ ان کے ہاں تجریدی آرٹ کے وہ جدید فیچر نہیں ہیں، جن سے مثنیٰ یا مشابہت، سے آگے بڑھ کر کسی فوٹو گراف کی enlarged تصویر پیش کی جاتی ہے یا تصغیر یہ کی سطح پر اسے minimise کر دیا جاتا ہے۔ وہ اگر آرٹسٹ ہوتے تو بھی شاید surrealism پر تکیہ کرنے کے بجائے representational painting کرتے۔ لخت لخت سطور کے التزام کے باوجود ان کی نظموں میں تسلسل ہے استحکام ہے، پائداری ہے،- Organic Unity ہے۔ اگر بو قلمونی یا رنگا رنگی ہے تو وہ بھی اس توافق کو مجروح نہیں کرتی۔ اس لحاظ سے ان کے ہاں استعارے کی سطح پر ''مشبہ بہ'' اور ''مشبہ'' میں one to one equation ہے۔ اگر موضوعاتی سطح پر وہ ایک آگاہ شاعر ہیں تو اسلوبیاتی سطح پر بھی وہ زبان و بیان کے رموز سے واقف، منجھے ہوئے استاد شاعر ہیں۔

تین اشعار

خواب در خواب گزرتا تھا کیا
یہ سفر نیند میں کرنا تھا کیا

زندگی تھی کوئی چڑھتا دریا
موت، دریا کا اترنا تھا کیا

زندگانی کی نہج کیسی تھی؟
قید خانے میں بسرنا تھا کیا

(عبداللہ جاوید)

''خلوت خانۂ دل''

اکرام بریلوی
(کینیڈا)

عبداللہ جاوید جواعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہیں، عالمی ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔۔۔۔۔افسانوی ادب اور سنجیدہ کالم نگاری کے رموز سے واقف ہیں، ان کے تین دیدہ زیب شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔۔۔ انہوں نے خود اپنے نظریہ شاعری سے متعلق کئی اجمالی اور تفصیلی خیالات کا اظہار کیا ہے جسکا لُبِ لُباب کچھ اسطرح ہے۔

'' میری رائے میں شاعری صنّاعی نہیں بلکہ خلاّقی ہے اور خلاّقی کو خالص شعوری عمل سمجھنا قرینِ قیاس نہیں۔۔۔۔شعر وارد ہوتا ہے، لایا نہیں جاتا۔ جب وہ آتا ہے تو اپنے ساتھ وہ سب کچھ لاتا ہے جسکو ہم فارم، اسلوب، آہنگ اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

متنوّع اور مختلف فارم شاعری کے خلاّقانہ عمل میں مدد ومعاون ہو تے ہیں۔۔۔۔۔ شعر میں خواہ خطابت کی روح ہو، خواہ فکر کا عنصر، جذبے کی آمیزش ہو کہ احساسِ جمال کا رچاؤ، شعر اوّل اور آخر شعر رہتا ہے اور اسکو شعر کے طور پر دیکھنا ہی صحیح ترین عمل ہے۔۔۔۔۔۔ابہام، ابلاغ میں رکاوٹ کا موجب نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔اس سے معنوں میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے ۔۔۔۔۔جس بات کو ہم روایت سے بغاوت کہتے ہیں۔وہ بھی روایت کے پس منظر میں نمو پاتی ہے۔ '' وغیرہ وغیرہ۔

لیکن میری رائے میں بکھری بکھری، ریزہ ریزہ بے نام سی چیزوں کو زندگی دینا شاعری کی جادوگری ہے اور اس زندگی کا اہم ترین اور حسین ترین مظہر انسان اور اسکے مسائل ومعمولات ہیں۔۔۔۔ پابلو نرودا نے کہا تھا۔'' یہ انجان گلی کا بلاوا ہے'' شاعر اس انجان گلی میں انجانی بے چینی کے دباؤ میں سر گرداں رہتا ہے کہ یہ ایک بے سمت سفر ہے اپنے آپ کے ساتھ اور اپنے سے ایک بامعانی علیحدگی کے ساتھ۔اس حقیقت کو اس طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ اجتماعی شعور کے اظہار کے مختلف طریقوں میں سے ایک طریقہء کار کا نام شاعری ہے۔شاعری جو زندگی اور انسان کو قریب لاتی ہے اور زندگی اور انسان کی رزم وبزم آرائی شاعر کے لئے سرخوشی اور نشاط وانبساط کا حیلہ اور وسیلہ بن جاتی ہے۔شاعر کا رشتہ گو بظاہر اندھیروں سے ہے مگر وہ اندھیروں میں روشنی اور نور پھیلانے کو اپنا مقصود ومنشاء سمجھتا ہے۔ہمیں ان ہی حدود وامکانات کے اندر رہ کر عبداللہ جاوید کی شاعری کو دیکھنا، سمجھنا اور پرکھنا ہے ۔

عبداللہ جاوید کا عمومی موضوع انسان اور خدا، اور ان کے اندر اور باہر جو کچھ بھی ہے وہ ان کے ذیلی موضوعات ہیں دراصل ان کی شاعری کا محور صو فیانہ افکار سے ہم رشتہ ہے۔ان کے صوفیانہ افکار وواردات میں جو والہانہ شیفتگی و بُرشتگی نظر آتی ہے اس میں ان کے ددھیال اور ننھیال کا بڑا حصّہ ہے اور مذہبی روایات کا بھی۔وہ تصوّف اور طریقت کو انسانیت کی ارتقاء اور تکمیل کا راستہ خیال کرتے ہیں، اور پایان کار، یہی راستہ مذہبی، سماجی، عمرانی اور اخلاقی نظام سے مل جاتا ہے۔اس اخلاقی درس کے دو مخرج ہیں۔ ایک بے لوث محبّت اور دوسرا دلِ درد آشنا۔۔۔۔۔ان دونوں کے امتزاج سے وہ زندگی میں نہ صرف تجربات حاصل کرتے ہیں بلکہ اپنی شاعری میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرتے ہیں۔انہوں نے شعوری طور پہ جو نظامِ فکر اپنے ذہن میں قائم کر رکھا ہے اسکی مثال خا نقاہوں میں نظامِ عمل کی صورت میں نظر آتی ہے۔ ان کا یہی نظامِ فکر اک گونا طہارتِ نفس اور پاکیزگی پیدا کرتا ہے، جن کے تمام ممکنات ومضمرات کو میں ''عالمِ سرِّ جاں'' سے تعبیر کرتا ہوں۔۔۔۔۔اس مقام تک پہونچنے کے لئے قلبِ ماہیت ضروری ہے، یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب شاعر اپنے زخم کرید کرید کے دکھانے کے بجائے زمانے بھر کے غم اپنانے کا حوصلہ رکھتا ہو ۔یوں تو ولی اور میرؔ بھی اس 'عالمِ سرِّ جاں' سے گزرے مگر انہیں زیادہ تر مجاز سے دلبستگی رہی۔غالبؔ نے کچھ سوال اٹھائے، تحیّر، تجسّس اور تشکیک سے گزرے۔ جدید دور کے شاعروں میں فانیؔ، اصغرؔ اور جگرؔ بادۂ تصوّف کے ذوق شناس ہیں۔لیکن جن شعرا میں، خاص طور پر عالمِ انوار واقدار اور عشقِ حقیقی کی زمزمہ سنجیاں ملتی ہیں ان میں مرزا مظہر جانِ جاناں، نیازؔ بریلوی، میر عبدالحئی تاباںؔ، میر دردؔ، قائم چاند پوری، میر اثرؔ، انعام اللہ یقینؔ، سرتاسر رچے ہوئے ہیں۔عبداللہ جاویدؔ پر ان ہی شعرا کا اثر ہے وہ ان کے سفیر واسیر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بات تو یونہی درمیان میں آگئی تھی۔عبداللہ جاویدؔ نے اپنی شاعری میں اس منزل تک پہونچنے کے لئے چھپ چھپ کر مژہ سیلِ خوں بہایا ہے۔اپنے غموں کو انگیز کر کے دوسروں کے غم کو اپنایا ہے۔ان کی زندگی کی راتیں اس کشمکشِ سوز وساز میں گذری ہیں۔عبداللہ جاویدؔ بھی دنیاوی آسائشوں کے میسّر ہونے کے باوجود اسی عالمِ کرب سے گزر رہے ہیں کہ ان کے لئے 'درغمِ دیگر بسوز' وظیفۂ حیات ہے اس لئے ان کے کلام میں وہ ٹھہراؤ، وہ ضبط واحتیاط، اور عناں گیختگی ہے جو صرف اس وقت حاصل ہوتی ہے جو زندگی اور عشق کی تمام صعوبتوں پر انسان عبور پاجائے اور عارفانہ نہ تیور اور بے نیازانہ وضع کے ساتھ سب کچھ سہ لینے کے قابل ہوجائے۔عبداللہ جاویدؔ ہمیں دردؔ کی طرح اسی منزل پر نظر آتے ہیں یہ وہ منزل ہے جہاں غم نشاط اور اضطراب ایک بلیغ سکون میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے اور اس طرح انہوں نے اپنے باہر کو بھی اپنے اندر سمولیا ہے اور اسی لئے ان کی شاعری میں بھی کماحقّہ وہ سب کچھ سمٹ آیا ہے جو باہر ہے یا خود انکے

اندر سمایا ہوا ہے۔اور اسی لئے وہ محبّت اور عشق کی سرحد پار کر کے جنوں کی منزل کو چھو تے دکھائی دیتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ معرفتِ نفس کی اس منزل کو سرَ کر کے، معرفتِ کائنات اور معرفتِ الٰہی کو پہو نچتے ہیں ان کے ہاں جب جذبے پر تخیّل کی ضرب لگتی ہے تو اس میں ایک طرح کی روشنی پیدا ہوتی ہے۔یہ روشنی ان کے نز دیک تجلّیِ الٰہی ہے جو انہیں مشاہداتِ آب وگِل اور کرشمۂ حیات سے ہمکنار کرتی ہے۔یہی نہیں بلکہ اس طرح خودی اور خدا ان کے ہاں ایک ہوتے نظر آنے لگتے ہیں اور میں نے اس حقیقت کو 'عالمِ سرّ جاں' سے تعبیر کیا ہے۔آیئے اب ان سیّال کیفیات سے مملو کچھ اشعار ملاحظہ کرلیں۔

ہمارا سایہ بھی ایسا نہیں کہ اپنا ہو
وہ ساتھ ساتھ رہ کر جدا جدا ہی رہا

یوں دیکھئے تو اس کا نشاں بھی کہیں نہیں
محسوس کیجئے تو وہ ہر سُو دکھائی دے

حسنِ گریز پا میں ترا آئینہ تو ہوں
لیکن وہ عکس ڈال مجھے تو دکھائی دے

کیا ہے عشق تو اب روکنا کیا
یہ خنجر تو رگِ جاں پر رکے گا

عشق ہے ظاہر میں خوشبو کا سفر
راستہ جاتا ہے انگاروں کے بیچ

''اور دیکھا'' ایک نظم بھی ملاحظہ ہو:۔

میں نے طاقوں میں جلائیں شمعیں
خود بھی طاقوں میں جلا
اور دیکھا
خاک سے پھول بنا
میں اکثر
پھول سے خاک ہوا
اور دیکھا
عشق ہے آگ
یہ سنتے سنتے
آگ میں کود پڑا
اور دیکھا
دستِ دعا اٹھیں بھی تو لب پر دعا نہ ہو
جس پر خدا بھی ناز کرے بندگی ہے یہ

اپنے خلوت خانۂ دل سے جو نکلے تو ہمیں
سب کے غم میں، اپنا غم بھی جاننا مشکل ہوا

اسکی پہچان کہاں لفظوں کو
کبھی پہچان میں آیا ہے وہ
جان جب تن کی حدوں سے گذری
عرصۂ جان میں آیا ہے وہ

میرے اندر بھی کوئی ناچتا ہے
میں اسکے ساتھ پیا رے رقص میں ہوں

فلک پر جب ستارے ٹوٹتے ہیں
زمیں پر دل ہمارے ٹوٹتے ہیں
ہمیں پہچان ہوتی ہے خدا کی
ارادے جب ہمارے ٹوٹتے ہیں

رسائی ہے وراء سے ماوراء تک
مری حدِّ نظر ارض و سما تک

نہ ہونے پر بھی ہوں، میں ابتدا سے انتہا تک ہوں
مرا ہونا کوئی دیکھے، میں بندے سے خدا تک ہوں

تھا عشق گر جنوں اپنا
جادو تھا جمال آپ کا بھی

ان تمام ممکنات و مضمرات کو میں 'عالمِ سرّ جاں' سے تعبیر کرتا ہوں مگر اسکا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ایک بہار آزاد ذہن 'نیرنگیِ جلوۂ تن' کی لطافتوں سے بے نیاز ہو جائے۔عبداللہ جاوید کے ہاں اس طرح کے اشعار کی تہذیب یافتہ تکرار بھی جلوہ ریز ہے۔ملاحظہ فرمائیں۔

زیرِ پیرا ہن بھی وہ رنگیں بدن
سر سے پا تک شعلۂ عریاں لگے

(یہ شعر پڑھتے ہوئے حسرتؔ کا شعر یاد آرہا ہے)

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرا ہن تمام
(حسرتؔ)

کہا بھی ہم نے وہ آدمی ہے خواب نہیں

یہ دل غریب مگر خواب دیکھتا ہی رہا

بے ساختہ ہنسنے کی ادا یاد رہے گی
ہونٹوں پہ ہنسی، رخ پہ حیا یاد رہے گی
ہر روپ ترا دل پہ مرے نقش رہے گا
ہر بات تری مجھکو سدا یاد رہے گی

اور ''موجِ صدرنگ '' کی نظم ''لب بستگی'' اور جسم کی آوازتو نیرنگیِ جلوۂ تن سے شرابور ہیں (صفحہ ۱۴۸۔۱۴۲)

اور
اک خواب تھا تیرا
یا تو تھا
جب ہاتھ بڑھا یا
چھو نہ سکا
رنگین بدن
سب جادو تھا

''موجِ صدرنگ'' میں وہ روایت سے وابستہ شوق، شعرائے سلف، ترقّی پسند تحریک سے قبل کے شعرائے اربعہ ، حسرتؔ، فانیؔ، جگرؔ، اصغرؔ اور ہم عصر شعراء میں جذبیؔ اور ناصر کاظمی سے کسی قدر متاثر نظر آتے ہیں جو ایسی انہونی بات نہیں۔ مشتے از خروارے چند مثالیں :۔

تذکرہ حسنِ بتاں کا نکلا
بات کیا ذوقِ نظر تک پہنچی
عبداللہ جاویدؔ

موت کا وقت معیّن ہے تو پھر بات ہے کیا
کون ہے مجھ میں جو ہر سانس میں مرجاتا ہے
عبداللہ جاویدؔ

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
غالبؔ

ہر نفس عمرِ گزشتہ کی ہے میّت فانیؔ
زندگی نام ہے مر، مر کے جئے جانے کا
فانی

ایسے بھی مناظر دیکھے ہیں جو دل میں اتر تلوار ہوئے
اب اور تو کیا دکھلائیگی اے گردشِ دوراں دیکھیں گے
عبداللہ جاویدؔ

بہرحال ''حصارِ امکاں '' میں تبدیلی آئی ہے''۔ موجِ صدرنگ'' میں جذبہ فکر میں لَو دے رہا ہے تو ''حصارِ امکاں'' اور اسکے بعد ''خواب سماں'' میں فکر میں جذبے کے رچاؤ کے ساتھ فلکس (FLUX) کی سی کیفیت در آئی ہے یعنی سادگی میں ایک طرح کی وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی ہے اور عبداللہ جاویدؔ اس پرکار سادگی میں 'آزادہ و خودبین ' نظر آتے ہیں یعنی انفرادیت پیدا ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔ زیادہ تفصیل میں جانے کی کیا ضرورت ہے، وہ خود ہی کہتے ہیں:۔

''موجِ صدرنگ'' ہو یا زیرِ نظر کتاب (حصارِ امکاں) میرا شعری اسلوب بندھا ٹکا، سانچے میں ڈھلا یا ڈھالنے والا صنعتی، میکانکی ، دستکارانہ، مشینی، مرصّعکاری سے سجایا ہوا بڑی حد تک ٹھوس اسلوب نہیں ہے۔ اسکے برخلاف سیّال، لچکدار اور صدرنگ ہے۔۔۔۔ ''موجِ صدرنگ '' اور (''حصارِ امکاں '') زیرِ نظر کتاب میں جو فرق ہے وہ دو دنیاؤں کا فرق ہے میں ان میں قدرِ مشترک کے طور پر موجود ہوں۔ ''

یہ لچکدار اور صدرنگ کیفیت آئندہ بھی قائم رہتی ہے اور یہی انکی انفرادی شان اور امتیازی رنگ اختیار کرلیتی ہے۔۔ ایک مثال سے شاید بات واضح ہوجائے ۔

وہ نہ آئے تو ہوا ہی آئے
در کی زنجیر بجے ایسا ہو
جسم پہ برف کی برکھا برسے
روح میں آگ ہے ایسا ہو

نہ تھا وہ جس کو دنیا دیکھتی تھی
جو تھا وہ سامنے آتا نہیں تھا

جسم کے اندر سفر میں روح تک پہنچے مگر
روح کے باہر رہے، اندر نہیں دیکھا گیا

یا اس نظم میں ۔
صورت کے اندر
صورت گر دیکھوں
باہر سب دھوکا
کیوں باہر دیکھوں !

اور اب وہ جاپان کے بین الاقوامی شہرت یافتہ فلسفی نیشی دا کتارو Nishida Kitaro کے پھیر میں پڑجاتے ہیں۔ جنکا کہنا ہے ۔

"The West has taken Being as the ground reality, and the East has taken nothingness and the relationship of the human individual to

" either or both of these conceptions

اس اقتباس کی روشنی میں ذیل شعر اور ''سب میں ہوں مگر سب نہیں ہوں'' کے بعد ملاحظہ فرمائیں۔

نہ ہونے پر بھی ہوں، میں ابتدا سے انتہا تک ہوں
مرا ہونا کوئی دیکھے، میں بندے سے خدا تک ہوں

سناٹے میں کوئی صدا سی دیتا ہے
سناٹے میں بھول نہ جانا، میں بھی ہوں
''وا ، صورتِ زخم تھا
اب نہیں ہوں
فریاد تھا، پہلے اب نہیں ہوں

گو، میرا نفس نفس ہے روشن
مانگی ہوئی تاب وتب
نہیں ہوں
دشمن ہوں ازل سے تیرگی کا
میں سنگِ فصیلِ شب نہیں ہوں
مثبت ہوں
نفی سے صلح کرلوں
اتنا بھی تو باادب نہیں ہوں ''

اور

''موجود ازل سے ہوں، ابد تک
اے وقت بتا میں کب نہیں ہوں
کثرت میں ہوں وحدتِ مبیّن
سب میں ہوں مگر میں سب نہیں ہوں۔''
(حصارِ امکاں)

میں اس مضمون کے شروع میں کہہ چکا ہوں کہ عبداللہ جاوید کا عمومی موضوع 'انسان اور خدا' سے ہم رشتہ ہے۔۔۔۔ وہ تصوّف اور طریقت کو انسانیت کی ارتقاء اور تکمیل کا راستہ تصوّر کرتے ہیں یہی سبب ہے کہ انسان اپنے پورے ،روحانی، ذہنی ، جذباتی، مادّی اور جسمانی وجود کے ساتھ (ان ہی کے الفاظ میں) گنگناتا، ہمکتا ، روٹھتا، اور منتا نظر آتا ہے۔اسکے علاوہ ان کی شاعری میں کم وبیش وہ سب کچھ بھی ہے جو ان کے عمومی موضوع کے اندر اور باہر پھیلا ہوا ہے۔۔۔اس پھیلے ہوئے موضوع میں زندگی اور اسکی ناکامیاں اور ناہمواریاں بھی ہیں، فطرت کا جلال وجمال بھی ہے، قدرت کے مناظر کا حسن ، پھولوں کے رنگ ،آزادی کی تڑپ، بھورے کا جادو، اور شام کا طلسم بھی ہے وقت کی سوفسطائی وُسعت کا تصوّر بھی ہے اور حیات کی دلکشی اور دکھ کے ساتھ ایک طرح کا گہرا احساس بھی۔ زمانے کی شکایت بھی ہے اور خود آگہی اور خدا آگاہی کا کرب اور اعتماد بھی ہے۔ مادرِ گیتی کی خوشبو بھی ہے اور نوعِ انسان کا درد بھی ہے اور روایات کا لحاظ بھی۔۔۔ اور جدّتِ ادا کی مختلف صورتیں بھی جلوہ گر ہیں۔۔۔یعنی عبداللہ جاوید زندگی کے شاعر ہیں اور انکی شاعری کم وبیش پوری زندگی کی وسعت پر حاوی ہے۔

ان کی غزلوں سے کچھ اشعار اور منظومات سے چند حوالوں کی جھلکیاں ملاحظہ ہوں:۔

ہم خدا کو بھی بسالیں دل کے بیچ
شرط یہ ہے وہ ہمیں انساں لگے

اسی نے تیرگیِ شب کی باگ موڑی ہے
وہ ایک شعلہ جو تا صبح کانپتا ہی رہا

خاموشیوں میں سرِّ نہاں کھولتا ہوا
گونگا ہے لاکھ پھر بھی سراپا زباں ہے وقت
کل کائنات اپنے جلو میں لئے ہوئے
جاوید ہست وبود کا اک کارواں ہے وقت

یہ وقت گزر رہا ہے یا میں
خود وقت ہوں اور گزر رہا ہوں

اگلے لوگ تو فصلِ جنوں میں دامن چاک پھرا کرتے تھے
آج جنوں کہتا ہے مجھ سے دامن کا ہر چاک سیوں

ترے کوچے میں تھا یہ بات سچ ہے
میں زیرِ سایۂ دیوار کب تھا

جمالِ یار کا جادو نہیں تو پھر کیا ہے
چمن چمن جو فروزاں ہیں رنگ وبو کے چراغ

اور بھی تھے اس کی محفل میں باتیں سب کی ہوتی تھیں
سب کی آنکھ بچا کر اس نے ہم کو تنہا دیکھا تھا

چاند گگن میں ایک ہے لیکن عکس ہزاروں پڑتے ہیں

''چہارسُو''

جس کی لگن میں ڈوب گئے ہم ، دریا میں اک سایہ تھا

وہ روئے سادہ جو دیکھا تو یاد بھی نہ رہا
کہ لوگ ہم نے کئی ماہتاب سے دیکھے

لہو کی بوند
حیات آفریں لہو کی بوند
جگر کی آگ
سلگتے ہوئے جگر کی آگ
ڈھلتے اشک
کسی ماں کی مامتا کے چراغ
اجڑتے لٹتے ہوئے دلہنوں کے پیار، سہاگ
کراہیں بوڑھوں کی
بچّوں کی سسکیاں، آہیں
جوان سینوں سے ٹکراتی گولیوں کی پکار
لہو کے چھینٹوں سے رنگین
سرخ سنگینیں
بموں کے دہن
اگلتے ہوئے دھواں اور آگ
مناؤ جشن تو ان کا بھی کچھ خیال کرو
یہ مانا خاک سے گلزار ہو گئے پیدا
کھلے ہیں کو بہ کو غنچے
گلی گلی کلیاں
بہار آئی ہے، دورِ خزاں تمام ہوا (شہر شہر جشن)

اور

گورکنوں نے رکھ دیئے ہیں
بیلچے اور کدالیں
منتظر ہیں۔۔کب کہ جنازے کا
جلوس آئے کہ دفنائیں اسے
ماتمی دستوں کے ساتھ
نوحہ پڑھتے سوز خواں
بچّے
دھنیں غم کی
بجاتے ساز ندے
جنازے کے خصوصی مارچ کے انداز میں
چلتے ہوئے خاموش لوگ
اگلے وقتوں کی بڑی سی
توپ گاڑی کے عقب میں
ارضِ آدم کے سبھی ملکوں کے جھنڈوں سے
سجا
توپ گاڑی پر جنازہ
مجلسِ اقوام کا (جنازہ)

ان کے علاوہ ''سفر'' ''انتہا'' '' اقوامِ متحدہ'' اور چند دوسری نظمیں بھی توجّہ کی مستحق ہیں۔جن سے پتہ چلتا ہے کہ عبداللہ جاوید کی شاعری باطنی سطح پر اپنے قاری کو منفی روّیوں سے آزاد اور نشاطِ غم کی عرفانی تہذیب عطا کرتی ہے جو تزکیۂ نفس اور ارتقائے ابدیت کی الہامی سطح ہے جہاں لفظ محض لفظ نہیں رہتا گنجینۂ معنی کا طلسم بن جاتا ہے۔

عبداللہ جاوید کی شاعری میں کثرت سے بلکہ تکرار کے ساتھ جبر، استحصال اور انسانی جذبوں کی بدلتی شکلیں، طبقاتی، علاقائی مسائل ومظالم اور فکرِ حیات کے حوالے سامنے آتے ہیں۔ان میں ''پھول نظمیں'' خصوصی توجہ کی اس لئے مستحق ہیں کہ ان میں کہانی ،کردار اور کرداروں کا عمل اور ردِّ عمل بھی ابھر کے آتا ہے۔اِن انوکھی نظموں سے چند جیتی جاگتی مثالیں ملاحظہ فرمائیں:۔

پھول حوالہ ہے
تخلیق کی صورت میں
خالق کا اجالا ہے

پھول کو اپنانا
آسان تو ہے پہلے
جاں سے گزر جانا

پھول سے مت کھیلو
پتّی پتّی ہونے کا
دکھ پہلے جھیلو

پھول کے چوکیدار
رنگ و بو پر پہرے وہرے
سب کے سب بے کار

پھول پہ رکھکر پاؤں

جب واجا نے مونچھ مروڑی
رویا سارا گاؤں

عبداللہ جاوید نے طنزیہ لہجے کو اس طرح اپنایا ہے کہ اس میں تلخی اور چراندھ کے دھوئیں کے بجائے ایک طرح زندگی آمیز خلش سی کھٹکتی اور چبھتی رہتی ہے اس کارِ ہنر میں وہ اکبرالہٰ آبادی کے شانہ بہ شانہ نظر آتے ہیں چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔۔۔

ہم تو بندے ہیں، خدا کا بھی تصوّر جاوید
ہر زمانے میں بدل جاتا ہے حالات کے ساتھ

صحرا صحرا، گلشن گلشن ،شبنم کا انجام
چڑھتے سورج کی پوجا میں کس کو رہا ہے یاد

کھا پی کر جب راجا رات جگاتا ہے
اسکی بھوکی پرجا سو ہی جاتی ہے

'' قلوپطرہ '' والی نظم طویل ہے اس لئے نقل سے گریز کر رہا ہوں ۔اس نظم کے لطیف طنزیہ لہجے کو سمجھنے کے لئے نظم کا مطالعہ از بسکہ ضروری ہے۔ملاحظہ ہو صفحہ ۔۱۴۰۔۱۳۶ ۔ (موجِ صدرنگ)

''خواب ساماں ''۔۔۔'' میں گراؤنڈ زیرو'' اور'' خونی ریکھا '' کا بین السطور طنزیہ لہجہ بھی خاصے کی چیز ہے۔ ان دونوں نظموں میں طنز کی کاٹ اور تیزی دیر سے سمجھ میں آتی ہے۔

عبداللہ جاوید اپنے بیٹے اسد جاوید کے پاس شگاگو میں تھے اور میں یہ مضمون لکھ رہا تھا یہ تو میری سمجھ میں آ گیا تھا کہ درویشی و دل ریشی تو انہیں ددھیال اور ننھیال کے حوالے سے ورثہ میں ملی ہے ۔مگر حبِّ اہلبیت کی روشنی کی کرن کہاں سے آئی۔بالآخر میں نے ان سے پوچھ ہی لیا۔بے ساختہ بولے'' یہ برقِ تجلّی کی دین ہے جو خانہء دل میں جوں کعبہ روشن و منوّر رہے'' بات سمجھ میں آ گئی۔۔۔یہی سبب ہے کہ کربلا کا شعری استعارہ طرح طرح سے ان کی شاعری کی زینت بنا ہے۔کہیں اس میں معنوی تہہ نشینی، کہیں رمز و کنایہ کی اثر آفرینی ہے۔۔کہیں اسکا برملا اظہار ہوا ہے۔۔۔کہیں اسنے تاریخی واقعات کی شکل اختیار کر لی ہے۔۔۔۔

آیئے اس کی چند مثالیں بھی ملاحظہ کر لیں:۔۔۔

کربلا میں سر کٹا کر بھی نہ ٹھہرے حسینؑ
تا قیامت بر سرِ نیزہ سفر جاری رہا

اے مصلحت کی پست زمینوں کے باسیو
کتنی بلندیاں ہیں سرِ دار دیکھنا

دستِ ستم کی پیاس لہو سے بجھا گئے
دیوا نے ریگِ زار میں گلشن کھلا گئے

ردائیں پھر سروں سے کھنچ رہی ہیں
زمینِ کربلا چپ چاپ سی ہے

صرف کعبہ پر نہ تھی حجّت تمام
بعدِ کعبہ کربلا ، رکھنی ہی تھی

مضمون تو اختتام کو پہنچا مگر ایک بات اپنی جگہ پھر بھی قائم رہی کہ غزل کی روایت سے شاعر کہاں تک بچ سکتا ہے۔۔۔۔۔ عبداللہ جاوید خود تسلیم کرتے ہیں:۔۔۔

''جس بات کو ہم روایت سے بغاوت کہتے ہیں ،وہ بھی روایت کے پس منظر میں نمو پاتی ہے۔''۔

سو ہم نے ''حصارِ امکاں '' اور ''خواب ساماں ''میں سے روایت سے جڑے چند اشعار نکال ہی لئے۔۔۔۔۔۔محض اس لئے کہ غزل کی روایت سے گریز مشکل ہے۔یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:۔۔۔۔

ہوا ہے عشق تو یہ سلسلے بھی سب ہونگے
کرم عدو کا ،ستم آپ کا، رکے کیسے
اسے بھی وقت کے سیلِ رواں میں بہنا ہے
وہ بے وفا نہ سہی ، با وفا رکے کیسے

ہائے وہ یار کے جانے کا سماں
جوں رگِ جاں میں ہے خنجر موجود

ہمیں مزاج دیا آسماں والوں کا
اور اس مزاج پہ وابستہ زمیں رکھا

کھلا یوں جیسے انگڑائی سی لی ہو
لگا یوں نیند سے جاگا دریچہ

جس کو آپ نے پتّھر سمجھا
وہ تو ایک دھڑکتا دل تھا

جہاں بھی جاؤ گے دیوار ہوگی
کوئی اٹھتی ہوئی تلوار ہوگی

حصارِ امکان

ڈاکٹر الیاس عشقی

(●)

تاریخ نشر۔۲۷ مئی ۲۰۰۳ ۔وقت نشر۔۴ بج کر ۳۰ منٹ

ایسا خیال پڑتا ہے کہ کسی نے کبھی عبداللہ جاوید صاحب کی شاعری کے پہلے مجمو عے ''موجِ صدرنگ'' کو بجا طور پر زندہ جاوید شاعری قرار دیا تھا۔ میں اس میں ترمیم وضاحت سے کرنا چاہتا ہوں کہ ایک زندہ جاوید شاعر کی زندہ جاوید شا عری ہے۔اس لئے کہ شاعری شاعر سے اور شاعر شاعری سے زندہ رہتا اور پہچانا جاتا ہے۔

پہلی رائے میں مبالغہ کا شائبہ ہو تو ہو مگر میری رائے بے لاگ ہے اور پوری ذمہ داری کے ساتھ دی گئی ہے کہ اس کتاب کا ظاہر باطن کا اور باطن ظاہر کا آئینہ دار ہے۔لیکن عروس جمیل کے قامت پر لباس حریر تنگ پڑ گیا ہے۔ کتاب دیدہ زیب اور اس کے مندرجات لطیف اور خیال انگیز ہیں۔

دنیا میں شاعری کی بہت تعریفیں کی گئی ہیں مگر فن کو ئی تعریف قبول نہیں کرتا اور دائرہ امکان کو توڑ کر نکل جاتا ہے۔عبداللہ جاوید صاحب نے بھی بڑے خلوص اور ہنرمندی سے اپنی شاعری اور معاصر ادب کے حوالے سے شا عری کی ایسی تعریف کی ہے جو تعریف معلوم نہیں ہوتی۔انکی تحریر میں جو تازگی اور ابتکار ہے۔اس سے انداز بیان پر ان کی قدرت مافی الضمیر کو صاف اور سنہرے انداز میں بیان کرنے کا سلیقہ اور سادہ الفاظ کی معنویت پر انکی قدرتِ اظہار کا اندازہ ہوتا ہے۔انہوں نے شاعر سے زیادہ پڑھنے والے کے ذوق پر بھروسہ کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ ان کے کلام کا ان سے بہتر تجزیہ اور انتخاب کر سکتا ہے۔یہ بات اپنی شاعری اور اس کے قاری کے متعلق انہوں نے اپنے انداز میں کہی ہے۔شعر کا معاملہ عجیب ہے۔اس سلسلے میں ایک عمر کے غور وخوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شعر پڑھتے ہی اور سنتے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شاعری ہے۔شعر ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔درمیانی کوئی راستہ نہیں ہوتا۔اس سلسلے میں مجھے یہ کہتے ہوئے کوئی تامل نہیں ہے کہ عبداللہ جاوید صاحب کا دوسرا مجموعہ 'حصارِ امکان' اچھی شاعری کی کتاب ہے ان کے کلام کے شاعری ہونے میں تو کوئی کلام نہیں لیکن کتنی بڑی شاعری ہے یہ فیصلہ تو وقت گزرنے کے بعد ہی تا ریخ کرے گی۔ابھی تو شاعر اور اسکی شاعری ہماری آنکھوں کے اتنے قریب ہیں کہ آنکھیں پوری طرح ادراک نہیں کر سکتیں۔کبھی شعر شاعر سے تو کبھی شاعر شعر سے زیادہ بڑا نظر آتا ہے۔یہ فاصلہ دونوں میں توازن پیدا کر دے گا تو حقیقت ابھر کر سامنے آجائیگی۔جہاں تک اس ناچیز کی رائے کا تعلق ہے تاریخ کا فیصلہ ذوق اور عقل کے خلاف نہ ہوگا جدید ترین تنقید نے جس میں بلاشک ایک حد تک فکری صداقت بھی ہے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاعر جب خارجی ماحول سے اثرات اخذ کر کے اپنے شعور اور تحت الشعور کے عمل سے گذر کر اسے ایک بار پھر خارج کے حوالے کرتا ہے تو اس میں ذاتی عنصر سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔شاعر اپنی شاعری سے بالکل بے تعلق کیسے ہوسکتا ہے۔فکر وجذبات کا توازن اس قسم کی تقسیم کو اور اس بے رحم عمل کو برداشت نہیں کر سکتا۔اس مختصر ریڈیائی جائزے میں اس طول کی گنجائش نہ تھی لیکن شاعر نے کچھ ایسے مسائل چھیڑے تھے کہ یہ باتیں ناگزیر معلوم ہوئیں۔اس طول کلام کے بعد اصلی کتاب کے بارے میں گفتگو کا وقت کم رہ جائے گا اور اسکے ساتھ انصاف نہ ہو سکے گا۔

اس دور میں مختصر نظموں کا رواج ضرورت سے زیا دہ ہو گیا ہے۔جس میں دیسی اور بدیسی سانچے سب ہی ہیں۔لیکن یہاں ہمارا موضوع دیسی سانچوں سے متعلق ہے۔ہمارے دور کی مختصر ریزہ چینی کی یہ مثالیں ایسی ہیں جن میں مفہوم کو خوردبین سے تلاش کرنا پڑتا ہے۔اس سلسلے میں عبداللہ جا وید صاحب ایک منفرد فکر کے شاعر ہیں۔ان کی تقریباً سب ہی مختصر نظمیں مرکزی خیال اور فکری عنصر کا ایک توازن پیش کرتی ہیں۔یہہ شاعر کی طبیعت کا توازن ہے جس نے انکی اکثر چھوٹی نظموں کو ایک منفرد مقام دے دیا ہے۔

انہوں نے مشرق اور مغرب کے جس فکری اور تیکنیکی توازن کا ذکر کیا ہے اور مشرقی اقدار کی جس پاسداری کا ذکر کیا ہے وہ بھی ان کی چھوٹی نظموں میں نظر آتی ہے۔چھوٹی نظموں کی بلاغت اور معنویت ایک جہاں معنی رکھتی ہے جو الگ ایک اظہارِ خیال چاہتی ہے۔یہاں کچھ اور مختصر نظموں کا ذکر کرنا ہے انہوں نے بہت طویل نظمیں تو لکھی ہی ہیں لیکن نسبتاً طویل نظمیں بھی مختصر ہی ہیں جن میں بڑے موضوعات کو '' کوزے '' میں بند کیا ہے۔یہ بھی ایک جداگانہ بیان چاہتا ہے اور ہمیں سرِ دست مختصر نظموں سے تعلق ہے۔

''حصارِ امکان'' کو کس خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ایک لمحہ کو بھی گمان نہیں ہوتا کہ' زوالوجی' کی حقیقت بیان کر رہا ہے

سنڈی سے
تتلی کے قالب میں آنا
پھر سنڈی بن جانا
مرجانا
تتلی بن کر اڑ جانا

دیکھئے کس طرح انہوں نے غالب کے دشتِ امکان کو دائرہ امکان میں لا کر ایک فطری حقیقت کو کسی حد تک افشا کیا ہے نظم ''کیسی بلندی کیسی

پستی' ملاحظہ کیجئے۔

پانی
بادل کا
اونچے سے اونچا
جاتا بھی ہے
نیچے سے نیچے
آتا بھی ہے

جو حقیقت ان سادہ لفظوں میں بیان ہوئی ہے حیرت ہے سادہ لفظوں میں کیسے سما گئی۔ اگر آپ کو مایا کا روپ دیکھنا ہو تو اس دشوار فلسفے کو ان سادہ سلیس لفظوں میں دیکھئے۔

صورت کے اندر
صورت گر دیکھوں
باہر سب دھوکا
کیوں باہر دیکھوں

مایا کے مقابلے میں کس خوبصورتی سے وجود کی تصدیق کی گئی ہے۔

مجرد آزادی کے تصور اور اصل صورت حال کے احساس کی نزاکت دیکھئے۔

پنجرے کے باہر بھی
شاید
پنجرہ ہے
باہر کے باہر بھی شاید
پنجرہ ہے

احساس کی اس سطح پر شاعری کم ہوئی ہے۔ جبر و اختیار کے الجھے ہوئے موضوع کو بھی اس انداز سے بیان کیا ہے تعجب ہوتا ہے کہ انہیں ناگزیر الفاظ کس آسانی سے مل جاتے ہیں ؎

دریا میں رہنا بھی ہے
بہنا بھی ہے
پل پل کچھ کرنا بھی ہے
بھرنا بھی ہے
فصلِ غم بونا بھی ہے
ڈھونا بھی ہے
مرنے سے ڈرنا بھی ہے
مرنا بھی ہے

غزل کا انداز بھی نرالا ہے مانوس مگر احساس کی سطح پر بلندی کو چھوتا ہوا

جس سے بھی دل لگا وہ بڑی دیر سے ملا
جو بھی بھلا لگا وہ بڑی دیر سے ملا
فیصلہ تھا نہ مانگوں اس کو
ہاتھ اٹھاتا تو دعا کیا کرتا

اپنی تخلیق کی اکائی میں
ایک ہیں خلق اور خدا دونوں

مانگتے وقت ہوا کیا جاوؔید
کس کی نیّت تھی کسے مانگ لیا

اپنی حسّیت میں جاوید صاحب سب سے جدا ہوتے ہوئے بھی سب کے ہم آواز نظر آتے ہیں۔ یہی ان کا کمال ہے۔

☆

بیادِ بابا بلّھے شاہ

پڑھیں کتابیں، لکھی کتابیں
ڈھیروں نام کمایا

علم و ادب کی تاریخوں میں
اپنا نام لکھایا

کعبہ پہنچا اور کعبے سے
حاجی بَن لوٹ آیا

لیکن اے جاوؔید نہ تو نے
اپنے یار کو پایا

عمر گزاری سولا حاصل
اپنا آپ گنوایا

(عبداللہ جاوید)

''چمکا جو چاندرات کا''

صابر وسیم
(کراچی)

قوموں کی دانش کا اظہار تخلیق کی مختلف صورتوں میں ہوتا ہے جس میں شاعری بھی شامل ہے۔ کہیں شاعری میں موجود دانش تک پہنچنے کے لیے ایک خاص آگہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے لیے منیر صاحب نے کہا تھا کہ:

آگہی ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ

اور غالب ''اندیشہ ہائے دور دراز'' میں مبتلا ہو جاتا ہے جبکہ اقبال اس کی تفہیم ''نظر'' سے کرتے ہیں۔

فرد کے پاس خنجر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

شاعری کے لیے اتنی مشکل تمہید اس لیے باندھی ہے کہ یہاں مجھے عبداللہ جاوید کی شاعری پر بات کرنی ہے۔ عبداللہ جاوید کا شمار ان شاعروں میں ہوتا ہے کہ جو ظاہر اور باطن کو دیکھنے کے لیے ایک خاص نگاہ رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے شاعری کھیل تماشا نہیں ہوتی بلکہ وجود کے نفی اور اثبات کے سوال کا ایک پیچیدہ مسئلہ ہوتا ہے۔ جس کا جواب تلاش کرنے میں ساری عمر گزر جاتی ہے پھر بھی تشفی نہیں ہو پاتی۔ ایسے لوگ شعور سے دور، ناموری اور شہرت سے ماورا، گوشہ گیر اور اپنی ہی تخلیق کردہ دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ شاید یہاں ''مگن'' کا لفظ بھی درست نہیں ہے۔ بلکہ یہ لوگ اپنی دنیا مین گم رہتے ہیں۔ میرے ایک بزرگ دوست انیس فروغ مرحوم کہا کرتے تھے کہ شعر تخلیق کے بعد کہیں کاغذ پر چھپ جانے اور دوسروں تک پہنچ جائے۔ اسے سنانا نہ پڑے تو زیادہ اچھا ہو۔ یعنی

میں کچھ نہ کہوں اور یہ چاہوں کہ تیرا شعر
خوشبو کی طرح اُڑ کے ترے دل میں اتر جائے

عبداللہ جاوید ایسے ہی شاعر ہیں کہ جن کے اشعار خوشبو کی طرح اُڑ کر ہمارے دلوں میں اُتر جاتے ہیں۔ شعر وادب سے وابستگی کے ابتدائی زمانے میں ہم اچھا شعر کہیں سنتے یا پڑھتے تھے تو اُسے دوسروں کو سنا کر خوش ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں یہ شعر ہماری سماعت تک پہنچا جس میں ایک سائنٹیفک حقیقت کو شاعری بنا دیا گیا تھا۔ لیجیے آپ بھی پہلے یہ شعر سنیئے۔

چمکا جو چاندرات کا چہرہ نکھر گیا
مانگے کا نور بھی تو بڑا کام کر گیا

جب اس شعر کے خالق کے بارے میں تجسس ہوا تو نام عبداللہ جاوید سامنے آیا۔ بلکہ یہ پوری غزل بھی پڑھنے کو مل گئی جس کے تمام اشعار ندرت اور آب وتاب میں رائج الوقت شاعری میں مختلف تھے۔ خاص طور سے اس شعر نے بہت متاثر کیا۔ آپ بھی یہ شعر سنیں۔

گھر ہی نہیں رہا سلامت بتائیں کیا
غالب کے بعد سیلِ بلا کس کے گھر گیا

لیکن اُس زمانے میں عبداللہ جاوید صاحب ادب کے منظر سے غائب ہو گئے ان کے پہلے شعری مجموعے ''موجِ صد رنگ'' تک رسائی نہ ہو سکی۔ اتنا ضرور معلوم ہوا کہ یہ شاعر اندرونِ سندھ شہر خیر پور میں رہتے ہیں۔ بہر حال نام ذہن میں ثبت ہو گیا۔ طویل وقفے کے بعد جب ''فنون'' اور ''سیپ'' میں ان کی شاعری دوبارہ چھپنے لگی تو ہم نے کبھی اس سے غفلت نہیں برتی۔ ویسے بھی اچھا اور سچا شاعر سفر کرتا ہے اور بہت دور تک جاتا ہے۔ عبداللہ جاوید کی شاعری میں وہ عوامل موجود تھے کہ جو دوسروں تک پہنچ جاتے تھے۔ ان کی گوشہ گیری شعر کے سفر میں کبھی حائل نہیں ہوئی۔ خود ان کا شعر ہے۔

تاثیر شعر لفظوں کی بازی گری نہیں
دل میں خلوص ہو تو زباں میں اثر رہے

عبداللہ جاوید صاحب کی شاعری میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جنہیں اچھی اور اعلیٰ شاعری کے لیے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اُن کے وسیع مطالعے نے اس شاعری کو بامعنی بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ویسے تو قدرتِ کلام اور زبان وبیان پر ان کی گرفت مضبوط ہے مگر اس کے ساتھ وہ ''دہن بیدار'' بھی رکھتے ہیں جو ذرّے کو آفتاب بنا دیتا ہے۔

ذرّہ بھی آفتاب سے کم تر نہیں یہاں
یارو مگر بہ دیدہ بیدار دیکھنا

اس ''دیدہ بیدار'' سے ہی ان کی شاعری کو اپنے عصر سے جوڑ کے اُس کے ترجمان کا کردار ادا کیا ہے۔ اچھی شاعری کا یہ بھی وصف ہے کہ وہ اپنے عہد کا آئین ہوتی ہے۔ ادب وآرٹ سیر وتفریح کی چیز نہیں، اس میں زندگی کے وہ تمام مسائل جھلکتے ہیں جن سے انسان روز وشب برسرِ پیکار رہتا ہے۔ یقیناً شاعری نسخہ کیمیا نہیں ہوتی۔ اس میں زندگی گزارنے کے اصول وضوابط طے نہیں کیے جاتے اور نہ ہی کسی معاشرے کی تشکیل کے قوانین شاعری مرتب کرتی ہے۔ مگر وہ اپنے عہد کو درپیش مسائل ضرور سامنے لاتی ہے پند ونصائح کی صورت میں نہیں بلکہ اشاروں اور کنایوں کے ساتھ اجتماعی زندگی کی اخلاقیات اس سے مترشح ہوتی ہے۔

باقی صفحہ ۱۴ پر ملاحظہ فرمایئے

''بھاگتے لمحے''

اے خیام
(کراچی)

اگر پاک و ہند کے علاوہ اردو کی دوسری بستیوں کی طرف توجہ کی جائے جہاں اردو زبان وادب کی ترویج اور تسلسل کا عمل جاری ہے تو کینیڈا کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا وہاں ایسے لکھنے والے تو موجود ہیں ہی جنہوں نے پاک و ہند میں لکھنے کی ابتدا کی تھی اور پھر کینیڈا کو اپنا مستقل مستقر بنالیا اور ایسے لکھنے والے بھی ملیں گے جنہوں نے وہیں لکھنے کا آغاز کیا اور خاصے معروف ہوئے۔

اس وقت عبداللہ جوویدکے افسانوں کا مجموعہ'' بھاگتے لمحے '' میرے زیرِ مطالعہ ہے۔عبداللہ جاوید خاصے سینیئر لکھنے والے ہیں ۔ سنہ ۴۰ کی دہائی میں انہوں نے لکھنے کا آغاز کیا۔ بچوں کے لئے کہانیاں لکھیں، شاعری کی، خاکے لکھے، کالم نویسی کی، اور تنقیدی وادبی مضامین بھی لکھے۔ بہت سی کتابیں شائع ہوئیں اور بہت سی زیرِ ترتیب اور اشاعت کی منتظر ہیں۔ اردو کے ساتھ انگریزی زبان میں یکساں قدرت رکھتے ہیں ۔اس لئے انہوں نے دونوں زبانوں میں شاعری کی اور دونوں زبانوں میں افسانے بھی لکھے۔ شاعری کے تو ان کے کئی مجموعے شائع ہوئے اور ایک مجموعہ ''موجِ صد رنگ '' کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔لیکن افسانوں کا ایک ہی مجموعہ ''بھاگتے لمحے'' ۲۰۱۰ میں شائع ہوا۔

عبداللہ جاوید کا اصلی نام محمد عبداللہ خاں جاوید ہے۔ پہلے انہوں نے جاوید یوسف زئی کے نام سے قلمی نام اختیار کیا اور معروف رسالوں میں ان کے افسانے اسی نام سے شائع ہوتے رہے ۔یہ سلسلہ تقریباً بیس سال تک چلتا رہا۔ پھر انہوں نے اس قلمی نام کو ترک کر دیا اور عبداللہ جاوید کے نام سے لکھنے لگے۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ہے 'بھاگتے لمحے' عبداللہ جاوید کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے ۔اس مجموعے میں ان افسانوں کو جگہ نہ مل سکی جو جاوید یوسف زئی کے نام سے لکھے گئے تھے۔قاری کو کو اس کا اندازہ کرنا مشکل ہوگا کہ ان کا ارتقائی سفر کیسا رہا۔ آغاز میں انہوں نے کس طرح کے افسانے لکھے اور اب جس طرح کے افسانے لکھ رہے ہیں تو یہ ان افسانوں کا ہی تسلسل ہے یا ان موضوعات اور اسلوب سے انحراف ہے۔ یہ مجموعہ ان کے افسانوں کا انتخاب ہے جسمیں ضروری تھا کہ انکے کچھ افسانے ابتدائی دور کے بھی شامل کئے جاتے۔

اس مجموعے میں ان کے بیس منتخب افسانے شامل ہیں ۔ کچھ افسانے طویل ہیں اور کچھ مختصر۔ ہر افسانہ اپنے لئے خود سانچہ متعین کرتا ہے۔کئی افسانے ایسے ہیں جو خود کلامی کے انداز میں لکھے گئے ہیں ۔یا ان کو بیان کرنے والا واحد متکلم کے صیغے میں موجود ہے۔ان افسانوں کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ عبداللہ جاوید ایک مختلف اور بڑے ویژن کے مالک ہیں۔منفرد ہونا کوئی بڑی خوبی نہیں ہوتی۔لیکن اس میں ایک نیا زاویہ، بڑا وژن، مختلف اسلوب بیان در آئے تو انفرادیت اہمیت اختیار کر جاتی ہے۔عبداللہ جاوید کے افسانوں میں ایک نیا ڈائقہ ملتا ہے۔اور ہر موضوع کے لئے وہ اپنا ایک زاویہءنظر رکھتے ہیں۔ یہاں ان کے تمام بیس افسانوں کا جائزہ لینا تو مشکل ہوگا جبکہ سب افسانے کسی نہ کسی لحاظ سے اہم ضرور ہیں۔

اس مجموعے کا پہلا افسانہ ''دخترِ آب '' ہے جس میں بڑا بے باک اور فطری لہجہ اختیار کیا ہے آخر کے چند جملے قاری کو جھٹکا نہیں دیتے بلکہ ایسی جگہ لے جاتے ہیں جہاں اسے بہت سے سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کی یہ خوبی تقریباً ہر افسانے میں موجود ہے۔جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے ۔اسے نئے وژن سے دوچار کرتے ہیں۔اور نئے اسلوب سے متعارف کراتے ہیں۔اسلوب تو زیادہ تر بیانیہ ہی ہے اور کسی کسی افسانے میں یہ طوالت بھی اختیار کر گیا ہے جو قدرے گراں گزرتا ہے۔لیکن شاید افسانہ نگار اپنی پوری بات اسی طرح کہہ سکتا ہے۔

''ہونے کا درخت ''ایسا افسانہ ہے جس پر ممکن ہے '' انشائیہ '' کی چھاپ لگے لیکن اصل میں یہ Stream of consciousness کی تکنیک میں لکھے جانے والے افسانے کی بڑی اچھی مثال ہے ۔اس میں ایک ایسا بہاؤ اور ایسی لہر ہے جو قاری کو اپنے ساتھ لئے پھرتی ہے۔

''دسواں مکان ''نسبتاً ایک مختصر افسانہ ہے جس کے آخر کے چند جملے بڑی خوشگوار کیفیت سے دوچار کرتے ہیں۔ ''میری بیوی ''میں پھر ایک بار افسانہ نگار کا وژن کھل کر سامنے آتا ہے۔وہی بے باک بیانیہ، وہی بولڈ جملے جو مجموعے کے پہلے افسانے '' دخترِ آب '' میں نظر آیا تھا۔

اس تبصرے میں مجموعے کے تمام افسانوں کا ذکر اور ان کا تجزیہ تو ممکن نہیں لیکن اتنی بات تو پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ عبداللہ جاوید کا قلم نہ صرف یہ کہ ابھی تک تھکا نہیں بلکہ نت نئے Dimentions تلاش کرتا ہوا نظر آتا ہے۔اور کئی افسانوں میں ایسی مثالیں نظر آتی ہیں جن کو بنیاد بنا کر کہا جا سکتا ہے کہ اردو افسانے کے فن کی وسعت کے لئے ابھی بڑی گنجائش موجود ہے۔

☆

عبداللہ جاوید کے افسانے

مبین مرزا
(کراچی)

عبداللہ جاوید صاحب سے میری ملاقات تو بے شک حالیہ برسوں کا واقعہ ہے لیکن اُن سے تعارف خاصا پرانا ہے۔ اور وجہ تعارف تھی اُن کی شاعری۔ میں نے اسّی کی دہائی کے اوائل میں اُن کا کلام سب سے پہلے ''فنون'' میں پڑھا اور اُن کے سنجیدہ تخلیقی رویّے کو ان کی شاعری میں ایک قدر کے طور پر محسوس کر کے مجھے خوشی ہوئی تھی۔ اس کے بعد اگر کہیں ان کے نام پر نگاہ پڑی تو میں نے یک گونہ دلچسپی سے اُن کے کلام کا مطالعہ کیا اور مسرّت حاصل کی۔ یہی نہیں اس عرصے میں کئی بار ثقہ اور متین لوگوں سے ان کی شاعری کا ذکر ہوا اور اچھے لفظوں میں ہوا۔ چنانچہ چند برس قبل جب اُن سے بالمشافہ رسم و رہِ محبت کا آغاز ہوا تو اُن سے دیرینہ شناسائی سے بھی مذکور رہی اور وجہ شناسائی بھی۔ لیکن ان سے ملاقاتوں کے بعد اب میں سوچتا ہوں کہ اس سے پہلے میں عبداللہ جاوید صاحب سے اپنے جس تعارف کو بڑی چیز سمجھتا تھا، وہ کس قدر واجبی سا تھا۔

اصل میں ہوتا یہ ہے کہ ہماری توجہ آدمی کے کسی ایک پہلو یا اس کی شخصیت کے کسی ایک رُخ پر مرکوز ہو جاتی ہے اور پھر ہم اُس کی بابت جو کچھ جانتے اور سوچتے ہیں وہ سب اسی ایک زاویے کا نظارا ہوتا ہے۔ جب کہ امرِ واقعہ میں آدمی ہشت پہلو ہوتا ہے۔ اور ان میں ہر ہر پہلو اپنی جگہ جامع ہوتا ہے اور دوسرے کا تکملہ بھی۔ دیکھیے میں یہ کیا بات لے بیٹھا جب کہ اس وقت مجھے بس دو اڑھائی فقرے عبداللہ جاوید صاحب کے افسانوں کی بابت کہنے ہیں، شخصیت کی عقدہ کشائی مقصود نہیں۔ لیکن خیر، ہماری یہ سب باتیں کچھ ایسی بے مقصد بھی نہیں ہیں۔ کسی تخلیق کار کا کام خواہ وہ کسی بھی صنفِ اظہار و بیاں میں ہو، اس کی ذات سے لاتعلق تو بہرحال نہیں ہوتا۔ عبداللہ جاوید صاحب کی شاعری کے حوالے سے بات کا آغاز ہوا تھا تو میں عرض کروں کہ ان کی بعض نظمیں پڑھتے ہوئے ہی نہیں بلکہ غزلوں کے بعض اشعار سے بھی مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان میں پوری ایک کہانی یا کوئی ایک مکمل واقعہ سا سما گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت میں نے عبداللہ جاوید کا کوئی افسانہ پڑھا تھا اور نہ ہی میں یہ جانتا تھا کہ وہ افسانے بھی لکھتے ہیں۔ ان کے افسانے تو میں نے اب آ کر پڑھے ہیں۔ تو دیکھیے یہ وہی بات نہیں ہے کہ تخلیقی شخصیت کا ہر پہلو اپنی ایک انفرادی حیثیت بھی رکھتا ہے اور دوسرے کا تکملہ بھی بنتا ہے۔ اسی طرح ایک جامع تخلیقی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔

تو اب جو افسانے پڑھے تو ان سے نہ صرف عبداللہ جاوید صاحب کی فنکاری کا ایک نیا رُخ سامنے آیا بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی مجموعی تخلیقی شخصیت کو بھی قدرے وسیع تناظر میں دیکھنے اور ان کے فن کارانہ سروکار کو سمجھنے کا موقع ملا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ جو ایک تاثر میں نے ابتداً اُن کے فن کارانہ مزاج کی بابت لیا تھا کہ وہ ایک سنجیدہ رویے کے تخلیق کار ہیں تو وہ مزید مستحکم ہوا۔ اب آگے بڑھنے سے قبل یہ بہتر ہوگا کہ ہم پہلے یہ جان لیں، سنجیدہ رویّے سے آخر کیا مراد ہے؟ تو یوں ہے کہ میری ناچیز رائے میں فلسفیانہ اندازِ فکر، دانش ورانہ طرزِ اظہار اور دقیق عالمانہ اسلوبِ بیان وغیرہ تخلیقی فن کار کے رویّے کی سنجیدگی کے لیے خاص ضروری نہیں ہیں بلکہ اگر بُرا نہ مانا جائے تو مجھے یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ یہ خصائص تو ایک حد تک اس کے سنجیدہ روّیے کے لیے ضرر رساں ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ایسی سب چیزیں ناقدین اور تجزیہ نگاروں وغیرہ کے مطلب کی تو ہوا کرتی ہیں مگر اپنی طبعی شکل میں یہ تخلیق کار کے لیے کچھ ایسی مفید مطلب نہیں ہوتیں۔ گریفائٹ اپنی ابتدائی شکل میں جوہری کے کام کا نہیں ہوتا، وہ تو اسے اپنے لیے اس وقت استعمال کرتا ہے جب وہ ہزاروں درجے سینٹی گریڈ حدّت کے عمل سے گزر کر منقلب ہو جاتا ہے۔ تب اُس کے خواص بھی بدل جاتے ہیں اور اثرات بھی۔ تخلیقی پیرایے میں اظہار پانے والے علم و فلسفہ کی ماہیت بھی اس طرح بدل جاتی ہے۔ تب اُن کے اثرات صرف دماغ تک محدود نہیں رہتے بلکہ دل تک پہنچتے ہیں۔ اور پھر وہ شعر و افسانہ کی آرائش کا کام نہیں کرتے اس کی قوت بن جاتے ہیں۔ تو فن کارانہ روّیے کی سنجیدگی سے مراد ہے مادّی اشیاء کی غیر مادّی سطح پر اُس تفہیم کی جستجو جو بیک وقت شعور و احساس کی جہتوں کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ روّیہ اصل میں فن کو زندگی بنا لینے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور عبداللہ جاوید کے فن خواہ وہ شاعری ہو یا افسانہ ہمیں اسی روّیے کا نشان ملتا ہے۔

بات طول کھینچے گی اور یہ طوالت کا محل ہے اور نہ ہی میں اس وقت اس کا متحمل ہو سکتا ہوں ورنہ اس بات کی تشریح اور استناد کے لیے عبداللہ جاوید کے اشعار، نظموں کے ٹکڑے اور افسانوں کے اقتباسات سے یہاں پورا پورا کام لیا جا سکتا تھا۔ افسوس کہ نہ تو مجھے یہ کام آتا ہے اور نہ ہی اچھا لگتا ہے۔ یوں بھی مدرّسی سے مجھے کوئی علاقہ نہیں اور یہ ہنر عام طور سے مدرّس نقّادوں ہی کو آتا ہے کہ وہ اپنے ہر قاری کو کمرۂ جماعت میں بیٹھا ہوا طالبِ علم سمجھ کر خلاصہ کاری کا نسخہ اس کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ میرے لیے تو یہی موزوں ہوگا کہ عبداللہ جاوید نے اپنے افسانوں میں جن موضوعات اور مسائل سے سروکار رکھا ہے میں انہی کی بابت اپنے کچھ تاثرات عرض کروں۔

تو عبداللہ جاوید کے افسانوں کو پڑھ کر جو سب سے پہلی بات مجھے محسوس ہوئی وہ یہ ہے کہ یہ سب افسانے بالکل الگ ہیں۔ ان میں چھیڑے گئے

موضوعات، اٹھائے گئے سوالات اور بیان کیے گئے نکات سب کچھ ایک دوسرے سے الگ ہے۔ کرداروں میں ایسی کوئی مماثلت نظر نہیں آتی کہ ایک افسانے کا کوئی کردار کسی دوسرے افسانے کے کسی کردار کی یاد دلائے یا تسلسل محسوس ہو یا پھر کسی کے مزاج کا رنگ کہیں اور چھلکتا نظر آئے۔ کسی کے لہجے پر کسی دوسرے کی چھاپ دکھائی دے۔ غرض یہاں جو کچھ ہے اُسے ہم تنوع یا رنگا رنگی کا ہی نام دے سکتے ہیں۔ ان کے جتنے افسانے میری نظر سے گزرے ہیں، ان کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے یہاں رنگا رنگ اور پُر تنوع صورتِ حال ہمیں نظر آتی ہے۔ اچھا تو اب اس کی داد یہ ہو سکتی ہے کہ اُن کا افسانوی منظر نامہ بہت وسیع ہے یا یہ کہ کینوس بڑا یا لمبا یا چوڑا وغیرہ ہے۔ ظاہر ہے اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ یہ بھی ایک بات تو ہے اور اس کی بھی داد افسانہ نگار کو ملنی چاہیے۔

تاہم کیا کسی فنکار کی فکری وفنی حیثیت محض اس نکتے کی بنیاد پر مسلّمہ ہو سکتی ہے کہ اس کے یہاں کینوس بہت وسیع ہے یا یہ کہ اُس نے بہت سے موضوعات کو چھوا ہے یا پھر یہ کہ اُس کے یہاں زندگی کے بارہ، بیس یا پچاس رنگ سمٹ آئے ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ صرف و محض اس بنیاد پر کسی فنکار کے اصل منصب کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ دیکھنے کی جو بات ہے وہ تو یہ ہے کہ یہ سارے رنگ مل کر کیا شے بناتے ہیں۔ یعنی دو جمع چار ضرب پانچ تقسیم چھ۔۔۔ ان سب کا حاصل کیا نکلا؟ اصل میں یہ جو حاصل ہوتا ہے، یہ فنکار کے فن کی وحدت یا کلّیت کو بیان کرتا ہے۔ گویا وسعت یا لمبائی چوڑائی کے کوئی معنی نہیں اگر ان کے ساتھ گہرائی بھی ہمارے سامنے نہ آ رہی ہو۔ رنگا رنگی کی داد یہ نہیں کہ فنکار نے آپ کی آنکھوں میں قوسِ قزح بھر دی بلکہ بات تو یہ ہے کہ ان رنگوں نے مل کر اُس رنگ کو آپ کے اندر جگایا کہ نہیں جو ظاہراً آنکھوں کے آگے موجود نہیں تھا۔ یہی وہ شے ہے جو فن کی دلیل بھی ہے اور اُس کا جواز بھی۔

عبداللہ جاوید کے افسانوں میں ''میری بیوی'' کو پڑھتے ہوئے میاں اور بیوی دونوں کے کردار اور اُن کی الگ الگ دنیائیں جب ہمارے سامنے آتی ہیں تو ہم صرف اُن کے تضاد، ٹکراؤ اور تصادم ہی کو نہیں دیکھتے بلکہ وہ نکتہ ہماری نظر میں آ جاتا ہے جہاں ہم انھیں باہم ہوتے، آپس میں ملتے اور ایک دوسرے کو Compliment کرتے ہوئے زندگی کے کُل میں ڈھلتے دیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح ''اللہ میاں'' نام کے افسانے میں باپ، سماج اور بچے کا کردار ہے۔ یا پھر ''جہان دیگر کے راستے پر'' بوڑھا اور دو ماہ کی بچی کا کردار ہے۔ ان سب کے روّیے، حالات، ان کو درپیش الگ الگ حالات اور متفرق بلکہ بسا اوقات قطعی متضاد حقائق، ان کے اپنے اپنے دائرے میں زندگی کا تجربہ اور احساس کی نوعیت وغیرہ پر ہم غور کرتے ہیں تو یہ سب آپس میں متصادم نظر آتے ہیں، ایک ٹکراؤ کی سی کیفیت دکھائی دیتی ہے جیسے باہم درآویزاں لکیریں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوں۔ یہی تو سوچنے کی بات ہے کہ عبداللہ جاوید کے افسانوں میں کرداروں، حالات اور حقائق کی یہ لکیریں کیا صرف ایک دوسرے کو کاٹ کر یا ایک دوسرے سے کٹ کر رہ جاتی ہیں یا کہیں پہنچتی بھی ہیں؟ اور اگر پہنچتی ہیں تو یکسر متضاد سمتوں میں یا اس کٹاؤ کے عمل کے بعد کوئی ایک رُخ وہ مل کر اختیار کر لیتی ہیں؟ اپنے افسانوں میں عبداللہ جاوید نے اسی سوال کو جاننے اور اس کے جواب کو پانے کی جستجو کی ہے۔ کچھ ایسی ہی صورتحال ان کے کامیاب ترین افسانے ''وجود'' میں دکھائی دیتی ہے جس میں ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی لکیریں، کاٹنے کے ساتھ ساتھ کسی خاص سمت کی جانب بڑھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

اصل میں ادب انسانی زندگی کے جس تجربے کو معرضِ وجود میں لاتا ہے وہ بظاہر کتنا ہی سادہ نظر آئے بباطن وہ سادہ یا اکہرا نہیں پیچیدہ اور تہ دار ہوتا ہے۔ یہ فن کی بلندی اور فنکار کی ہنرمندی ہے کہ وہ اُسے پیش کرتے ہوئے چیستان بنانے کی بجائے حقیقتِ معلومہ کی سطح پر اور روزمرہ محاورے میں بیان کر دے۔ اس کے لیے اُسے کبھی تو نقطے کو پھیلا کر دائرہ بنانا پڑتا ہے اور کبھی پھیلے ہوئے دائرے کو نقطے میں سمیٹ کر دکھانا ہوتا ہے۔ یہ فن کے تقاضے کا معاملہ ہے۔ عبداللہ جاوید فن اور اُس کے تقاضوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ادب کی مختلف اصناف میں جس قرینے سے انھوں نے اظہار کیا ہے اُن کے پیشِ نظر یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ انہیں ان تقاضوں کو بخوبی پورا کرنا آتا ہے۔

افسانے پڑھ کر مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ اپنے مغربی کرداروں اور اُن کی زندگی اور سماج کے حوالوں اور سوالوں کو موضوعِ اظہار بنانے کے باوجود عبداللہ جاوید کے افسانے ہمارے افسانوی مزاج سے مغائرت کا رشتہ نہیں رکھتے۔ ان کے فن کے اگر کچھ الگ اور مخصوص نشانات ہیں تو اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اردو افسانے کی فکری وفنی فضا سے بھی مربوط ہیں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ انھوں نے بعض کردار بے شک مغربی دُنیا سے لیے ہیں یا بعض مسائل اور موضوعات ان کے یہاں ضرور مغرب سے آئے ہیں لیکن ان کے بیان میں عبداللہ جاوید کی توجہ ہر دو صورتوں میں اُس انسانی احساس پر رہی ہے جو زمینوں اور زمانوں کی مغائرت کا اسیر نہیں ہوتا ہے۔ یہ احساس دراصل انسانوں کو بانٹ کر نہیں بلکہ انہیں جوڑ کر ہمارے سامنے لاتا ہے۔ یہ کچھ وہی بات ہے جس کی طرف اوراقِ گزشتہ میں اشارہ کیا تھا کہ سارے رنگوں کو ملا کر ایک نیا رنگ بنانا۔

اب یہ سوال کرنا کہ عبداللہ جاوید صاحب نے افسانے کم کیوں لکھے؟ یا جو لکھے بھی سہی ان کی طرف ایسی بے نیازی کا انداز کیوں اختیار کیا کہ وہ اُس طور منظرِ عام پر نہ آ سکے جس طرح انہیں آنا چاہیے تھا۔۔۔ اور پھر اس طرح کی گفتگو کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ انھوں نے اپنے تخلیقی جوہر کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے یا یہ کہ اردو ادب کے ساتھ بڑی زیادتی کے مرتکب ہوئے ہیں کہ اپنی نگارشات کو جو ادبِ عالیہ کے شہ پارے ہیں، منظرِ عام پر نہیں لائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی باتوں کے کوئی معنی نہیں ہوتے تھے۔ اگر کبھی ان باتوں کے کوئی معنی تھے بھی سہی تو آج بہرحال نہیں ہیں، کیوں کہ ایسی باتیں ہمارے یہاں ان لوگوں کے بارے میں بھی کہی جا چکی ہیں جن کا لکھنا یا نہ لکھنا برابر

باقی صفحہ ۱۴ پر ملاحظہ فرمائیے

''چاند کمھلا گیا''

(جناب عبداللہ جاوید کے نظمیہ کلام سے مختصر انتخاب)

فیصل عظیم (کینیڈا)

اک سکوتِ خواب آسا

اک سکوتِ خواب آسا
زیست کا سہارا ہے
دل کے گہرے کنویں میں
کنکری نہیں ڈالو
موجیں جاگ جائیں گی
دائرے سے ابھریں گے
خواب ٹوٹ جائے گا

○

چاند

چاند کو گھورتے گھورتے بجھ گئی
آنکھ کی جوت بھی
ہر نئی رات کی کوکھ سے
اک نیا روپ
پیدا ہوا۔۔۔۔مر گیا!
کالی راتیں بھی خالی نہ تھیں چاند سے
روشنی
شب کے زنداں میں محبوس تھی

دل نے ہر شام جس کا سواگت کیا
پو کے پھٹتے ہی وہ چاند کمھلا گیا

○

قلوپطرہ۔۔۔اقتباس

وقت کے سیل سے
خوابوں کے جزیرے ابھرے
ہر جزیرے میں نئے شہر کی بنیاد پڑی
ہر نیا شہر بنا
مصر کا تازہ بہروپ
اپنی قسمت کہ ہمیں کوئی زلیخا نہ ملی
ورنہ بازار میں بکنے سے بھی کچھ آر نہ تھا

لوگ کہتے ہیں کہ پتھر سے تراشو اصنام
ہم نے جو بت بھی تراشا
قلوپطرہ میں ڈھلا!
ہم نے جب دل کو ٹٹولا
خلشِ دل کا سبب
پھول کی پتی کی صورت کوئی کانٹا نکلا
حسن کو ہم نے سدا شعلہ بداماں دیکھا
ایک اک جلوے کو مشتاقِ شہیداں پایا

حسنِ قاتل کا فسوں
جس کے ہزاروں بہروپ
اک قلوپطرہ نے کیا کیا نہیں قالب بدلے
ہر زمانے میں نیا روپ، نیا نام رہا
ہم پہ بھی گزری جو اوروں پہ کبھی گزری تھی
حال پوچھو نہیں
سوچو نہیں
''کیا تھے، کیا ہیں''!
دوستو!
تم نے قلوپطرہ کو دیکھا ہے کبھی
مارک انطونی کے لب
آج بھی ہیں نوحہ کناں
اس کی آواز سے اب تک ہیں فضائیں معمور
آج بھی سوچتا ہے جیسے وہ خود اپنا مآل
''دیکھنے دو، مجھے، کیا حال ہے باطن کا مرے
اب بھی کچھ باقی ہیں کیا میری انا کے آثار''

گراؤنڈ زیرو

گراؤنڈ زیرو، پہ اس برس بھی
شمع جلا کر
اداس دل
ملول چہرہ
خموش گریہ بھری نگاہیں
لئے
کھڑا رہ گیا ہوں
تنہا
میں دو منٹ تک

گراؤنڈ زیرو، پہ
مرنے والوں سے معذرت کی
تمام نوعِ بشر کی جانب سے
تعزیت
''اے میرے پیارو
اے میرے معصوم مرنے والو
گراؤنڈ زیرو کرانے والے
کہا یہ جاتا ہے
خود۔۔بشر تھے
یہی سبب ہے کہ ساری نوعِ بشر
کی آنکھیں
جھکی ہوئی ہیں ندامتوں سے
ضمیر چپ ہیں
ملامتوں سے

گراؤنڈ زیرو کرانے والے
اے کاش
ہم سے بشر نہ ہوتے
یا
ہم کوئی اور جنس ہوتے
بشر نہ ہوتے!!''

میں

مرے وجود میں
شامل ہے کائنات تمام
سیاہی شبِ تاریک ہو کہ نورِ سحر
گہر ہو، خاک کا ذرہ ہو یا کہ قطرہ آب
گل وثمر ہوں کہ ہوں
مہر وماہ وسیارے
چمن ہوں یا کہ بیاباں ہوں
شہر وصحرا ہوں

کسی نے کہہ دیا 'ہو جاؤ'!
ہو گئے ہم سب
وہ لفظ کُن، جو ہے تخلیقِ کائنات کا راز
اس ایک لفظ سے
ہم سب کا ربط یکساں ہے

یہ کارگاہِ زمان ومکان وبود ونبود
یہاں حیات ہے
پابندِ گردش دائم
ہر ایک شے کسی محور پہ
گھومتی ہے سدا
ازل سے تا بہ ابد
زندگی کی راہوں میں
ہر ایک شے کو عطا ہوتے ہیں
کئی بہروپ
شہابِ ثاقب وانجم میں
فرق ہی کیا ہے
جو آج پھول ہے کل مشتِ خاک بھی ہوگا

سروائیول

بدلتے موسموں کے ساتھ
ہی
حلیے بدلتے ہیں
شجر
خزاں پہلے تو ہولی کھیلتی ہے
پتے، پتے سے
شجر
صد رنگ پوشاکیں پہن کر
رقص کرتے ہیں
ہوا
مستی لٹاتی
ناچتی ہے اور نچاتی ہے
شجر
انجام سے کچھ بے خبر،
کچھ باخبر
ہوا کے دوست بن کر
رقص کرتے ہیں
ہوا جب
جھومتی شاخوں کے سر سے
کھینچ لیتی ہے
ردائیں
قبائے برگ و گل
اک اک شجر کی،
پتّا پتّا
پتّی پتّی
جب اترتی ہے
شجر
بے پیرہن
اور بے حیا،
زمیں بستہ
بڑے لاچار لگتے ہیں
برہنہ
سر سے پا تک،
سرد یخ بستہ
ہواؤں کے تھپیڑے
سہنے والے
ہر شجر کو
خواب دیتا ہے
وہی
جو زندہ رہنے کو
کئی اسباب دیتا ہے
شجر کو، آپ کو، ہم کو،
ہوا والوں،
زمین و آب والوں کو۔
وہ جن کو زندہ رکھنا چاہتا ہے
جہاں بھی ہو
وہی تو خواب دیتا ہے
آنے والے اچھے موسم کے
شجر کو

کبھی تو برف رُت
چاندی کے گہنوں سے
سجاتی ہے
برہنہ ڈالیوں کو، چاؤ سے
دلہن بناتی ہے

خزاں کی چیرہ دستی
موسمِ سرما کی یخ سردی
بھی اک دن
بھولی بسری بات ہوجاتی ہے
زمیں
انگڑائی لے کر
سبز مخمل اوڑھ لیتی ہے
نئے کپڑے پہن کر
پیڑ، پودے
رقص کرتے ہیں

ہوا
پھولوں کو چٹکاتی ہے
اور پتوں کو چمکا کر
شجر
اک اک شجر کو
شان سے
جینا سکھاتی ہے۔!!!

○

لب بستگی

حسن قاتل کا فسوں نا م کا پابند نہیں
پھول کانٹے میں بدل جائے تو کانٹا ہے نہ پھول
ہم سے مت پوچھو ہمارے ستم ایجاد کا نام
ہر نئے لمحے نیا روپ ہے جس کا معمول

کارمن، زہرہ ، ہیلن ، اور ڈلا ئیلا کیا ہیں
حسنِ قاتل کے ہزاروں نہیں لاکھوں بہروپ
اک قلوپطرہ کو سو نام زمانے نے دیئے
نت نئے سانچوں میں ڈھلتا رہا اس کا بہروپ

پھول نظمیں

پھول حوالہ ہے
تخلیق کی صورت میں
خالق کا اجالا ہے

○

پھول کے درشن کو
جانا ہو تو اُجلا رکھنا
اپنے تن من دھن کو

○

پھول کھلا ہے تازہ
اس نے کب دنیا دیکھی ہے
اس کو کیا اندازہ

○

پھول ہے رنگ و بو
دونوں ہیں اڑ جانے والے
کیا میں اور کیا تو

○

پھول محمدؐ کا
اللہ کا ہر فرماں
معمول محمدؐ کا

○

پھول پہ شبنم ہے
آنسو ہو یا موتی
عمر بہت کم ہے

○

پھول سے مت کھیلو
پتی پتی ہونے کا
دکھ پہلے جھیلو

○

پھول کی دی سوغات
اس نے سوچا کنگلے کی
اتنی تھی اوقات

دُخترِ آب

عبداللہ جاوید

بیوی سے بک بک جھک جھک کر کے وہ سمندر کی طرف چلا گیا۔ غنیمت تھا کہ موسم سمندر مخالف مزاج کا نہ تھا۔ موافق اور مناسب تھا۔ ورنہ وہ تو ایسے ایسے موسم میں سمندر کے کنارے پہنچا ہے جب کوئی صحیح الدماغ آدمی سمندر کا رخ نہیں کرتا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ سمندر کا رخ ہی اس وقت کرتا تھا جب اس کا دماغ صحیح نہیں ہوتا یا پھر دل۔ شدید غصہ، دکھ، صدمہ، اداسی، مایوسی، ذہنی کرب دل کی بے چینی یا کوئی گہری نامعلوم کیفیت اس کو سمندر کی جانب دوڑا دیتی۔ ہر طرف برف ہے۔ زمین پر ٹھنڈی سفید برف کا فرش بچھا ہے۔ سمندر کا پانی دور دور تک جمی ہوئی برف میں بدل چکا ہے لیکن حضرت اور کچھ نہیں تو گاڑی دوڑا کر ساحل سمندر کے قریب ترین رسائی کے لائق مقام پر پہنچے ہوئے ہیں۔ خواہ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی۔ سمندر سے اس کا بہت پرانا رشتہ ہے۔ یہ کیسا رشتہ تھا؟ کوئی نہیں جانتا تھا یہ رشتہ کب سے تھا۔ پہلے پہل کب استوار ہوا۔ کوئی اور تو کیا وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ سب کچھ ایسے ہی تھا، شاید اس کے بچپن سے یا شاید بچپن سے بھی پہلے۔ اس کی پیدائش سے بھی پہلے سے۔ اس وقت سے جب وہ پیدا تو نہیں ہوا تھا لیکن تھا اور سمندر بھی پیدا نہیں ہوا تھا، لیکن کسی نہ کسی شکل میں کہیں نہ کہیں موجود تھا۔ اس دن جب وہ سمندر کے کنارے اپنے مخصوص چٹانی پتھر پر بیٹھا سمندر کو اپنے اندر لینے کے لئے اپنے آپ کو کھلا اور ڈھیلا چھوڑا تو اس کو ایک خلافِ معمول صورتِ حال سے دو چار ہونا پڑا۔ معمول کے مطابق تو یہ ہوتا تھا کہ سمندر کا جادو اس کے وجود پر چھا جاتا اور وہ اپنا سب کچھ فراموش کر دیتا۔ یوں لگتا کہ سمندر کی کوئی طاقتور موج اس کا سب غم و غصہ، دکھ درد، نہ چاہے جانے کا، نہ سمجھے جانے کا، تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس کے علاوہ صریح غلط بخشی کا سارا کرب خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گئی اور فوراً بعد کوئی اور موج مثبت عناصر کی ایک تازہ کمک سے اس کے ذہن دل کو معمور کر گئی۔ ایسا تو ہونا ہی تھا اور ہوتا ہی کیونکہ سمندر نے اسے آج تک مایوس نہیں کیا تھا لیکن اس شام وہی کچھ کسی اور انداز میں ہوا۔ نہ تو کوئی موج اس کے منفی عناصر بہا کر لے گئی اور نہ ہی اس کے بعد دوسری موج مثبت عناصر سے معمور کر گئی۔ برسوں کا یہ معمول اس شام نہیں ہوا۔ اس کی جگہ ایک نیا اور خلافِ توقع واقعہ پیش آیا اس کی آنکھوں نے ساحل کے بہت ہی قریب، بصارت اور بصیرت کی حد کے اندر، ایک بے حد خوبصورت اور روشن وجود کو متحرک دیکھا۔ اس طرح حرکت کرتے ہوئے وجود کو دیکھ کر یہی گمان گزرے گا کہ مچھلی سطحِ آب پر آ گئی ہے لیکن روشنی اور وہ بھی عجیب و غریب روشنی جیسے آگ، شعلہ، برق، چاندنی اور دھوپ کو باہم دیگر آمیز کر دیا گیا ہو اور اس کو قوس و قزح کا ست رنگی جامہ پہنا دیا گیا ہو۔ سطحِ آب کے بالکل قریب وسنہرا، روپہلا، بلکہ رنگ برنگا وجود اپنے حسن تابناک کی جلوہ سامانیاں بکھیر رہا تھا۔ اس نے سمندر کے کنارے بچپن سے لے کر اب تک کیا کچھ نہیں دیکھا بھانت بھانت کے پنکھ پکھیرو، جانور، چرند، درندے، تانبیل، کچھوے، کیکڑے اور مچھلیاں، بھانت بھانت کی مرغابیاں بطخیں، قاز، بگلے اور نجانے کیا کیا۔ وہ سمندر کے کنارے ان مقامات تک جاتا جہاں کوئی نہ ہوتا ورنہ آباد اور بارونق ساحلوں پر تو مچھلیاں بھی نہیں آتیں سوائے سی گلوں کے جو لوگوں کا جھوٹا کھاتی ہیں۔ جس وجود کو وہ اپنے پورے ہوش و حواس میں ہوش و حواس کھو دینے کے انداز میں دیکھ رہا تھا وہ قطعی طور پر ان دیکھا، انجانا، ان سوچا اور ان کہا تھا۔ اس نے سفرنامے اور سیاحوں کے روزنامچے بھی بہت پڑھے تھے لیکن گپ باز سے گپ باز جہاں گرد سیاح نے ایسے کسی وجود کا ذکر نہیں کیا تھا۔ الف لیلوی کہانیوں، ایکس زون، ٹوائی لائٹ زون کے زیرِ عنوان چھپنے والے نام نہاد سچے قصوں میں یہاں تک کہ دوسری دنیاؤں اور سیاروں کی کہانیوں میں بھی اس جیسے کسی وجود کا ذکر اس کے پڑھنے میں نہیں آیا تھا۔ وہ ابھی پانی کے اوپر نہیں آیا تھا شاید پانی میں متوازی اور افقی انداز میں تیر رہا تھا سچ تو یہ ہے کہ اس کے تیرنے کا انداز بھی تیرنے جیسا نہ تھا۔ پانی سے اٹکھیلیاں کرنے کو تیرنا نہیں کہا جا سکتا۔ وہ بہت دیر تک اس کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا یہاں تک کہ وہ جس طرح اچانک نظروں کے سامنے آیا تھا، اسی طرح نظروں سے غائب ہو گیا۔ بعد میں وہ بے حس و حرکت بیٹھا اس مقام کو نجانے کتنی دیر تک تکتا رہا۔ اس کو یاد نہیں۔ اس کے غائب ہونے کے بعد اس نے اپنے ہوش و حواس سمیٹے اور اس کے بارے میں سوچا۔ وہ کیا تھی؟ ۔ یہ بات تو قطعیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ وہ مؤنث تھی۔ اس کی چھٹی حس نے اس پر مُہر ثبت کر دی تھی بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ چھٹی، ساتویں، آٹھویں، نویں بلکہ ہزارویں حس (اگر انسان کو اتنی ساری حسیں مہیا ہیں) نے بھی یہی کہا تھا کہ وہ جنسِ مخالف سے تعلق رکھتی ہے۔ تو گویا وہ لڑکی تھی۔ انسان تھی۔ وہ اگر لڑکی تھی انسان تھی تو کہاں غائب ہو گئی۔ آخر کنارے پر کیوں نہیں دکھائی دی۔ یہ تو تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ اس کی گاڑی کنارے پر کھڑی ہوئی پیچ در پیچ چٹانوں اور جگہ جگہ اُگی ہوئی جھاڑیوں کی آڑ میں موجود ہو اور گاڑی میں اس کے ساتھی بھی ہوں لیکن یہ کیسے ممکن ہوا کہ وہ پانی کے اندر ہی اندر کسی طرف کنارے پر نکلی اور اس کی نظروں میں آئے بغیر غائب ہو گئی۔ سوچنے اور کہنے کی حد تک تو یہ درست ہے کہ وہ غائب ہو گئی لیکن کیا وہ حقیقت میں غائب ہو گئی تھی۔ غائب ہونے میں وہ ظاہر تھی، ظاہر ہونے میں وہ غائب تھی۔ اس کی غیر موجودگی ہی اس بات کا ثبوت دیتی ہے کہ وہ غیر موجود ہے

تو کسی اور مقام پر موجود ہے۔عین اس طرح جس طرح وہ خود اپنے مکان میں غیر موجود اور اس غیر آباد ساحل پر موجود ہے اور اب اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا ہے۔اس ساحل کا ایک نام ہے اس سمندر کا ایک نام ہے جو دو ملکوں کے درمیان بہہ رہا ہے ان ملکوں کے بھی نام ہیں۔جُدا جُدا جیسے اس کا اپنا ایک نام ہے اور اس لڑکی کا بھی۔۔۔''بہر حال ناموں کے تفرقوں سے قطع نظر کر کے میں اس لڑکی کو بھی اپنے وجود کے اندرونی گوشے میں لئے اپنی گاڑی کی طرف جا رہا ہوں''اس نے واضح طور پر اپنے آپ کو یقین دلایا۔لڑکی نے اس کے اندر اپنا تسلط جما لیا تھا۔گاڑی میں بیٹھ کر اس نے گاڑی کا رخ گھر کی جانب پھیرنے کے بجائے مخالف سمت میں ایک قریبی موٹیل کی جانب کر دیا۔یوں بھی اس کی ذہنی حالت گھر جانے کے لائق نہیں تھی۔ وہاں اس کی بیوی تھی۔ اس کی بیوی۔۔۔ چڑیل۔۔۔بچپن میں اس نے چڑیلوں کی بہت ساری کہانیاں پڑھی تھیں۔ بڑوں ے ہونے پر پتہ چلا کہ ''چڑیلیں''نہیں ہوتیں۔پھر اسے یاد آیا کہ بچپن میں اس کا اسکول میں جیتی جاگتی ''چڑیل'' سے واسطہ پڑا تھا۔ بھلا سا نام تھا لیکن لڑکے لڑکیاں اس کی غیر موجودگی میں ''چڑیل'' کہہ کر ہی اس کا ذکر کرتے تھے۔ وہ اسکول کی وائس پرنسپل تھی۔اسے ایک اور ٹیچر یاد آ گئی جو جادوگرنی (وچ) کہلاتی تھی۔ایک دن باتوں باتوں میں اس نے اپنے والد سے ''چڑیل'' اور ''جادوگرنی'' کہہ کر پرنسپل اور مینتھس کی ٹیچر کا ذکر کر دیا۔ والد نے اس کے کولھوں پر ایک زوردار دھتڑ رسید کیا۔''اسکول کے اساتذہ کا احترام کیا جاتا ہے''

''You have to be polite with your teacherseven in their absence''

''تمہیں اپنے اساتذہ کا ادب کرنا چاہیے۔ان کی غیر موجودگی میں بھی''

اس نے اپنے رونے پر قابو پاتے ہوئے ''سوری'' کہا تھا۔عین اسی وقت اس کی ماں آ موجود ہوئی تھی اور پھر ماں اور باپ آپس میں اس معاملے پر لڑ پڑے تھے اور وہ ''بیس مینٹ''(Basemnet) میں جا کر پنجرے میں بند پیلی چونچ اور بڑے سے تاج والے طوطے سے باتیں کرنے لگا تھا جس کو ایک روز قبل اس کی خالہ دے گئی تھیں۔اس کی ماں اس بات کے خلاف تھی کہ باپ بچوں کو مارے۔بچوں پر ہر طرح کی سختی کا حق دار وہ صرف اپنے کو سمجھتی تھی اور اس میں کسی کی شرکت اسے گوارہ نہیں تھی۔اسے یہ یاد کر کے ہنسی آ گئی کہ اس کی ماں کی ماں یعنی نانی کو یہ گوارا نہ تھا کہ اس کی بیٹی بچوں کو مارے پیٹے ظاہر ہے بڑوں کے ان اختلافات کا فائدہ بچوں کو پہنچ رہا تھا۔بچے تین تھے وہ اور اس کی دو بڑی بہنیں اس چھوٹ کی وجہ سے بچے تینوں کے تینوں خود سر اور ضدی ہو گئے تھے اور سب سے بڑھ کر وہ خود ہر طرح ایک اسپوائلٹ چائلڈ(SPOILT CHILD) بگڑا بچہ تھا۔ یوں بھی اس کی دو بڑی بہنوں کے ساتھ نے اس کے اندر نسوانیت پیدا کر دی تھی اور وہ موقعہ بے موقعہ آئینہ دیکھنے لگتا تھا۔اس کے حق میں ایک بات اچھی ہو گئی کہ وہ اور اس کی بہنیں جُدا جُدا اسکولوں میں داخل ہو گئی تھیں۔ ماں نے باپ کی مرضی کی پرواہ کئے بغیر لڑکیوں کو ایک کیتھولک گرلز اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔اس طرح وہ اسکول کی حد تک اپنی بہنوں کے زیرِ اثر رہنے سے بچ رہا ورنہ نسوانیت اس پر حاوی ہو جاتی اور وہ ایک ایسا لڑکا بن جاتا جس کو دوسرے لڑکے ''سسی'' کہنے لگتے ہیں تاہم وہ لڑکوں کے مردانہ کھیلوں میں پھسڈی ہی رہا۔نہ تو بیس بال میں اس کا دل لگا اور نہ کسی اور کھیل میں۔جیسے جیسے بڑا ہوتا گیا اس کا ذوق واضح ہوتا گیا اوہ ایک پیدائشی آرٹسٹ نکلا۔ بنیادی رنگوں سے شناسائی تو اسے عمر کے چوتھے سال ہی میں ہو گئی تھی۔رنگوں سے کھیلنے کے ساتھ وہ لکیروں سے بھی کھیلتا۔لکیریں جو نقطوں سے جنم لیتی ہیں دو نقطوں کو ملانے سے بنتی ہیں اور نقطوں کو ملانے سے سے ہی شکلیں بنتی ہیں۔ ہندسی (جیومیٹریکل) شکلیں، مثلث، مربع، مسدس وغیرہ۔ان ہی سے مستطیل بھی بنتے ہیں اور مخروط بھی اور پھر جب نقطہ پھیلتا ہے تو دائرہ جنم لیتا ہے۔ ہر نقطہ دائرہ نہیں بنتا البتہ ہر دائرے کا ایک نقطہ ضرور ہوتا ہے۔ دائرے کا تصور قوس کے ساتھ جُڑا ہوتا ہے۔قوس کے ساتھ نیم قوس۔۔۔اور پھر محور۔۔۔اور محیط جب وہ آرٹ کی کلاس میں دوسرے لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ ماڈل کا اسکیچ بنا رہا تھا جو ایک جوان عورت تھی تو اس کے آرٹ ٹیچر نے تخلیق کا یہ نکتہ بیان کیا تھا کہ قدرت نے عورت کا جسم دائروں اور مخروطوں سے تشکیل دیا ہے۔سب لڑکے اور لڑکیوں نے ماڈل کے برہنہ جسم کو اپنی نظروں سے چھلنی کر دیا تھا۔ مستقبل کے ان آرٹسٹوں پر کچھ گزرا یا نہیں گزرا اس سے نہ تو آرٹ ٹیچر کو کوئی واسطہ تھا اور نہ ہی ماڈل کو۔ایک آرٹ کا دیوانہ تو دوسری ڈالر کی۔ایک دن عبادت خانے میں خالق کائنات کے گیان پر بات کرنے کے دوران پادری، پنڈت، ملا جو کوئی بھی تھا کہنے لگا''اس کے دھیان اور گیان کا راستہ ایک نقطے سے نکلتا ہے۔جب تک آپ نقطے کا گیان نہیں کرتے دائرے تک نہیں پہنچ سکتے۔ہم سب اس غلطی کے مرتکب ہیں اس لئے دائرے کے چکّر میں گرفتار ہیں۔ دائرے سے مرکز تک پہنچتے پہنچتے صدیاں درکار ہیں سو لوگو پہلے مرکز پر دھیان دو۔ پہلے خالق کو مانو۔ پھر کائنات کی طرف جو اس کی تخلیق ہے۔خالق مرکزی نقطہ ہے اور کائنات اس نقطے سے تشکیل پانے والا دائرہ ہے''۔اس کی کار موٹیل پہنچ گئی۔گاڑی چلانا درحقیقت شعوری کام اس وقت تک رہتا ہے جب تک آپ اناڑی ڈرائیور ہیں۔بعد میں تو سب کچھ نیم شعوری ریفلیکسز (Reflexes) پر چلتا ہے۔اس دوران اس نے منیجر سے ٹیلی فونی رابطہ کر کے اپنے آپ کو رجسٹرڈ بھی کرا لیا تھا۔ ایک مرتبہ سب کچھ سیٹل (Settle) کر لینے کے بعد وہ سیدھا ہال میں چلا گیا۔ ہلکا پھلکا کھانا آرڈر کر کے اس نے ڈرنک کی چُسکیاں لیں اور جب گرمی اس کے حلق سے اتر کر معدے کا رخ کرنے کی جگہ سر میں چڑھی تو اس کو یہ پتہ چلا کہ اس نے تواتر کے ساتھ چار پیگ چڑھا لئے تھے اور ساتھ ہی اس کو یہ بھی پتہ چلا کہ وہ اس سے پیشتر آرٹ ٹیچر اور کسی پیشوا کے رٹے رٹائے فقروں کے بیچوں بیچ

موجود تھا۔ دونوں جانب ہندسی اشکال تھے نقطے تھے دائرے تھے اور نجانے کیا اَلَم غلَم۔ اس کو اچانک یاد آیا کہ پیرس میں پینٹنگس کی تازہ ترین نمائش میں اس کے پانچ شاہکار رکھے گئے ہیں۔ اب کی مرتبہ اس کو یقین تھا کہ ایلیگرو Allegro نامی اس کمپیٹیشن میں وہ ضرور اول انعام لے گا۔ یوں تو اس کو چھوٹے بڑے بے شمار اعزازات اور انعامات، دنیا کے قریب ہر مقابلۂ آرٹ میں مل چکے تھے لیکن کسی بڑے مقابلے میں اول آنے میں وہ ہمیشہ ناکام رہا تھا۔ اس ناکامی پر وہ ہمیشہ ایک طنزیہ مسکراہٹ سے کام چلا لیا کرتا۔

''بیچارے وہ کیا جانیں میرے رنگ کس زبان میں باتیں کرتے ہیں اور میرے برش کے توانا اور پراعتماد اسٹروکس اس کی جانب کیسے واضح اشارے کرتے ہیں۔ جو موجود ہو کر بھی غیر موجود ہے۔ لیکن ان کی سمجھ میں آنے لگے گا وہ جان جائیں گے۔۔۔ ان کو جاننا پڑے گا۔ ان کو میری عظمت کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ میں سب سے منفرد ہوں میں جسموں کے باطنی وجودوں کو مصور کرنے والا ہوں۔ میرے رنگ مقدس راگ الاپتے اور میرے اسٹروکس ان پر دیوانہ وار رقص کرتے ہیں۔ اس رقص اور موسیقی کی فضا میں میری تخلیقات تجرید اور تجسیم کے آواگون سے دو چار رہتی ہیں۔ میں فنا اور بقا، ہستی و نیستی کا فنکار ہوں''۔ ہر بڑی ناکامی کے بعد وہ کچھ اس طرح سوچتا اور مسکرا پڑتا۔ وہسکی کے چار پیگ اس کی حد تھے بعد میں پیتے رہنے کا مطلب وہ جانتا تھا۔ چنانچہ اس نے آرڈر کئے ہوئے کھانے کی جانب رجوع ہونے میں ہی اپنی عافیت جانی۔ کھانے کے دوران اس نے ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لیا۔

کوئی چہرہ، کوئی شخصیت ایسی نہ تھی جس پر دوسری نظر ڈالی جا سکتی۔ دور کے کونے میں ایک چھوٹی میز کے ساتھ بیٹھی ہوئی ایک بوڑھی عورت کے ماسوا جس کی عمر ستر سے تجاوز کر چکی تھی لیکن ہنوز اس کے جسم کا رُواں رواں زندہ تھا اور چہرے کے خط و خال ہلکے سروں میں گنگنا رہے تھے۔ وہ شاید خاموشی سے اپنے ساتھی کی باتیں سن رہی تھی۔ دونوں سیّاح لگتے تھے۔ اس کا مرد ساتھی اس سے قدرے بڑی عمر کا تھا لیکن اس نے اپنی داڑھی مونچھیں رنگی ہوئی تھیں اور سر پر بڑی ساری ٹوپی منڈھ رکھی تھی۔ ایسی ٹوپی جس کو اتار کر بیٹھنا یا سلام کرتے وقت اتارنا لوازمۂ تہذیب نہیں ہوتا۔ کسی کو گھورنا چونکہ خلافِ تہذیب ہے وہ اس جوڑے کو وقفے وقفے سے دیکھ رہا تھا۔ درمیانی وقفوں میں ہال میں مصروفِ رقص جوڑوں پر نظر ڈالتا رہا تھا۔ موٹیل کا ہال رسمی سا تھا اس میں رقص کرنے کا رواج بھی نہ ہونے کے برابر تھا اور موسیقی کا انتظام بھی صرف کام چلانے کی حد تک۔ غیر معمولی لیکن ''ٹین ایجرس'' میں مقبول گیتوں کی دھنیں بجتی رہتی تھیں۔ ویسے گاہکوں کی مہیا کی ہوئی سی ڈیز' ڈی وی ڈیز اور کیسٹیں بھی بجا لئے جاتے تھے۔ لیکن بادلِ نخواستہ۔ جب اس کی نگاہ ایک بار پھر گھوم کر دور کنارے میز کی جانب گئی تو اس کے سامنے ایک جھما کا سا ہوا وہاں ایک مہمان کا اضافہ ہو چکا تھا اور وہ لڑکی کم اور آبی رنگوں سے بنائی ایک تصویر زیادہ دکھائی دیتی تھی۔ اس نے آبی رنگوں میں بہت کم کام کیا تھا لیکن جو بھی کیا شاہکار کام تھا۔ اس کے آبی رنگ کبھی دریا کی موجوں کی طرح بہتے تو کبھی کسی معصوم کنواری کی آنکھوں سے پھول رخساروں پر ڈھلک آنے والے آنسوؤں کی طرح پھسلتے اور کبھی یوں ڈبڈباتے جیسے نیم وا کلیوں میں صبح کی شبنم۔ آبی رنگوں میں برش کے اسٹروکس کی حتی الامکان کفایت اس کی انفرادیت تھی نتیجہ ظاہر تھا کہ اس کے آبی رنگوں کے شاہکاروں میں جسموں کے اندر سے روحیں باہر آ جاتیں۔ اتنے فاصلے کے باوجود اس لڑکی کی روح اس کے جسم سے باہر آ کر اس کی آنکھوں کی راہ سے اس کے وجود کی گہرائیوں میں اترتی معلوم ہوئی اور ساتھ ہی اس کے شعور کی رَو نے ایک بار پھر اس کی نگاہوں کے سامنے سمندر کے کنارے تیرنے والے نسوانی پیکر کو موجود کر دیا۔ اس کے اندر یہ خواہش شدت کے ساتھ ابھر آئی کہ وہ اس وجود کو پکڑ لے لیکن اس نے اپنی اس بچکانہ خواہش کو اپنے اندر سے باہر جھٹک دیا اور اپنے آپ سے بولا ''یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ کیا مجھے مزید پینا چاہیے''۔

اس کی نگاہیں آپ ہی آپ اس کونے کی جانب چلی گئیں۔ ''او مائی گوڈ! یہ لڑکی کتنی زیادہ آبی ہے جیسے پانی اور رنگ سے بنی ہو اور اس کا چہرہ کتنا ٹرانسپیرنٹ (شفاف) ہے۔ بیرونی چہرے کے پیچھے سے اندرونی چہرہ جھلک جھلک پڑھتا ہے۔ کیا واقعی وہ اتنی ہی حسین ہے جتنی دکھائی دیتی ہے۔؟ حسنِ قاتل جیسے اس کے تصور میں کوئی زہرہ، کوئی قلوپطرہ، کوئی کارمن، کوئی ڈیلائیلہ یا کوئی ہیلن ابھر آئی ہے''۔ اسے یقین تھا دنیا کی ساری حسیناؤں کی تخلیق آبی رنگوں سے ہوئی ہوگی۔ اور ہر قابلِ ذکر حسینہ ٹرانسپیرنٹ ہی لگتی ہے۔ وہ تو اپنی کرسی پر جما رہا لیکن اس کا اندرونی وجود اُسے حیران چھوڑ کر، اس دور کونے میں رکھی ہوئی چھوٹی سی گول میز کے اطراف میں بیٹھے ہوئے لوگوں تک پہنچ گیا۔ وہ اب ان چاروں افراد کا تفصیل سے جائزہ لے رہا تھا۔ ان کو محسوس کر رہا تھا شاید ان کی باتیں بھی سن رہا تھا۔ جبکہ اس کا ظاہری وجود اس گوشے کی جانب گھورنا بھی ترک کر چکا تھا۔ کسی کو گھورنا خلافِ تہذیب جو ٹھہرا۔ اس کے چھٹے، ساتویں، آٹھویں، نویں سنس نے ان کی باتیں اندر ہی اندر اسکو سنوا دیں۔ خوبصورت بزرگ خاتون اس حسینہ (شفاف) سے کہہ رہی تھیں۔

''او مائی سویٹی تم ہمیں کہاں لے آئیں۔ یہاں خاک تفریح ہے۔ توبہ توبہ پانی کی شور مچاتی موجوں کے علاوہ کچھ بھی تو نہیں۔''

''خاک تفریح تو نہیں ہے البتہ آب تفریح ضرور ہے۔ مائی ڈیئر ڈیئر گرینی''

لڑکی نے بات کو ہنسی میں ٹال دیا:

''یہ مُوا سمندر تیری ماں کی بھی کمزوری تھا''

''کمزوری نہیں گرینی۔ سمندر تو میری موم کی طاقت تھا۔ میری موم سمندر پر حکمرانی کرتی تھی۔ وہ ملکہ تھی۔ سمندر کی ملکہ۔ وہ سمندر کی موجوں میں تیرتی نہیں تھی بلکہ فاتحانہ خرام کرتی تھی'' شفاف چہرے والی لڑکی کا چہرہ اپنی ماں

کی پیرا کی کا ذکر کرتے ہوئے مزید شفاف ہو گیا تھا، شاید اسی ذکر نے اس کو اپنی سیٹ پر واپس پہنچا دیا جہاں وہ ایک بار پھر اپنے اصل وجود میں ضم ہو کر اس حسینہ کے تصور میں کھو گیا۔ جس کو اس نے پانی کی لہروں سے طلوع اور پھر ان ہی لہروں میں غروب ہوتے دیکھا تھا۔

''وہ سمندر کی موجوں پر خرام کر رہی تھی اس شفاف حسینہ کی ماں کی مانند یا پھر۔۔۔ یا پھر ان پر محورِ قص تھی۔۔۔؟'' اس نے اندر ہی اندر اپنے آپ سے سوال کیا اور جواب میں اس کے اندر نے الٹا پوچھا ''تم یہ کیوں نہیں سوچ سکتے کہ وہ پیراک حسینہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے۔ یہ شفاف حسینہ؟ اس کی ماں موجوں پر چلتی تھی تو کیا یہ سمندر کی موجوں پر رقص نہیں کر سکتی۔۔۔؟'' اس کے ذہن میں ایک وقفۂ سوالات سا گزر گیا اور جوابات کے مرحلے پر اس نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔

''نہیں۔۔۔ یہ قیاس درست نہیں ہے۔ یہ لڑکی وہ نہیں ہو سکتی۔ وہ لڑکی یہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے اندر کوئی مستقل ترغیب دے رہا تھا کہ کرسی چھوڑ کر ان لوگوں کے پاس جائے۔ وہ اٹھا اور تیز تیز قدموں سے چل کر اپنے روم میں پہنچا اور ٹی۔ وی آن کر کے اپنے آپ سے راہِ فرار اختیار کر لی۔ اسکرین پر کسی انشورنس کمپنی کا اشتہار تھا۔ ''زندگی آپ کی طرف بہت تیز آتی ہے'' جب کبھی وہ یہ اشتہار دیکھتا تو بڑبڑاتا ''زندگی آپ کے پاس سے بہت تیز جاتی ہے۔''

کچھ دیر ٹی۔ وی دیکھنے کے بعد اس نے اس کو سوئچ آف کیا۔ کمرے کی تیز بتی بھی بجھائی اور بستر پر دراز ہو گیا۔ آنکھیں بند کیں تو اس کی بیوی سامنے آ گئی۔ تصور میں بھی وہ ایک چڑیل ایک کڑک مرغی ہی نظر آئی۔ جس سے فرار کر کے تصور ہی تصور میں وہ ساحلِ سمندر پر پہنچ گیا۔

''اے سمندر تو میرا ہمدم، میرا ہم راز ہے'' کسی شاعر کا یہ مصرع اس کے ذہن میں گونجنے لگا اور وہ سمندر کی لہروں میں یا نیند کی بانہوں میں پڑ کر سو گیا۔

صبح اس کا سر بھاری تھا۔ سر میں اور کندھوں میں درد ہو رہا تھا اتنی کم پینے کے باوجود ''ہینگ اوور'' وہ بڑبڑایا بستر سے ایک چھلانگ لگائی اور دن کی مصروفیات میں الجھ گیا۔ جب وہ گھر پہنچا تو یہ سوچ کر کہ وہ بیوی کو خاطر میں نہ لائے گا۔ اپنے اسٹوڈیو کی طرف بڑھا۔ لیکن اس کا گھر تو بھائیں بھائیں کر رہا تھا اسکی تنک مزاج لڑاکا بیوی گھر چھوڑ کر جا چکی تھی۔ گھر کی ساری قیمتی اشیاء غائب تھیں اس نے گھر کا صفایا کر دیا تھا۔ جب وہ بیڈ روم میں پہنچا تو اس کا چھوڑا ہوا پرچہ ملا۔ لکھا تھا۔

''میرے پیچھے نہ آنا'' اس نے درست لکھا تھا اس کے پیچھے جانا فضول تھا اور نہ ہی اس سامان، نقدی، زیور کے لئے کچھ کیا جا سکتا تھا جو وہ لے گئی تھی۔ چیک بک بھی جگہ پر نہیں ملی۔ جس کا مطلب صاف تھا کہ بینک کا بھی صفایا ہو چکا ہوگا۔ اس نے بینک فون کیا معلوم ہوا کہ تھوڑی سی رقم اس کی بیوی نے شاید اس پر ترس کھا کر چھوڑ دی تھی۔ اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور ''شٹ'' کہہ کر دیوار کو ٹھوکر مار دی۔ اس سے پہلے کہ وہ گھر میں کچھ توڑ پھوڑ مچاتا، اس کا بدن آپ ہی آپ ایک صوفے پر گر پڑا۔ وہ قریب قریب بے سدھ پڑا تھا۔ سامنے لگی کلاک کی سوئیاں چکر لگانے میں مصروف تھیں، ٹک ٹک، ٹک ٹک، وقت گزر رہا تھا، گزرے جا رہا تھا۔

وقت کو اس نے ہمیشہ اپنا دشمن سمجھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وقت انسان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اس کی بیوی جو اس کو اس طرح چھوڑ کر بھاگ چکی تھی، اسی دشمن کا حوالہ دے کر لڑا کرتی تھی۔

''تم مجھے وقت نہیں دیتے ہو''

''بیوی؟ ہونہہ کتیا؟ (بچ)!

فلنگ بچ! اس کو ہر وقت۔۔۔ موقع بے موقع۔۔۔ وقت چاہیے تھا۔ اس کی فالتو باتیں سنو۔۔۔ سُنے جاؤ۔ اس کے بے ہودہ، ذوق سے عاری محض فیشن کے مطابق لباس کی تعریف کئے جاؤ۔ اس کے لیپا پوتی کئے ہوئے جی متلانے والے چہرے کو دیکھے جاؤ۔ تعریفی نظروں سے۔ اس کے باہر نکلے ہوئے بھدے بٹکس کو ہاتھوں سے تھپتھپاتے جاؤ۔ جیسے سائس گھوڑی کو تھاپی دیتا ہے۔ شاید وہ گھوڑی ہی تھی کتیا کم گھوڑی زیادہ، اس کے قریب جاؤ تو اس کے بدن کے مختلف حصے پھڑکنے لگے تھے۔ جیسے کسی گھوڑی کا بدن اپنے سائیس یا مالک کو یا پھر کسی گھوڑے کو قریب پا کر پھڑکتا ہے۔ ''دیٹس اٹ'' وہ شاید گھوڑی ہی تھی پیچھے جاؤ تو دولتیاں جھاڑنے والی آگے جاؤ تو بڑا سا منہ پھاڑ کر کندھے کو جکڑنے والی۔ اُسے پہنچاننے میں خود سے غلطی سرزد ہوئی، اس نے سوچا اور پھر سوچ کا سلسلہ چل نکلا۔ وہ سب میرا ہی قصور تھا، میں نے اپنے گھر کے دروازے ایک گھوڑی کے لئے کھول دیئے تھے۔ وہ ہنہناتی ہوئی اندر آ گئی''۔ اس نے پہلے بیڈ روم، پھر لونگ روم پر قبضہ جما لیا۔ بیڈ روم میں وہ اس پر دولتیاں جھاڑتی اور لونگ روم میں اپنی جیسی گھوڑیوں اور ان سے جفتی کھانے والے گھوڑوں کا مجمع لگائے رکھتی۔ فیملی روم کچن، اور اسٹڈی کو اس پر چھوڑ رکھا تھا۔ کھانا پکانے سے اُسے بیر تھا اور جو کبھی شوق فرماتی تو سارا کا سارا گاربیج کرنا پڑتا۔ وہ تو کہو اللہ تعالیٰ کے کرم سے دو بہت ہی سلیقہ مند ملازم ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ایک مرد اور ایک عورت۔ وہ دونوں بٹلر، باورچی، خانساماں، کیئر ٹیکر سب کچھ تھے۔ اس کی بیوی۔ سوری۔۔۔ گھوڑی کو تو کوفی بنانی بھی نہیں آتی تھی، جب ملازم ادھر اُدھر ہوتے تو وہ کوفی بنانے کی فرمائش کرتی۔

''ذرا کوفی بنا دو ڈارلنگ تمہیں پتہ ہے نا مجھے پرکولیٹر سے وحشت ہوتی ہے۔!

وہ مٹک کر بولتی۔ اسے پرکولیٹر ہی سے نہیں گھر کے ہر کام سے وحشت ہوتی تھی۔ اس کو ویکیوم کلینر استعمال کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ اگر ملازم گھر پر نہ ہوں اور کوئی ضرورت آن پڑے تو وہ پیار سے آواز دیتی ''ذرا لِونگ روم میں

ویکیوم کر دو ڈارلنگ' اور اُسے اپنی اسٹوڈیو کی مصروفیت ترک کر کے اور رنگوں میں اٹے ہوئے لباس میں لِونگ روم کی صفائی کرنا پڑتی۔ اگر وہ آنا کوفی کرتا تو صفائی کرنے کے لئے ایک ایسی اسپینی میڈ کو کال کرتی جس کی منحوس صورت دیکھنا اسے قطعی منظور نہ تھا۔

نجانے وہ اپنی بھگوڑی بیوی کے بارے میں کتنی دیر تک اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا۔ اچھی طرح یاد نہیں کہ ایسے موقعوں پر وہ دل ہی دل میں سوچتا یا پھر بڑبڑاتا ہے۔ وہ اپنی بیوی پر ہنسنا چاہتا تھا۔ زور زور سے ہنسنا چاہتا تھا۔

''اچھا ہی ہوا وہ چلی گئی'' وہ اٹھا آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے اور اپنے عکس کو آئینے کے اندر ہنستا دیکھتے دیکھتے وہ تھک گیا۔ اس کے جبڑے دُکھنے لگے۔ عکس کے اندر جو تھا، وہ باہر نہ تھا۔ پتہ نہیں کیوں اسے ایسا لگا کہ آئینہ اس سے جھوٹ بول رہا تھا۔ پُرانے زمانے میں آئینے سچ بولتے تھے، لیکن پرانے زمانے میں آدمی ڈالروں کے پیچھے اتنا دیوانہ نہ تھا''۔ وہ بڑبڑایا اور کسی دماغی رَو کے تحت ٹیلیفون کے بٹن دبا دئے۔ دوسری جانب ریئل اسٹیٹ کا آدمی تھا۔ ''ہائے۔۔۔ دنیا کیسی جا رہی ہے اولڈ مین؟''

''جیسی جاتی ہے۔۔۔ ینگ مین؟''

''اس کا مطلب ہے تم مجھے پہنچان گئے ہو؟''

''تم خوب جانتے ہو میں تمہاری آواز پہچان لیتا ہوں۔ آرٹسٹ شیطان۔ بولو کیسے کال کی؟''

ریئل اسٹیٹ کا ایجنٹ اپنے کام میں پیشہ ورانہ لیکن اپنے سلوک میں خوش مزاج آدمی تھا۔ اس نے پہلے ہی اپنے اس عظیم الشان وِلا کو برائے فروخت کے طور پر لگوا رکھا تھا۔ بڑے عرصے کے بعد اس کا ایک جینوئن خریدار بھی سامنے آیا ہوا تھا۔ اب جو اس کی بیوی نے یہ انتہائی قدم اٹھا لیا تو یہ ضروری ہو گیا تھا کہ اپنے مکان کے دام ہاتھ کر لے۔ مبادا اس کی بیوی سب پیسے اڑانے کے بعد کسی گھوڑے وکیل کے ساتھ ہنہناتے ہوئے آئے اور نصف مکان کی دعویدار بن کر دولتیاں جھاڑنے لگے۔ اس خیال سے اپنے اسٹیٹ ایجنٹ کو مناسب داموں پر ڈیل فائنل کرانے کے انسٹرکشن دے دئے۔ اس طرف سے جواب ملا۔

''نو پرابلم۔ ڈیل ہو گئی، سمجھ لو۔۔۔ کب تک موو کرنے کا ہے؟''

''ڈیل کے ساتھ ہی فوراً۔۔۔ مجھے کوئی نوٹس پیریڈ درکار نہ ہو گا۔ کسی دیانت دار موونگ ایجنسی سے بھی تم ہی معاملات طے کروا دینا۔''

''اوکے یو آر ڈی باس'' اسٹیٹ ایجنٹ نے جواب دیا۔

ٹیلیفون بند کر کے وہ اسٹوڈیو میں داخل ہوا اور اپنی ادھوری اور اہم پینٹنگس کو احتیاط سے پیک کرنے میں لگ گیا۔ اسٹوڈیو کی پیکنگ کو وہ ''موورس'' (Movers) کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

ایک ہفتہ کے اندر اندر وہ اپنے شاندار ولانما مکان سے دست بردار ہو چکا تھا۔ ''ایک مرتبہ وہ پھر بے گھر ہو گیا۔ زندگی میں کئی بار وہ گھر سے بے گھر ہوا۔ اسے اچھی طرح یاد نہیں۔ یہ عصر جدید ہے، پرانے زمانے میں لوگوں کے آبائی گاؤں، آبائی شہر، آبائی رہائش گاہیں۔۔۔ محل، فورٹس، کوٹھیاں، بنگلے اور مکان ہوا کرتے تھے اور تو اور قبرستان بھی آبائی ہوتے تھے۔ بڑے لوگ جہاں کہیں بھی مرتے لیکن دفن ہوتے تھے اپنے خاندانی قبرستان میں''۔

اس نے سوچا اور سوچتے میں مسکرا دیا۔

بہرحال وہ اپنے آپ کو ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ اب اس کے لئے اڑنے کے سوا کوئی چارا نہیں رہا تھا۔ اس کے ایجنٹ نے اس کے ضروری سامان کو ایک ماہ کے لیے بحفاظت رکھوا بھی دیا تھا۔ وہاں سے سب کچھ اس ایجنسی کے لوگ اس کے اگلے پتے پر بھجوا دینے والے تھے۔ ''اگلا پتہ'' ابھی اس کا کوئی اگلا پتہ نہ تھا۔

وہ اپنی پسندیدہ ایئر ویز کے ایک جمبو کی گود میں پیرس کے لئے اڑ رہا تھا اور دوران پرواز ہمیشہ کی طرح زمین سے منقطع ہونے کو اس طرح محسوس کر رہا تھا جس طرح کوئی بچہ کسی تیز رفتار جھولے میں پہلا جھوٹا لیتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ اس کا بچپن اس سے کبھی جدا نہیں ہوا تھا۔ ''کیا سب آدمیوں کے بچپن بھی اس طرح چپکے ہوئے رہتے ہیں؟'' اس نے سوال کیا ساتھ ہی اس کے ذہن میں ایک اور سوال اُبھرا۔

''یہ میں کس سے سوال کرتا ہوں؟'' کیا میرے اندر میرے سوا کوئی اور بھی ہے؟

کیا ہر آدمی کے اندر کوئی دوسرا آدمی بھی ہوتا ہے؟ کیا ہم سب دوہری شخصیتوں کے مالک ہوتے ہیں؟ کیا آدمی اسپلٹ ہونے کے امکان میں زندگی گزار دیتا ہے جب کہ کوئی اس سے دو چار بھی ہو جاتے ہیں۔

''ڈیول پرسنالیٹی'' ہونہہ ''ہم بگ'' یہ ماہران نفسیات۔۔۔۔!

سائیکاٹرسٹ۔۔۔ لٹیرے۔۔۔۔ احمق آدمیوں کی جیبوں کو ہلکا کرنے والے جیب تراش آج ڈیول پرسنالیٹی کا مسئلہ اٹھتا ہے تو بہت جلد ملٹی پل پرسنالیٹی کا شوشہ اٹھ جائے گا۔

''ملٹی پل'' کا دور جو ٹھہرا۔'' عین اُس وقت فضائی میزبان نے کچھ پینے کے لیے پیش کیا۔ ''کوئی سی بھی اسکاچ'' اس نے لڑکی کے یونیفارم کے اندر سے چھلکتے ہوئے بدن کو ایک آرٹسٹ کی نگاہ سے جانچتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرائی۔ پیشے کی مسکراہٹ تقسیم کرنے میں وہ کیوں بخل سے کام لیتی۔ ''موسیو۔۔۔ اپنی ایئر ویز کی ایک خاص وائن کی سفارش کروں گی۔ ہماری اسپیشیلٹی'' اس نے انتہائی شائستہ انداز میں اپنا رٹا یا فقرہ اس کی سماعت میں انڈیل دیا۔ ''اوکے۔ اوکے۔۔۔ تم جس طرح چاہو مجھے قتل کرو! میرے لئے تو تم خود ایکسٹرا اسپیشل ہو۔''

لڑکی نے جام پیش کیا اور اٹھلا کر چلی گئی۔

وہ اس لڑکی سے قطعاً غیر متاثر تھا اور جو کچھ اس نے بولا اور جو کچھ اس نے ظاہر کیا وہ صرف اور صرف رسمی خوش اخلاقی تھی۔ فضائی میزبان ایسا ہی سلوک اپنے مہمانوں سے ایکسپیکٹ کرتی ہیں۔

ان کے ساتھ اگر ایسی شولری نہ دکھائی جائے تو وہ غریب اپنے کو ''ناکام'' سمجھنے لگیں۔ شراب جو اس لڑکی نے پیش کی وہ حقیقت میں اچھی تھی، اس کے پہلے ہی گھونٹ نے اس کو سوالات کے اس جھمیلے سے باہر نکال دیا، جس میں وہ بُری طرح الجھ گیا تھا۔ اب وہ اپنے اس وجود میں واپس آ چکا تھا، جس کا تعلق حسن، تخلیق حسن، رنگ، روشنی اور شیڈس سے تھا۔ آرٹ ویونگ (حسن بینی) اور آرٹ کری ایٹنگ (تخلیق حسن) میں نمایاں فرق یہی ہے تصویر دیکھنے والا رنگ دیکھتا ہے۔ تصویر بنانے والا رنگوں کے ساتھ ان کی روشنی اور سایوں کو بھی پینٹ کرتا ہے۔ اگر آپ مصور ہوں تو اس حقیقت سے بھی واقف ہوں گے کہ رنگوں کی تخلیق روشنی سے ہوتی ہے۔ جب روشنی ٹوٹتی ہے تو بنیادی رنگ جنم لیتے ہیں۔ باقی سارے رنگ ان رنگوں کی پرچھائیاں (شیڈس) ہوتے ہیں۔ وہ روشنی اور اس کی پرچھائیوں کا بڑا پارکھ تھا۔ رنگ اس کو دھوکہ نہیں دے سکتے تھے وہ ان کی ایک ایک ادا، ایک ایک ناز، ایک ایک نخرے سے واقف تھا۔ رنگ بھی اس کے ایک ایک برش کو پہچانتے اور ان کی نوکوں پر آتے ہی ان کے تابع فرمان ہونا جانتے جیسے وحشی سے وحشی رہوار کسی شہ سوار کی رانوں کی گرفت کو محسوس کرتے ہی اپنی گردن، کمر اور چاروں ٹانگیں اس کے قابو میں دے دیتا ہے۔ فضائی میزبان کی دی ہوئی شراب کیف آور تھی، لیکن تیز نہ تھی۔ فضائی کمپنیاں تیز شرابوں سے اپنے مسافروں کو دور رکھتی ہیں، لیکن بعض لوگوں کے لیے شراب کا نام ہی بہت ہے۔ چنانچہ ایک بڑی عمر کے شریر بچے نے کسی فضائی میزبان کی ران میں چٹکی لے لی پہلے تو وہ ایک دو قدم آگے چلی پھر اُلٹے قدموں لوٹی اور اس ''بڑ بچے'' کے پاس ادب سے جھکی اور بولی:

موسیو! میں سپروائزر سے آپ کی شکایت کر سکتی ہوں لیکن ایسا کرنے سے اپنے آپ کو روک رہی ہوں۔ مجھے آپ کی عزت عزیز ہے۔ توقع کرتی ہوں موسیو! آپ بھی میری عزت کا پاس کریں گے۔'' یہ کہہ کر وہ بڑے پروقار انداز سے چلتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ چال کی اس تبدیلی کو محسوس کر کے وہ حیران رہ گیا گھوڑی۔۔۔ اس نے سوچا یا شاید ہلکی آواز میں بڑبڑایا اور مسکراتے ہوئے سوچا عالم حیوانات میں گھوڑا ہی وہ جانور ہے جو نہایت غیر محسوس طریقے سے اپنی چال بدل لیتا ہے۔ اس کی چار اقسام کی چالیں بھی مشہور ہیں۔ ڈلکی۔۔ ابھی وہ باقی تین چالوں کے بارے میں سوچنے ہی والا تھا کہ بڑ بچے مسافر نے حقارت سے دانت پیس کر آواز لگائی۔ ''فلنگ پچ'' اور پھر اس کی جانب دیکھ کر ایک آنکھ دبائی۔ اس نے بڑ بچے کے اس احتیاط کو قدر دانی سے محسوس کیا کہ یہ فقرہ اس نے فضائی میزبان کے عقب میں اس وقت پھینکا جب وہ شاید اس کی آواز کی پہنچ سے دور ہو چکی تھی۔ اس کا جی چاہا بڑ بچے سے بولے ''کتیا نہیں میرے بھائی۔۔۔ گھوڑی۔۔! شراب کے بعد کھانا اور سوفٹ ڈرنک۔۔۔ پھر کوفی۔۔۔ پھر ٹی۔ وی اسکرین پر مووی اور سوچ۔۔ سوچ میں۔۔۔ بیوی۔۔۔ ماں۔۔۔ ماں باپ میں بظاہر مسلسل اختلاف رائے۔۔۔ تُو تُو۔۔۔ میں میں۔۔۔ چھوٹی جھڑپیں۔۔۔ بڑی جھڑپیں۔۔۔۔ جنگیں۔۔۔ مار پیٹ لیکن وہی ایک ساتھ رہائش بیڈروم ہی نہیں بیڈ بھی ایک۔۔۔ جوانی۔۔۔ پختہ عمر۔۔۔ ریٹائرمنٹ بُڑھاپا۔۔۔ ملازمہ پر انحصار۔۔۔ اولڈ ہاؤس میں نہ کوئی بھیجنے پر راضی اور نہ کوئی جانے پر تیار پھر۔۔۔ باپ کی وفات اور اس کے پیچھے ماں بھی صرف چند ہفتوں کے اندر۔۔۔ عجیب۔۔۔ ناقابل فہم رفاقتِ عمری۔۔۔ مزاجوں میں۔۔۔ ذہنوں میں۔ پسند ناپسند میں ہم آہنگی، نہ ہونے کے برابر۔ ایک قطب شمالی تو دوسرا قطب جنوبی۔۔۔ جسموں میں قدرِ مشترک۔۔ صفر۔۔ والد ٹھگنے اور موٹے۔۔۔ والدہ۔۔۔ لمبی اور دبلی۔۔۔ والدہ خواب دیکھنے والی۔ والد انسانی روبوٹ۔۔۔ والدہ بنیاد پرست مذہبی۔ والد خدا کے وجود پر شک البتہ ''حیسس'' پر یقین رکھتے تھے۔ اولاد میں وہ خود بھگوڑی بیوی کا شوہر۔۔۔ روشنی، رنگ اور پرچھائیوں کا قیدی، ہر وقت کی سوچ میں گرفتار، زمین سے آسمان تک سوچ کے سلسلے، شعور کی رویں۔۔۔ نیم شعور کی رویں اور لاشعور کا ماورائی خلا لیکن خدا۔۔۔ اس کی سوچ میں خدا نہیں آتا اور آتا بھی تو چھلاوے کی طرح غائب ہو جاتا۔ جیسے کالی رات میں بجلی کا کوندنا۔

دو بہنیں جن کو ماں نے لڑکوں سے علیحدہ پالنے کی کوشش کی۔ لڑکیوں کے کیتھولک اسکول میں پڑھوایا لیکن گرمیوں سے کوئی محفوظ رہ سکتا ہے؟ لڑکیوں کو وہ بیچ پر جانے سے کیسے روک سکتی تھی؟ بیچ پر ماں باپ کہیں۔ لڑکیاں کہیں اور وہ کہیں۔ ماں کی مذہبی طبیعت اور روزمرہ کی زندگی میں بنیاد پرستی کی وجہ سے ہم تینوں کی زندگی میں جنس (سیکس) قدرے تاخیر سے داخل ہوئی۔ بیچ پر دوسرے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ انتہائی نوعمری میں بھی وہ لڑکیاں تاکتا پھرتا۔ اس کے بعد جیسے جیسے بڑا ہوا چھوٹی بہن کی سہیلیوں نے اس کی اُستانیوں کا کام کیا۔ چھوٹی بہن اپنا بدن دیکھ لینے کا موقع بھی دے دیا کرتی تھی۔ بڑی بہن ان معاملوں میں بڑی سخت تھی۔ چھوٹی بہن کو یہ کہتے ہوئے سنا ''دیدی کیا تم ماں کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے'' موسٹر بیشن سے کام چلاتی ہو۔

''ہاں'' جب تک شادی نہیں ہو جاتی''

''پلیز دیدی۔ کنڈوم کے استعمال کی سہولت ہے نا۔۔۔ میری سہیلیاں موسٹر بیشن کے بہت خلاف ہیں''

''اپنی سہیلیوں کی کیا بات کرتی ہو جیسی تم ویسی تمہاری سہیلیاں''

''او مائی گوڈ! دیدی۔۔۔ یہ کیا کہہ رہی ہو۔۔۔ ہوش میں آؤ۔۔ ماں پرانی دنیا کی مخلوق ہے۔ اب اس کا زمانہ گزر گیا ہے''۔

''میں ماں کی طرف ہوں۔ شادی ہونے تک وہی کروں گی جو ماں نے کیا تھا۔۔۔ بس۔ دیٹس اِٹ'' اس نے سیکس کے بے شمار گُن بڑی جلدی اور

بہ آسانی سیکھ لئے۔

کچھ سکھانے والیوں کی وسیع القلبی کے سبب تو کچھ اپنے تجسس کی تحریک پر۔۔ پرونا گرافی سے اسے دلچسپی نہیں رہی لیکن عریاں تصاویر کا دلدادہ ہونے میں دیر نہیں لگی۔ ویڈیو کیسٹس، کتابیں، ڈی وی ڈیز، سی ڈیز، موویز۔۔۔ انٹرنیٹ اس نے سیکس کے عہد میں پیدا ہونے کا حق ادا کیا، لیکن سیکس میں ڈوب نہ سکا۔ وہ تخلیق کار تھا، بہت جلد اس نے عریانی میں حسن تلاش کرنا سیکھ لیا۔ عریانی اس کو سیکس کے عمل کی جانب راغب کرنے کی جگہ حسن تخلیق کرنے کی جانب مائل کرنے لگی۔ ''بہنوں کا کیا بنا۔۔۔؟''

یہ سوچ کر وہ ہنس پڑا۔ تقدیر کا مذاق۔۔۔ اس کی چھوٹی۔۔۔ شرارتی سیکس کے معاملات میں وسیع القلب لڑکی۔ آج ایک ''نن'' ہے اس نے شادی نہیں کی اور نہ ہی اس کا کوئی ایسا ارادہ ہے۔۔ بڑی بہن۔۔۔ بنیاد پرست مذہبی مجنوں ماں کی چہیتی بیٹی اور اس کی تعلیمات پر کامل وِشواس رکھنے والی۔۔۔ آج ایک کامیاب ''اسٹرپ ٹیز'' پرفارمر ہے۔ اس کا میاں غیر عیسائی ہے۔ اسٹیج کا اداکار ہے، دونوں کی ایک شوخ وشنگ بیٹی ہے جس کو وہ مووی ایکٹریس بنانے کی فکر میں ہیں۔

ابھی وہ تقدیر اور معاملات جبر وقدر پر سوچتے ہوئے قدرت اور پھر خدا کی جانب سوچ کو لے کر جانے والا تھا کہ درمیان میں کھانے پینے کے ایک دو وقفوں کے بعد۔۔۔ نئی دنیا سے پرانی لیکن ہمیشہ چکا چوند مچانے والی دنیا یعنی فرانس پہنچ گیا۔ دنیا نے الٹی سیدھی کئی کروٹیں لیں، لیکن فرانس۔۔۔ فرانس رہا آرٹ اور کلچر کا ملک اور پھر جمہوریت کا ملک۔۔۔ مادر جمہوریت۔۔ انقلاب فرانس کا مُلک ۔ ڈیگال ایئر پورٹ نے اس کو پیرس میں لا پٹخا اور پیرس جہاں ایفل ٹاور ہے، کسی نے کیا خوب کہا ہے، پیرس کا شہر ایک ہمیشہ یکساں رہنے والی خاتونِ آہن (Iron Lady) کے قدموں میں پھلتا پھولتا، چمکتا دمکتا رہتا ہے اور اس کی گہما گہمیوں کے عین وسط سے دریائے سین (Seine) مستانہ تموّج سے بہتا رہتا ہے۔

اس نے پیرس کو اور پیرس نے اس کو اچھی طرح دیکھ رکھا تھا۔ پیرس نے اس کے لئے اپنی باہیں کھول دیں اور وہ پیرس سے بغل گیر ہو گیا۔

پیرس کے ان تمام مقامات سے اس کا کوئی لینا دینا نہ تھا جنکی زیارت کرنا سیاحوں اور پیرس میں قدم رکھنے والوں کے مقدس فرائض میں داخل تھا۔ اب اس کے لئے یہ بھی دلچسپی کی چیز نہ رہا تھا کہ ہیڈ رالک لفٹوں کی مدد سے ایفل ٹاور کی چوٹی تک جا پہنچے اور وہاں سے قریب قریب سارے شہر کو اپنی آنکھوں میں اتار لے۔ خاصے فاصلے پر ساکرے کیر (Sacre coeur) ٹروکا ڈیر (Troc Ader) بالکل سامنے دوسری جانب نوٹرے ڈیم (Notre Dame) اور دیہات جو مل جل کر شہر بناتے ہیں اور شہر کے بیچوں بیچ دریائے سین (Sein)۔۔۔ ایفل ٹاور کا سوچ کر وہ طنز سے مسکرایا۔ اس نے سوچا پسند۔۔۔ ناپسند۔۔۔ قدر۔۔۔ ناقدری کچھ بھی تو لائق اعتبار نہیں۔۔۔ دیر پا نہیں۔ اسی ایفل ٹاور کی تعمیر پر کتنی لے دے ہوئی تھی جب وہ 1889 میں کھڑا کیا گیا۔۔۔ آج پیرس کا سمبل ہے۔ سیاحوں کی دلچسپی کے مقامات میں چیمپ ڈی مارس (Champ de Mars) ہے بالکل نشیب میں عقبی جانب جو سترہ سو پینسٹھ عیسوی (1765) میں فوج کے نئے بھرتی شدہ جوانوں کا پریڈ گراؤنڈ ہوا کرتا تھا اور بعد میں بڑے بڑے انقلابی واقعات کا اور بین الاقوامی نمائشوں کا میدان بنا۔ اس سے کچھ فاصلے پر سنہری گنبد والا ہوٹل ڈی انویا لڈس (HOTAL DES INVALIDES) لوئی چہاردہم (Lovis Xiv) کے زمانے میں فوجی اسپتال تھا اور آج فوجی میوزیم اور نپولین کے مقبرے پر مشتمل ہے۔ فوج پریڈ گراؤنڈ، فوجی ہسپتالوں، فوجی میوزموں اور مشہور فوجی طالع آزما، فاتح عالم بننے کے خواب دیکھنے والے فرانسیسی ہیرو (جنرل) نپولین بونا پارٹے کے مقبرے سے بھی اسے سروکار نہ تھا البتہ اس مقبرے سے چند قدم کے فاصلے پر اٹھارہویں صدی کا قصرِ عالی شان ہوٹل بائرون (HOTEL BIRON) اس کے لئے ایک اہم زیارت گاہ تھی۔ اپنے معمول کے مطابق اب کی مرتبہ بھی وہ دو تین چکر ضرور لگانے والا تھا۔ ہوٹل بائرون مین روڈین میوزیم کو وہ کس طرح نظر انداز کر سکتا تھا اور ہوٹل بائرون سے اسکی عقیدت کس طرح کم ہو سکتی تھی جہاں دنیا کے اس منفرد اور عظیم مجسمہ ساز روڈین نے اپنی زندگی کے آخری برس گزارے۔ وہ تو اس باغ میں دیوانہ وار گھومتا پھرتا تھا جس کی فضا میں لیموں کے پیڑوں کی مخصوص مہک اور گلابوں کی خوشبو رچی رہتی ہے۔

اس کے ذہن میں یہ معاملہ کبھی بھی واضح نہیں ہو سکا کہ روڈین کے مجسمے لیموں کی مہک میں رچے ہوئے باغ کی فضا اور گلابوں کی خوشبو اس کو علیحدہ علیحدہ متاثر کرتے ہیں یا باہم مل جل کر۔۔۔ وہ یہ بھی سوچا کرتا کہ روڈین کے مجسموں کو دیکھنے والے اپنے حواس پر قابو کیسے رکھ لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مجسمہ سازی سے معمولی بھی شغف نہ رکھنے کے باوجود وہ روڈین کے ایک ایک مجسمے میں دیر تک کیا تلاش کرتا ہے؟ مجسمے کے خلاق روڈین کو یا روڈین کے خالق کو؟ ان احساسات کے بیچوں بیچ یہ احساس کیوں موجود رہتا ہے کہ ان مجسموں کے اندر شیطان اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ زندہ اور متحرک ہے۔ یہ کیوں لگتا ہے کہ ہر تخلیق کے عقب میں الہرمن یزداں کے ساتھ مہیش وشنوے ساتھ گتھم گتھا ہے۔

پیرس میں چین کا سانس لیتے ہی اس کی آنکھوں کے آگے پانی موج زن ہو گیا۔ تخلیق کا آغاز زمین پر نہیں بلکہ پانی پر ہوا تھا یا یوں کہئے پانی میں ہوا تھا۔ پانی کی لہروں میں زندگی کی توانائیاں کتنی صاف اور واضح دکھائی دیتی ہیں اور پھر ان کا سکوت موت کے کتنا قریب۔ ان ہی لہروں میں ''وہ'' دکھائی دی تھی۔۔۔ تیرتی ہوئی۔۔۔ بہتی ہوئی۔۔۔ ان پر چلتی ہوئی، تھرکتی ہوئی ناچتی ہوئی، اور پھر ان میں گم ہوتی ہوئی۔ اس کو ایک ہفتہ پیرس میں قیام کرنا تھا۔ اس امید موہوم پر کہ شاید اس کی کسی تصویر کو انعام کے لیے چن لیا جائے۔۔۔

شاید۔۔۔مقابلے کا نتیجہ ٹھیک ساتویں دن تھا۔۔۔اس دوران وہ ایک مرتبہ بھی اپنی اور دوسرے فن کاروں کی وہ تصاویر دیکھنے نہیں گیا جو مقابلے کے لئے رکھی گئی تھیں۔ان تمام مقامات سے بھی وہ گریز کرتا رہا جہاں سیاحوں کی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے۔جوئے کے بدنام زمانہ کلبوں سے دور رہا اور ان اڈّوں سے بھی جہاں شوقین مزاج لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے جاتے ہیں۔اس کیفے سے بھی دور جہاں سارتر اور کاموس جیسے دانشور کوفی پیا کرتے تھے۔ایسے تمام کیفوں، ریستورانوں پر تیسرے درجے کے فلمی ستاروں کا قبضہ رہتا۔نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عام قسم کے کیفوں میں کسی کونے کی میز پکڑتا اور بھانت بھانت کے کپڑوں میں ملبوس مردوں، عورتوں، لڑکوں، لڑکیوں کو دیکھتا اور جلد ہی اکتا کر باہر آ جاتا۔پیرس سے اگر آپ بور ہونا چاہیں تو بور بھی ہو سکتے ہیں۔وہ بھی بور ہو رہا تھا۔بوریت کو دور کرنے کے لئے۔گھٹیا پبوں (Pubs) کے کاؤنٹر پر گھٹیا شراب کے پیگ چڑھاتا۔پیرس خوشبوؤں اور شرابوں کا شہر ہے لیکن اس کی جیب میں اعلیٰ شرابوں کے لئے پیسے نہیں تھے اور سچ پوچھئے تو اس کا مزاج بھی اعلیٰ شرابوں کے لائق نہ تھا۔اس مزاجی کیفیت میں تو نفیس سے نفیس شراب پانی ہو جاتی ہے۔

پیرس یاترا کے پانچویں دن قبل از وقت وہ پانی کی جانب کھنچا چلا گیا اور موجوں کی مار کھانے میں شام کر دی۔اس رات خواب میں ''وہ'' آئی اور اپنے دیدار سے نواز گئی۔چھٹے دن کی صبح وہ اس کا سودا سر میں لے کر اٹھا اور ایک ناشتہ فروخت کرنے والے کیبن میں ناشتہ کر کے ونڈو شاپنگ کرنے نکل گیا۔چلتے چلتے نجانے کن کن سواریوں میں چڑھتا اُترتا ایک مرتبہ پھر کنارِ آب پہنچ گیا وہ دن جادو کا تھا یا سہ پہر طلسماتی تھی کہ اس کے کافی فاصلے پر ''وہ'' نظر آ گئی پانی کی موجوں پر حکمرانی کرتی ہوئی کوئی جل پری لیکن جل پری کا تو نچلا دھڑ مچھلی کا ہوتا ہے۔وہ دیکھتا رہا۔دیکھتے دیکھتے وہ آنکھ بن گیا۔سرتاپا آنکھ۔اس کی سوچیں جو دن اور رات کے چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہتیں اسے تنہا چھوڑ گئیں۔اس کے اینڈے بینڈے سوالات جو اس کے ذہن کو گھیرے رہتے تھے پانی کی ان چھوٹی بڑی موجوں میں گم ہو گئے جو اس کے بدن پر واری واری جا رہی تھیں۔اس کا اپنا کیا بنا؟ اوّل اوّل وہ آنکھ بن گیا تھا صرف آنکھ اور ''اس'' کو دیکھنے میں مصروف رہا تھا۔پھر شاید وہ دیکھ بھی نہ رہا تھا۔۔۔صرف تھا۔۔۔بعد میں وہ ''تھا'' بھی نہیں صرف ''وہ'' تھی۔

آرٹ کی بین الاقوامی تنظیم ''اِلگرو'' کی سہ سالہ تقریب حسبِ روایت پُر وقار تھی یہ دنیائے مصوری کی سب سے منفرد، معتبر اور نمائندہ تنظیم کا خاص اجتماع تھا جس میں وقت کے سب سے بڑے مصور کے نام کا اعلان ہونے جا رہا تھا۔ججوں کا پینل عصرِ موجود کے تمام بڑے نقّادوں پر مشتمل تھا۔فیصلے کا اعلان کرنے کے لیے ایک بزرگ خاتون کا انتخاب کیا گیا تھا جن کے خاندان نے فرانس کی قدیم ترین آرٹ گیلری کو اپنا مال و متاع اور اپنی زندگیاں دے دی تھیں۔۔۔اس تقریب کی ایک خاص بات یہ تھی کہ ججوں سے لے کر منتظمین اور حاضرین کے چہروں پر سنجیدگی اور سوگ طاری تھا۔نقّادوں کے پینل کے معمر ترین رُکن نے کھڑے ہو کر ہال میں طاری سکوت کو توڑا۔''جس مصور کے شاہکار کا آج انتخاب کیا گیا ہے اس کے پانچ فن پارے مقابلے میں شریک کئے گئے تھے۔میں مصنفوں کے پینل کے سب اراکین کی جانب سے اور خود اپنی جانب سے مختصر ترین اظہار کے طور پر یہ اعلان کرتا ہوں کہ پانچوں کے پانچوں فن پارے بلاشبہ دنیائے مصوّری کے شاہکار ہیں۔ان پر کسی بھی موجود یا قدیم مصّوری کے مکتبہ فن، تکنیک اور خیال کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔یہ قطعی طور پر مصّوری کے جدید ترین اور منفرد ترین نمونے ہیں۔ان پر تبصرہ نہیں کیا جا سکتا صرف ان کی تعریف کی جا سکتی ہے خاص طور پر ان میں سے ایک تصویر جس کا عنوان ''دخترِ آب'' ہے ایک ایسی لڑکی کی تصویر ہے جو پانی کی ایک موج بھی ہے اور لڑکی بھی۔۔۔ایسی تصویر بنائی نہیں جاتی بن جاتی ہے۔۔۔صدیوں میں کبھی کبھار۔ایسے مصور بھی صدیوں بلکہ ہزاروں برسوں میں جنم لیتے ہیں۔افسوس ہمارے دور کا یہ عظیم مصوّر۔۔۔کل کسی موج آب کی گود میں جا کر ہمیں افسردہ چھوڑ گیا۔میں آج کی مہمان خصوصی سے درخواست کرنے جا رہا ہوں کہ آج کی دنیا کے سب سے عظیم مصّور کے نام کا اعلان کریں۔براہِ کرم تالیاں نہ بجائیں صرف اپنی جگہ پر ساکت کھڑے ہو کر اس عظیم مصّور کو ایک منٹ کے سکوت کا نذرانہ پیش کریں''۔

نام کا اعلان ہوا۔اسی کا نام تھا۔لوگ ایک منٹ کے لیے خاموش کھڑے رہے۔بعد میں انتہائی پُر وقار انداز میں انعام کی ٹرافی اور رقم کا چیک اس کی بیوی نے وصول کیا۔ہال کے کسی گوشے میں کھڑے ہوئے مصّور کے لب حرکت میں آئے ''گھوڑی'' لیکن اس کے منہ پر ایک نرم و نازک ہاتھ کی نرم و نازک انگلی ثبت ہو گئی۔وہ ہاتھ اسی وجود کا ہاتھ تھا جو پانی پر رقص کرتے ہوئے مصّور کو بھی اپنے میں شریک کر چکا تھا۔وہ بلاشبہ ایک لڑکی کا وجود تھا۔

''مچھلی''

معروف شاعر، جناب سلاّم مچھلی شہری، علی گڑھ کے مشاعروں میں بہت جذبہ و جوش کے ساتھ شرکت فرماتے تھے، لیکن کلام پیش کرنے سے پہلے، علی گڑھ سے اپنے خلوص اور دیرینہ تعلقات کا اظہار بھی ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ ایک ایسے ہی مشاعرہ میں جب ان کو دعوتِ سخن دی گئی تو حسبِ عادت انہوں نے جذبات سے معمور الفاظ میں حاضرین سے خطاب شروع کر دیا۔سامعین اُن کے محبت بھرے الفاظ ہمہ تن گوش سن رہے تھے کہ انہوں نے فرمایا: ''میں جب بھی علی گڑھ آتا ہوں، اپنی روح میں جانے کیا شے تیرتی ہوئی محسوس کرتا ہوں''۔اس وقت حاضرین میں سے کسی نے با آواز بلند کہا: ''مچھلی''۔

''مہ و نجم کا رشتہ''

فاری شا

(راولپنڈی)

موجِ صدرنگ کے مندرجات، اسلوب، بیان ،اندازِ فکر طرزِ تغزل،اور روایات کے حدود میں رہتے ہوئے طبع زاد تخلیقی ندرت سے مالا مال ہیں ۔ اس میں کوئی شبہ ہی نہیں۔خدا کرے دوسرا مجموعہ جلد از جلد مرتب ہوجائے۔آپ کا مجموعہ میرے احباب میں گشت کر رہا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ آپ کی غزل نئے تفکر کی اشارہ نما ہے۔نئے تغزل کا اشاریہ ہے۔آپ نے موجِ صدرنگ کے دیباچے میں شعر کے مزاج کی نسبت جن خیالات کا اظہار کیا ہے میں اس سے سو فیصد متفق ہوں ۔اس مرتبہ کراچی تشریف لائیں تو ضرور مجھے شرفِ ملاقات بخشیں۔

رئیس امروہوی (●)

میں نے آپ کو بڑی محبت، انہماک،اور شوق سے پڑھا۔آپ امپریس کرنے کے لئے نہیں لکھتے۔ بلکہ آپ کے یہاں باریک سے باریک نکات بھی بڑے فطری،شفاف اور غیر ڈرامائی معمول سے نبھ جاتے ہیں جو واقعی بڑی بات ہے۔میری رائے میں اظہار و بیان کا ایسا ہی بالغ اور شور سے پاک انداز مستقبل میں ہمارے ادب کی محلیت کے اسباب کا موجب قرار پائیگا۔

جوگندر پال (دہلی،بھارت)

مجھے آپ کی غزل اور نظم دونوں میں بہت کچھ لطف اور ذہنی اور روحانی بالیدگی کا سامان ملا۔آپ نے اپنے وسیع مطالعے کو بھی اپنی شاعری میں جگہ جگہ سمویا ہے۔

شمس الرحمان فاروقی (الٰہ آباد،بھارت)

جناب عبداللہ جاوید ایک خوش خیال اور خوش گو شاعر ہیں۔انہیں غزل اور نظم پر یکساں قابو حاصل ہے۔ان کی آزاد نظموں میں غنائیت اور شعریت کے ساتھ ساتھ فکر بھی موجود ہے۔ان کی پابند نظموں میں تسلسل اور خیال کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ غزل سامانی بھی پوری طرح موجود ہے۔

ان کی غزل میں روایت کے احترام کے ساتھ ساتھ تازہ کاری کا ہر پہلو موجود ہے ۔ان کی غزل میں عہدِ حاضر کے سارے قرینے نظر آتے ہیں جیسا کہ انہوں نے خود کہا ہے۔

صنفِ محبوب غزل کا تو وتیرہ ہے یہی
ہر نئے دور میں یہ تازہ جوانی مانگے

ہر اچھا شاعر خواب ضرور دیکھتا ہے۔تعمیر کے خواب ،انسانیت کی بہبود کے خواب،عبداللہ جاوید نے بھی خواب دیکھے ہیں۔ان کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ حقیقت میں بھی خواب کے پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔

کہا بھی ہم نے کہ وہ آدمی ہے خواب نہیں
یہ دل غریب مگر خواب دیکھتا ہی رہا

ان کی شاعری میں غمِ عشق کے ساتھ ساتھ شعورِ ذات بھی ہے ، کائنات فہمی میں بھی اور ذات وصفاتِ الٰہی کی آگہی بھی۔کائنات،اپنی ذات، اور اپنے خدا سے رشتہ یہی تین عناصر ہیں جو حقیقی غزل کو جنم دیتے ہیں اور ایسے ہی شاعر کو یہ کہنے کا حق ہے کہ غزل کی صنف سمندر کی طرح وسیع ہے۔

ہم نے اس صنف کو پرکھا تو سمندر پایا
لوگ کہتے ہیں کہ دامانِ غزل تنگ بھی ہے

ابوالخیر کشفی (●)

میں شاعری بڑے شوق سے پڑھتا ہوں لیکن شاعری کے نقادوں کی طرح رائے نہیں دے سکتا۔کہ میں نے اسے کبھی اس نظر سے پڑھا ہی نہیں اور نہ ہی مجھ میں اتنی صلاحیت ہے کہ موزوں طبع ہونے کا دعویٰ کر سکوں۔لیکن جب کچھ اشعار دماغ سے گزرنے کے بعد دل کے کسی پوشیدہ گوشے میں داخل ہو جاتے ہیں اور پھر اس سے آگے روح میں اگر داخل نہ بھی ہو سکیں لیکن اس کے اردگرد منڈلانے لگیں ست رنگ تتلیوں کی طرح تو یقین جانئے Bliss کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور یہی کیفیت آپ کے مجموعے کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوئی۔آپ نے نہ جانے کتنی جگر سوزی سے یہ کلام تخلیق کیا ہوگا۔مجھے تو یہ عطیہ بے دام ہی مل گیا۔ازحد مسرت ہوئی اور بے حد ممنون بھی ہوں۔

دیوندر اسّر (دہلی،بھارت)

عبداللہ جاوید کی غزل زبان اور بیان کی یک جان روح ہے۔مجوزہ روح اُس قرار کے لیے سرگرداں ہے جو بے قراری کی ایک رواں دواں تمنا ہے۔اس تمنا میں وقت کے مدارج خود کو عصرِ حاضر میں پروتے ہیں۔یہی مدارج غزلِ جاوید کے انسلا کی عناصر ٹھہرتے ہیں کہ ان عناصر میں آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ان عناصر میں فرد کی ذات تنہا بھی ہے اور ایک جیتی جاگتی بزم بھی۔ان عناصر میں دسترس کا اعتبار بھی ہے اور قدرت کا عیار بھی۔ یوں جاوید اپنی کاوشات کامیاب بنانے میں سُرخ رُو ہے۔بہ الفاظ دگر غزل میں جاوید کی سرخ روئی، ہمارے عہد میں پائی جانے والی غزل کی سُرخ روئی ہے۔موجودہ غزل گو یوں کے اجتماع میں، جاوید کا مقام نمایاں بھی ہے اور نمائندہ بھی بلاشبہ، جاوید کا مقام غزل گوئی منفرد ہے۔

پروفیسر مامون ایمن (نیویارک)

عبداللہ جاوید کی بیس سالہ کاوشوں کا نچوڑ موجِ صد رنگ کی صورت میں ہمارے پیشِ نظر ہے۔ ساتھ ہی ان کے وہ مضامین بھی جو مختلف رسائل کی زینت بنے۔ ہمیں اس نظریئے کی تلاش ہے جو جاوید کا ایمان بن کر اس کے ان ادب پاروں کے تمام جھروکوں سے جھانک رہا ہے۔ جاوید نے شاید اپنی ان تخلیقات کو ذریعہ بنا کر ان قدروں کے پرچار کا بیڑہ اٹھایا ہے جو زندگی، احساس، شعور، وجدانِ فکر اور ان سب سے بڑھ کر انسان کی عظمت کی علمبردار ہیں۔ عبداللہ جاوید کے نزدیک فن کا معیار آفاقی اور اسے پرکھنے کے لئے کسوٹی انسان۔ وہ انسان جو بلا تخصیص خطہ، مذہب، زبان، رنگ اور نسل کے صرف سانس کی آتی جاتی دودھاری تلوار کی زد میں ہے۔

عبداللہ جاوید نے خود شاعری کی تعریف یوں کی ہے کہ ''میری رائے میں شاعری صنّاعی نہیں بلکہ خلاّقی ہے۔ خلاّقی کو خالص شعوری عمل سمجھنا قرینِ قیاس نہیں۔'' تنقیدی شعور کے اس درجے پر پہنچنے والے شاعر کے یہاں داخلیت اور خارجیت دونوں فکر و احساس کے بلند مرتبے ملنا کوئی مشکل نہیں۔ شاید اس لئے جاوید کے ہر تیسرے شعر میں یہ بات واضح نظر آتی ہے۔

انوار احمد زئی (حیدرآباد، سندھ)

یہ مجموعہ دیدہ زیب ہونے کے علاوہ قاری کو دعوتِ فکر و نظر بھی دیتا ہے۔ اس میں ایک بے چین روح اور متجسّس نگاہوں کی وارداتِ قلبی کو شعر کے پیکر میں ڈھال کر پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اس مجموعے کو آپ محض آپ بیتی بھی نہیں کہہ سکتے بلکہ شاعر نے دوسروں کے دکھوں کو اپنے دکھوں میں اس خوبصورتی سے سمویا ہے کہ ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنا بہت مشکل نظر آتا ہے اور یہی شاعری کا کمال ہے۔

مجموعے پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ وہ زندگی کے بعض دقیق حقائق کو اس آسانی سے بیان کر دیتے ہیں کہ سامنے کی باتیں معلوم ہوتی ہیں حالانکہ یہ بات دیکھنے میں جتنی آسان نظر آتی ہے اس کو برتنے میں اتنی ہی مشکل پیش آتی ہے دوسری اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے روایتی انداز پر شعر نہیں کہا بلکہ ان کی سوچ اور اس کے اظہار میں ایک جدّت اور اپج ہے وہ عام مشاہدے اور تجربے کو بھی اپنے اندازِ بیان سے ایک نیا روپ دے دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے اظہار بیان میں بھی بڑی بے باکی اور خلوص ہے اس لئے ان کا شعر آسانی سے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ تشبیہوں کے استعمال میں انہوں نے خاصے سلیقے اور خوش ذوقی کا مظاہرہ کیا ہے۔ بعض مقامات پر بالکل اچھوتی تشبیہوں کے ذریعے انہوں نے غیر مرئی احساسات کو ٹھوس حقیقتوں کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ مثلاً یادیوں دل میں کسی کی آئی روشنی جیسے نظر تک پہنچ یا یہ شعر۔

رات کے ساتھ مہ و انجم کا رشتہ ہے مگر
جیسے ظالم کا تعلق ہو مراعات کے ساتھ

جیسا کہ انہوں نے کتاب کے مقدمے میں کہا ہے کہ ان کا تعلق شاعری میں کسی خاص مکتبۂ فکر سے نہیں وہ شاعری کو آتش لکھنوی کی طرح صنّاعی بھی تصوّر نہیں کرتے۔ بلکہ بقول ان کے ''شاعری صنّاعی نہیں بلکہ خلاّقی ہے۔''

حسن عابدی (کراچی)

عبداللہ جاوید سینیئر لکھنے والے اور ایک درویش صفت انسان ہیں۔ ان کے تین شعری مجموعے چھپ چکے ہیں اس کے علاوہ ''بیادِ اقبال'' کے نام سے مضامین کا مجموعہ چھپ چکا ہے بچوں کے لئے دو کہانی کی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اخباروں میں ان کے کالم بھی چھپتے رہتے ہیں۔ تھوڑا لکھیں یا زیادہ لکھیں لیکن ان کی تحریر کا ایک معیار ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے جو کئی لکھنے والوں کو زندگی بھر نصیب نہیں ہو پاتی۔ '' بھاگتے لمحے'' عبداللہ جاوید کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں ان کے بیس افسانے شامل ہیں اصلاً عبداللہ جاوید کی افسانہ نگاری چالیس کی دہائی کے آخر میں شائع ہوئی تھی۔ اس دوران ان کے متعدد افسانے ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ لیکن اپنے بکھرے ہوئے کام کو سمیٹنے کا کام انہوں نے عمر کے اس حصے میں آ کر کیا ہے۔ اس مجموعے کا ہر افسانہ اہم ہے اور عبداللہ جاوید کی افسانہ نگاری کے فن پر گرفت کا مظہر ہے۔ تاہم ''میری بیوی'' اور ''آگہی کا سفر'' جیسے افسانوں کو ان کے فن کا کمال قرار دیا جا سکتا ہے۔

''بھاگتے لمحے'' میں تقسیمِ برّصغیر کے زمانے کے بعد کے انڈیا اور پاکستان اور آج کے کینیڈا تک کی زندگی سانس لیتی دکھائی دیتی ہے۔ یقین ہے کہ یہ مجموعہ اردو افسانے میں اپنی اہمیت کا احساس دلائے گا۔ خوشی کی بات ہوگی کہ عبداللہ جاوید اپنے باقی سارے، نئے پرانے افسانے بھی شائع کرائیں۔ اس طرح افسانہ نگاری میں ان کے ارتقائی سفر کو زیادہ بہتر طور پر دیکھا اور سمجھا جا سکے گا۔

حیدر قریشی (جرمنی)

عبداللہ جاوید کی شاعری نے آج کے بیشتر جدید شاعروں کی طرح روایت سے ایک Absurd بغاوت نہیں کی بلکہ روایت کو اپنا کر جدیدیت کا Back Drop بنایا ہے۔ ''موجِ صد رنگ''، حصارِ امکاں'' اور ''خواب سماں'' کی شاعری کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ عبداللہ جاوید صاحب آج کی دنیا کی Sensibility میں ڈوبے ہوئے ہیں مگر انھوں نے اس Sensibility میں روایت کا رنگ بھر رکھا ہے۔ اگرچہ کوئی شعر کسی موضوع کو سامنے رکھ کر نہیں لکھا جاتا ہے بلکہ ''اندھیرے'' میں تخلیق ہوتا ہے مگر جدید دور کے پیچیدہ مسائل اور ان سے پیدا ہونے والی محسوساتی اور جذباتی پیچیدگی کی نبض عبداللہ جاوید صاحب کے یہاں تقریباً ہر تخلیق میں چلتی ہوئی محسوس کی جا سکتی ہے۔

رضی مجتبیٰ (کراچی)

☆

مجلسِ چہارسو

والدِ محترم! افتادِ طبع اور حالات وواقعات کے زیرِ اثر روزِ اوّل سے مشکل پسند واقع ہوئے ہیں، اُن کی ایک عمر مشکلوں سے کھیلتے اور آسان کرتے گزری ہے۔ کبھی کبھی وہ دوسروں کو مشکل میں ڈال کر بھی محظوظ ہوا کرتے ہیں، سرِ دست آپ کے سامنے اک مثال اردو ادب کی اس ادنیٰ طالبہ کی ہے جسے پہلے ہی ہلّے میں، اعلیٰ ذوق اور بلند مرتبے کی حامل مہذب وشائستہ قلمکار کی روبرو کر کے امتحان سے دوچار کر دیا ہے۔ اوّل ہمیں اس امتحان میں پاس ہونے کی قطعاً امید نہیں، آپ کا حسنِ ذوق ہمیں رعایتی نمبروں سے پاس کر بھی دے تو اس کا تمام کریڈٹ محترمہ شہناز خانم عابدی صاحبہ کو جاتا ہے۔ شہناز صاحبہ نے جس محبت، شفقت اور خلوص سے ہمارے ناپختہ تنقیدی سوالوں کے جوابات جس تدبر اور دیانتداری سے دیے ہیں اس کے لیے یہ کم علم اور ادارہ چہارسو اُن کا تہہ دل سے ممنون ہے۔

عطیہ سکندر علی

☆ ہمارا پہلا سوال بہت ہی روایتی بلکہ گھسا پٹا یعنی خاندانی پس منظر اور بچپن کی یادوں سے جڑا ہوا ہے؟

☆☆ میرے اجداد کا تعلق بیتھوں شریف کے سیّدوں سے ہے۔ میرے دادا سید محمد مستقیم بہت اچھے مصوّر تھے، میرے والد سید اصغر علی عابدی بہت اچھا ستار بجاتے تھے۔ ان کا یہ فن صرف شوق کی حد تک تھا۔ میرے چچا سیّد علی شوکت عابدی شاعر تھے۔

بچپن اکلوتی اولاد کی طرح ناز نخروں سے گزرا۔ اب تو بچپن کی یادوں کے بجائے پوتے پوتیوں کے بچپن میں کھوئے ہوئے ہیں۔

☆ عبداللہ جاوید صاحب سے شادی کب اور کس طرح ہوئی نیز گھریلو زندگی کے علاوہ ادبی زندگی میں جاوید صاحب آپ کے لئے کس طرح معاون و مفید ثابت ہوئے؟

☆☆ عبداللہ جاوید صاحب سے میری شادی ۱۹۶۳ء میں ہوئی تھی۔ جاوید میری ذاتی زندگی میں، تعلیمی زندگی میں، گھریلو زندگی میں اور ادبی زندگی میں اس طرح جڑے رہے ہیں جیسے ایک مخلص دوست، ایک اچھا استاد اور بے حد چاہنے والا شوہر۔

☆ آپ کو اپنے تخلیقی وصف کا علم کب اور کس طرح ہوا اور اُس کے بعد آپ کا پہلا ردِعمل کیا تھا؟

☆☆ بچپن میں کہانیاں بہت پڑھا کرتی تھی۔ دل چاہتا تھا میں بھی کہانی لکھوں۔ کچھ کہانیاں لکھیں بھی صرف دوستوں کو سنانے کی حد تک۔ ادبی ماحول میں بڑی ہوئی۔ ہمارے چچا شاعر تھے، بزم ادب کے سیکرٹری تھے۔ شہر میں مشاعرے، گھر میں نشستیں، شاعروں، ادیبوں کا ہر وقت کا آنا جانا۔ ادبی جرائد بھی ہمارے گھر آتے تھے، وہ بھی پڑھتی رہتی تھی۔ بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ بچپن کے بچوں کی کہانیاں لکھنے کے شوق نے افسانوں کی جگہ لے لی۔

☆ پہلا افسانہ کب اور کس کی تحریک پر لکھا اور اشاعت کی صورت کیا بنی؟

☆☆ پہلا افسانہ بغیر کسی کی تحریک کے خود ہی اپنے شوق اور لگن سے لکھا تھا۔

☆ آپ ہومیوپیتھک معلم، پریکٹیشنر اور خاتونِ خانہ بھی ہیں۔ اس دوہری، تہری ذمہ داری کے بعد ادب کے لیے وقت کس طرح نکالتی ہیں؟

☆☆ فرصت تو مجھے آج بھی میسّر نہیں ہے۔ میں خود نہیں جانتی کہ مجھ سے افسانہ اپنے آپ کو کیسے لکھوا لیتا ہے۔

☆ ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک لفظ لکھنے کے لیے سو الفاظ کا مطالعہ ضروری ہے۔ آپ کے ہاں اس حوالے سے صورت حال کیا ہے؟

☆☆ پڑھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ پہلے بھی پڑھنے کے لئے جبراً وقت نکالنا پڑتا تھا اور اب بھی نکالنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ میرے رہبر عبداللہ جاوید ہیں۔

☆ شاعری کے لئے اگر احساس اور جذبات کی ضرورت ہوتی ہے تو کہانی یا افسانہ کے لیے ٹھوس مواد اور جواز کی ضرورت لازمی ہے۔ ایک خاتون خانہ اپنی کہانیوں کا مواد اور جواز کہاں اور کیسے تلاش کرتی ہے؟

☆☆ بے شک میں ''خاتونِ خانہ'' ہوں لیکن میرا ''خانہ'' ایک وسیع و عریض دنیا میں ہے اور اس وسیع وعریض دنیا میں آدمی اور خلقِ خدا آباد ہے۔ اپنی گھریلو اور خاندانی مصروفیات کے باوجود میرا دل، میرا ذہن، میری روح اس وسیع وعریض دنیا اور خلقِ خدا میں بھی لگے رہتے ہیں۔ آپ تو جانتی ہی ہیں، آپ خود ایک بڑے ادیب اور خاص طور پر فکشن نگار کی صاحبزادی ہیں، کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی مخلوق اپنی جگہ ایک علیحدہ دنیا ہے اور وجود رکھتی ہے۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں ان دنیاؤں میں داخل ہونے اور شامل ہونے کی صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں۔ تخلیق کار ایسے ہی ہوتے ہیں میں چھوٹے پیمانے پر ہی سہی ایک ایسی ہی لکھنے والی ہوں۔

☆ جب آپ کوئی نیا افسانہ، خاکہ یا مضمون لکھتی ہیں تو جاوید صاحب

سے یقیناً ڈسکس کرتی ہوں گی۔ جاوید صاحب کی تجاویز پر آپ کا ردِعمل کیا ہوتا ہے؟

☆☆ میں افسانہ لکھنے کے بعد جاوید سے ڈسکس بھی کرتی ہوں اور ان کی تجاویز پر عمل بھی کرتی ہوں۔ کبھی کبھی اختلاف کی صورت بھی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن وہ کبھی بھی مجھے مجبور نہیں کرتے کہ میں ان کے مشورے پر ضرور ہی عمل کروں۔

☆ جاوید صاحب کی رفاقت اور اعلیٰ ادبی ذوق نے بھی آپ کو شاعری کی طرف مائل نہیں کیا؟

☆☆ جہاں تک شاعری پڑھنے، سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا تعلق ہے اس میں جاوید کی رفاقت کا بہت دخل ہے۔ شعر کہنے کی مجھ میں صلاحیت نہیں ہے۔ اور میرا یہ خیال ہے کہ اگر کسی کام میں ٹیلنٹ نہیں ہے تو وہ کام آپ کو نہیں کرنا چاہیے۔ اور جاوید بھی اس ٹائپ کے نہیں ہیں کہ زبردستی کسی صلاحیت کے بغیر اپنی بیوی کو شاعرہ بنا دیں۔

☆ کل سے جڑے رہنے کی خواہش میں کون سا جذبہ کارفرما ہے نیز یہ کل گذرا ہوا ہے یا آنے والا؟

☆☆ میں تو آج میں بھی کل دیکھتی ہوں اور یہ دونوں قسم کے کل ہوتے ہیں ایک وہ جس کو ''دیروز'' اور ایک وہ جسے ''فردا'' کہتے ہیں اور چونکہ ''امروز'' میں ''دیروز'' اور ''فردا'' کا حصّہ ہوتا ہے تو بندہ خواہش کرے یا نہ کرے کل سے جڑا ہوتا ہے۔

☆ اپنے افسانے کو یقین کے ساتھ آج کا افسانہ کہنے والی تخلیق کار کس برتے یا یقین پر ایسا دعویٰ کرتی ہے؟

☆☆ میرے افسانوں کا لوکیل خواہ امریکہ یا کینیڈا سے تعلق رکھتا ہو خواہ پاکستان سے لیکن ہوتا ہے حقیقی زندگی کے بہت قریب اور اکثر و بیشتر عصرِ موجود سے ہم رشتہ۔ یوں قریب قریب ہر افسانہ آج کا افسانہ ہونے کا دعویدار ہوتا ہے۔ اس تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں بھی میرا آج، ماضی اور مستقبل دونوں زمانوں میں دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔

☆ ''میرا ہر افسانہ ایک جداگانہ موضوع ہی نہیں اسلوب اور تکنیک بھی رکھتا ہے'' اپنی ذات یا فن کی بابت اس قدر جامع رائے قاری پر اثر انداز ہونے کی کوشش تو نہیں؟

☆☆ ایسی کسی شعوری کوشش کی مرتکب نہیں ہوئی ہوں۔ البتہ یہ ضرور کہوں گی کہ اس کتاب گریز معاشرے میں ایسی کوئی کوشش باجواز سمجھی جانی چاہیے۔

☆ اس تاثر میں کہاں تک حقیقت ہے کہ آپ نے ورائٹی پیدا کرنے کے لیے افسانہ ''صحیح کمرہ'' تحریر کیا جو کہ آپ کے مزاج اور معیار سے قطعی مطابقت نہیں رکھتا؟

☆☆ زندگی مجھے جو کچھ دے رہی ہے وہ میرے افسانوں میں آتا جا رہا ہے اور آتا جائے گا۔ میں نے اپنے ذہن کے سارے دریچے کھلے رکھے ہیں۔ کسی دریچے سے ''صحیح کمرہ'' دکھائی دیا اور کاغذ پر اتر آیا۔

☆ آپ اور آپ کی آئندہ نسلوں کا مستقل مغرب سے جڑا ہونے کے باوجود آپ کے افسانوں کا سب سے طاقتور پہلو پاکستان ہے؟

☆☆ پاکستان میرا اور میرے بچوں کا وطن ہے ہم پاکستان کی مٹی سے اٹھے ہیں اور وہ مٹی اس مغربی ملک میں بھی اللہ نے چاہا تو نسل در نسل منتقل ہوتی چلی جائے گی۔ اس سے مراد ہرگز یہ نہیں لی جائے کہ ہم جہاں ہیں اس مٹی سے یکسر کٹے ہوئے اور لاتعلق ہیں۔

☆ مغرب کی عورت آزادی کی معراج کو چھو رہی ہے اس کے باوجود آپ کے افسانوں کا اہم موضوع عورت اور اُس کا عدم تحفظ کا احساس ہے؟

☆☆ میں نے مغرب کی عورت کو مشرقی عورت سے کم دکھی اور مظلوم نہیں پایا سچ پوچھئے تو مغرب کی عورت اور مشرقی عورت دونوں ہی عورت ہونے کے ناطے مرد فوقی (Man Dominating) سماج میں بڑی بہادری سے اپنے قدم جمائے کھڑی ہیں۔

☆ تیسری دنیا کی طبقاتی کشمکش آپ کے ہاں اُس طرح زیرِ بحث ہے جس طرح پسماندہ اور ترقی پزیر ممالک کے تخلیق کاروں میں ہوا کرتا ہے؟

☆☆ اس ضمن میں آپ کی رائے سے متفق ہوں۔

☆ Sex کے برتاؤ میں بھی آپ کھلی طور پر مشرقی تخلیق کار واقع ہوئی ہیں یہ عمل ارادی ہے یا غیر ارادی؟

☆☆ اس میں ارادے کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، میں جیسی ہوں ویسا ہی سوچتی اور لکھتی ہوں۔

☆ ایک خیال یہ ہے کہ آپ کا تخلیقی جوہر اور آپ کی افسانہ نگاری جاوید صاحب کی رفاقت کا شاخسانہ ہے؟

☆☆ عبداللہ جاوید صاحب سے ملاقات سے پہلے بھی میں افسانے لکھتی تھی بہت چھوٹی عمر سے لکھ رہی ہوں۔

☆ جبکہ دوسرا خیال یہ ہے کہ شہناز خانم عابدی ادب کا ایک تازہ رو اور تازہ کار پودہ ہے جسے عبداللہ جاوید جیسے گھنے ادبی شجر کے سائے میں پھلنے پھولنے کا موقع نہ مل سکا؟

☆☆ ہر کسی کی رائے میری نظر میں لائقِ احترام ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو ہم دونوں زندگی کی راہ میں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے مصروفِ سفر ہیں۔ کوئی کسی کی راہ میں حائل نہیں ہے۔

☆ کسی بھی سفر پر روانگی سے قبل منزل پر پہنچنے کی خواہش فطری امر ہے۔ اردو ادب سے وابستگی کا سفر کن خواہشات اور ترجیحات کا سفر ہے؟

☆☆ میں تو قدم قدم چلتے رہنے کی قائل ہوں۔ مقام اور منزل سے بے نیاز۔

''چراغِ رخِ زیبا''

شہناز خانم عابدی

پہلی جون ۲۰۱۱ ٹورانٹو (کینیڈا) میں صبح کے دس بج رہے تھے۔اور لاہور (پاکستان) میں شام کے سات بج رہے تھے۔میں نے منصورہ کو فون کیا، منصورہ کی ہمشیرہ نے فون اٹھایا اور بتایا کہ ان کو ہسپتال لے کر گئے ہیں ان کی طبیعت خراب ہے۔میں نے جاننے کی کوشش کی لیکن تفصیل نہیں معلوم ہو سکی۔میں نے ان کی ہمشیرہ کو بتایا کہ میں نے ان کو سالگرہ کی مبارکباد دینے کے لئے فون کیا تھا۔

جس پر وہ کہنے لگیں کہ میں انکو بتادوں گی وہ آپ کو فون کرلیں گی۔

دوسرے دن میں نے ان کی خیریت جاننے کے لئے فون کیا۔ان کی خادمہ نے فون اٹھایا اور بتایا کہ ابھی ڈاکٹر دوائیاں دے کر گئے ہیں اور انہوں نے سونے کی تاکید کی ہے اسی لئے میں ان کے کمرے سے باہر آ کر بات کر رہی ہوں۔میں نے خادمہ سے کہا جب وہ نیند سے جاگیں تو انہیں بتادیں کہ کینیڈا سے شہناز خانم عابدی کا فون آیا تھا۔فون کے بعد میں سوچنے لگی شاید منصورہ ایک مرتبہ پھر ڈیپریشن کا شکار ہوگئی ہیں۔۲۷ مئی ۲۰۱۱ کو ان سے میری کافی دیر تک بات ہوتی رہی تھی وہ اس وقت بالکل ہشاش بشاش لگ رہی تھیں۔انہوں نے خوشی خوشی اطلاع دی تھی کہ مجلّہ ''مونتاج'' کے پیکٹ سپردِ ڈاک کئے جارہے ہیں۔

۹ جون کو میں شکاگو چلی گئی۔وہاں سے ۱۲ جون کو مدیر سیپ نسیم درانی صاحب کو فون کیا تو دورانِ گفتگو انہوں نے بتایا کہ منصورہ احمد کا انتقال ہوگیا ہے۔مجھے یقین نہیں آیا۔ان سے یہ کہہ کر کہ میں آپ سے بعد میں بات کرتی ہوں، میں نے فوراً منصورہ کہ موبائل پر فون ملایا، گھنٹی بجتی رہی کسی نے نہیں اٹھایا، پھر میں نے ان کے گھر فون ملایا، گھر پر بھی کسی نے نہیں اٹھایا۔میری تشویش بڑھ گئی لیکن نسیم درانی صاحب کی بات پر دل یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔

۱۳ جون صبح ۶ بجے ٹورانٹو پہنچی اور وہاں اس افسوسناک سانحے کی تصدیق ہوگئی کہ مدیر مونتاج، مشہور شاعرہ، ادیبہ، افسانہ نگار اور نقاد منصورہ احمد بتاریخ ۸ جون ۲۰۱۱ بروز بدھ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئیں۔

دنیائے شعروادب کا یہ گوہر نایاب اپنے محبت کرنے والوں کو سوگوار چھوڑ کر منوں مٹی تلے گم ہوگیا۔

منصورہ احمد یکم جون ۱۹۵۸ء کو حافظ آباد میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد صاب ممتاز قانون دان مرزا حبیب احمد تھے۔منصورہ ۹ بہن بھائی ہیں۔منصورہ احمد بہنوں میں سب سے بڑی تھیں۔انہوں نے انٹر تک تعلیم حافظ آباد میں ہی حاصل کی۔۱۹۸۰ء میں لاہور کالج برائے خواتین سے گریجویشن کیا، اور لاہور کالج برائے خواتین سے ہی ۱۹۸۲ء میں انگریزی ادب میں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔منصورہ احمد کا پہلا شعری مجموعہ ''طلوع'' ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۹۸ء میں اسے وزیرِ اعظم ادبی انعام ایوارڈ ملا۔یوں بھی اہلِ قلم نے ''طلوع'' کی یادگار پذیرائی کی۔ان کا دوسرا شعری مجموعہ اشاعت کے لئے تیار تھا اس پر عبداللہ جاوید صاحب نے (میری زندگی کے ہمسفر) ''پیشِ کلام'' تحریر کرکے ۸ جون ۲۰۱۱ کو سپردِ ڈاک کیا تھا یہ نہ جانتے ہوئے کہ اسی دن منصورہ احمد نے اس دنیا سے اپنا ناتا توڑ لیا تھا۔افسوس۔۔۔صد افسوس۔

منصورہ احمد، احمد ندیم قاسمی کی منہ بولی بیٹی تھیں۔احمد ندیم قاسمی کے بیٹی پکارنے سے ایک بار پھر انہیں باپ کی محبت مل گئی تھی۔احمد ندیم قاسمی نے عبداللہ جاوید صاحب کے خطوط میں ایک سے زائد مرتبہ لکھا تھا کہ منصورہ بیٹی نے فنون کے سارے باہر کے کام اور خود ان کی ذاتی دیکھ بھال اا پنے ذمّے لے رکھی ہے۔منصورہ احمد ایک بااصول، پُراعتماد اور باہمّت شخصیت کی مالک تھیں۔لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ایک بہت حساس دل بھی رکھتی تھیں۔اور یہی وجہ ہے کہ احمد ندیم قاسمی صاحب کے جانے کے بعد انہیں جن پریشانیوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ اس سے نبرد آزما ہونے کے باوجود اندر سے ٹوٹ گئی تھیں۔

منصورہ احمد کے انتقال کے ایک ہفتے کے بعد میں نے گجرات فون کر کے ان کی بھابی سے افسوس کا اظہار کیا۔مسرت مجھے اچھی طرح جانتی تھیں۔اس سے پہلے جب منصورہ احمد کی طبیعت خراب ہوئی تھی تو وہ گجرات میں اپنے بھائی ڈاکٹر نصیر احمد کے گھر ہی رہ رہی تھیں۔اور اکثر ان کے منہ سے میں ان کا ہی نام سنتی تھی کہ بھائی کے پاس گجرات جارہی ہوں۔ان کی والدہ جو حیات ہیں اور الزائمر کے مرض میں مبتلا ہیں وہ بھی ان ہی کے پاس رہتی ہیں۔ان کی بھابی مسرت نے مجھے بتایا کہ احمد ندیم قاسمی صاحب کے انتقال کے بعد وہ سنبھل نہیں پائی۔پہلے ایک اٹیک ہوا، پھر دوسرا اٹیک ہوا، اور یہ تیسرا اٹیک آخر جان لیوا ثابت ہوا۔ایک جانب وہ صحت کے معاملے میں ان شدید مصائب اور آلام سے دوچار تھیں تو دوسری جانب ہر مرتبہ وہ فون پر یہ ظاہر کرتی رہتی تھیں جیسے وہ بالکل ٹھیک ہیں اور انہیں کچھ نہیں ہوا ہے۔وہ اپنے بارے میں بات چیت سے گریز کرتیں، ان کی آواز میں ایک بلند آہنگی ہوتی، ان کی گفتگو کا محور شعروادب ہوتا۔۔۔ان کی اپنی ذات نہ ہوتی۔احمد ندیم قاسمی نے اپنی زندگی ہی میں ''فنون'' پر ان کا نام دینا شروع کردیا تھا۔ان کی اس منہ بولی بیٹی نے اپنے آپ کو ''فنون'' اور مدیر فنون کے لئے وقف کر دیا تھا۔مدیر فنون اپنی شدید ضعیفی اور ضیق النفسی کی روز بروز بڑھتی ہوئی شکایت کے باعث اپنی اس منہ بولی بیٹی پر انحصار کرنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ان کی رفیقہ حیات کی وفات ہوچکی تھی۔اور ان کے سب اپنے، اپنی اپنی زندگیوں میں

الجھے ہوئے تھے۔منصورہ بیٹی نے اپنے منہ بولے بابا کو اپنے مرحوم والد کی یاد کا محور بنالیا تھا۔اپنے بابا احمد ندیم قاسمی کی رحلت کے فوراً بعد منصورہ نے اپنی زندگی اور ذات کے اندر کے خلا کو جو اس کے والد مرحوم کے نام تھا دگنی شدت سے محسوس کرنا شروع کیا۔اب اس میں بابا (احمد ندیم قاسمی) سے جدائی کی دل خراشی بھی شامل ہو گئی تھی۔میری زندگی کے ہمسفر عبداللہ جاوید نے اس صورت حال کو اپنی ایک انگریزی نظم میں سمویا جو ''مونتاج'' کی پہلی اشاعت میں شامل ہوئی۔یہ حقیقت ہے کہ نظم میں دیئے ہوئے message کے مطابق منصورہ نے اپنے آپ کو سنبھالا۔بابا۔۔۔رہبرِ جاوداں کے روپ میں اس کے ہمراہ تھے۔اور وہ زندگی کی شاہراہ پر ایک عزمِ صمیم کے ساتھ قدم بڑھانے لگی۔یہ اس کی ذاتی زندگی ہی نہیں بلکہ ادبی زندگی بھی تھی۔ہونا تو یہ تھا کہ اسے ''فنون'' جاری رکھنے دیا جاتا۔کیونکہ اس کے بابا احمد ندیم قاسمی اپنی زندگی ہی میں ''فنون'' اس کے سپرد کر چکے تھے لیکن حالات نے ایسا نہیں ہونے دیا۔

منصورہ احمد سے اس کے بابا احمد ندیم قاسمی ہمیشہ کے لئے جدا کر دیئے گئے اور مرحوم بابا کی یادگار مجلّہ 'فنون' کو بھی اس سے چھین لیا گیا۔وہ بلندیوں سے نیچے ڈیپریشن کی گہری کھائی میں گرنے لگی۔ناگہاں اس کے اندر سے ایک آواز ابھری ''منصورہ اٹھ اور 'فنون' کو ایک نیا جنم دے، نیا نام دے اور شعروادب کی گٹھڑی اٹھا کر اپنے سفر پر روانہ ہو جا۔میں، تیرا بابا اس گٹھڑی کو اٹھا کر چلتا رہا۔میں نے بھی پہلے 'نقوش' پھر 'فنون' جاری کیا۔تو بھی میری راہ اور میرے نقشِ قدم پر چل۔اس سفر میں تیرا رہبر اور رہنما میں ہی ہونگا۔'' منصورہ نے اس طرح ''مونتاج'' کو جنم دیا اور اس کی پیشانی پر اپنے بابا کا نام لکھا 'رہبرِ جاوداں' اس تمام دوران وہ مجھ سے ہمکلام رہی، 'مونتاج' کا اِجرا اور اس کی باقاعدہ اشاعت کا معاملہ آسان نہ تھا۔میں ان تمام مصائب سے واقف ہوں جن سے وہ دوچار ہوئی ان میں وہ مصائب وآلام جن کا تعلق 'درونِ جاں' سے تھا وہ ناقابلِ بیان ہیں۔اس کے بابا کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے اطراف و جوانب نے اپنی آنکھیں پھیر لیں اور پہلی بار اس نے اس کا ادراک کیا کہ وہ 'تنہا' رہ گئی ہے۔جب وہ 'طلوع' ہوئی تھی تو روشنی ہر جانب اس کے قدم چوم رہی تھی، اور اب جبکہ اس کے بابا کا جسمانی وجود اس کے ساتھ نہیں تھا تو چاروں اوور دھواں ہی دھواں تھا۔''طلوع کے بعد کی شاعری میں یہ دھواں وقت کے ایک مرحلے پر دیکھا جانے لگا تھا۔میں نے اس کی بابت جب بھی بات کی تو اس نے موضوع بدل دیا۔میں اس سے قبل بھی عرض کر چکی ہوں کہ منصورہ احمد آپ بیتی اور جگ بیتی کو اپنی باتوں میں گڈمڈ کر دینے کی عادی تھیں۔شاعری میں بھی وہ یہی کرتی تھیں۔''طلوع'' کے بعد کی شاعری میں تو ایسے مرحلے بار بار آتے ہیں۔کہ پڑھنے والا واضح طور پر کچھ سمجھ نہیں پاتا۔شاعرہ قاری کو ایک نیم روشن، نیم تاریک ماحول میں پہنچا کر خود کہیں گم ہو جاتی ہے۔

منصورہ احمد نے ''مونتاج'' 'فنون' کے نقشِ ثانی کے طور پر جاری تو کر دیا تھا لیکن اس کو جاری رکھنے میں بڑی دشواریاں حائل ہو رہی تھیں۔اس نے کاسہ بھی اٹھالیا اور ایسا کرنے میں اسنے اپنی خودداری کا بلیدان بھی دیا۔میں جانتی ہوں کہ یہ سب کچھ اس نے کتنی نفسیاتی کشاکش کے ساتھ کیا۔کلیجے پر سچ مچ پتھر رکھکر کیا۔وہ تھوڑی بہت کاروباری تو بن سکتی تھی لیکن ڈاک کے نرخوں کی بے رحمانہ بڑھوتری کے آگے اس کی فراست کھڑی نہ ہو سکی۔اسے جھکنا پڑا۔مجھے اچھی طرح یاد ہے اس نے 'مونتاج' کے لئے بطورِ تحفہ سال بھر کا پیکیج دینے کی اپیل کی تھی، وہ بے حد مطمئن تھی لیکن اس اپیل سے 'کوئی کام چلاؤ' نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔کاسہ تو اس نے اٹھالیا لیکن جس سمندر کے آگے گیا اس نے شبنم کی ایک آدھ بوند ٹپکانے پر اکتفا کیا۔اس نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے کاسے میں اتنا کچھ جمع کر لے گی کہ ''مونتاج'' کے اخراجات کے لئے ایک ٹرسٹ سا بن جائے۔اس کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔میں تو اس ضمن میں کبھی پُر امید نہ رہی تھی، لیکن اس کو باز رکھنے کے لئے میرے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔اس نے ہمت کبھی نہیں ہاری اسے یقین تھا کہ وہ 'مونتاج' کا بوجھ اٹھا کر اپنا سفر جاری رکھے گی۔اس کی زندگی کا ایک ہی محور تھا اور وہ تھا 'مونتاج'۔وہ اپنی ذاتی زندگی کے خواب دیکھتی بھی ہوگی تو ہر کسی سے چھپ چھپا کر۔۔۔۔۔منصورہ کو جب بھی ایک لڑکی کے طور پر چھیڑا، اس نے ٹال دیا۔میں چاہتی تھی وہ ازدواجی زندگی کی طرف قدم بڑھائے۔اس معاملے میں اس کی بہنیں پہلے ہی ہار چکی تھیں۔شاید بھائی اور بھابی بھی۔اس نے اپنی ذاتی خواہشات کو یوں لگتا ہے کسی آہنی صندوق میں تالا بند کر کے مہر ثبت کر چکی تھی۔ایک جانب یہ صورتِ حال تھی، دوسری جانب میرے کانوں میں گاہے گاہے اس کے بارے میں اس طرح کی خبریں نزول کرتی رہتی تھیں۔''منصورہ کے لئے موزوں رشتے کے لئے فلاں فلاں شاعر اور شاعرہ سرگرمِ عمل ہیں لاہور میں سلسلہ جنبانیاں ہو رہی ہیں تو نیویارک میں کوئی اونٹ کسی کروٹ بیٹھنے ہی والا ہے۔مجھ سے بہتر کون جانتا ہے کہ ان خبروں میں حقیقت کی کتنی رمق تھی یا بالکل ہی نہیں تھی۔۔۔۔۔عجیب لڑکی تھی یہ منصورہ احمد بھی اس کی ذاتی زندگی صرف اس کی ''امی'' کے ذکر تک محدود ہوا کرتی تھی۔وہ بھاگ بھاگ کر گجرات چلی جاتی تھی جہاں اس کی 'امی' دنیا و مافیہا سے لاتعلق لیٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ان کو یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا ہوگا کہ ان کی بیٹی منصورہ اس جیتی جاگتی دنیا کو چھوڑ کر اپنے والد اور بابا کے ملکِ عدم کی راہ لے چکی تھی۔جہاں سے کوئی لوٹ کر نہیں آتا۔

منصورہ ایک حساس دل کی مالک تھی، وہ رشتوں پر یقین رکھتی تھی۔خون کے رشتے، دوستی کے رشتے، محبت اور احترام کے رشتے، ادبی رشتے، منہ بولے رشتے۔انہوں نے ہر رشتے کو دل و جان سے نبھانے کی کوشش کی اگرچہ ان میں سے بعض رشتوں نے اسے شدید دکھ پہنچایا ہے۔اس نے 'طلوع' میں اثاثے کے تحت اپنے والد کے لئے اپنے گہرے جذبات کا اظہار کیا ہے۔اس نے اپنے والد کو ''میرے لکھی بابل'' ''میرے من موہن باپ'' کہہ کر

مخاطب کیا ہے۔وہ لکھتی ہے۔

'' میرے ان اثاثوں میں ایک چہرہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔بہت مہربان، شفیق ''سن تو لکھی بابل میرے'' کی جگمگ آنکھوں والا۔جس کی ٹھنڈی میٹھی گود بظاہر وقت نے مجھ سے چھین لی لیکن آج بھی میرے اندر بسی ہوئی ہے ۔زندگی کے راستے میں جب راستے گم ہونے لگتے ہیں تو یہی جگمگ آنکھیں میری رہنما بنتی ہیں ۔میرے لکھی بابل۔۔۔۔میرے من موہن باپ جنھوں نے اپنی تین سالہ بچی کے لئے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ بڑی ہوکر شاعری کرے گی ۔مجھے یاد ہے وہ ہمیں شام کو سیر کے لئے کھلی فضاؤں میں لے جاتے اور نہر کے کنارے سب کو بٹھا کر کہتے اب ہماری بیٹی ہمیں اپنی نئی نظم سنائے گی۔سبزہ، کھلا آسمان ، اور ابا کا محبت پاش چہرہ۔۔۔۔میرے احساس کو نجانے کون سی کہکشاؤں میں لے جاتے ۔یہ میرے تخیل کی پہلی پرواز تھی۔وہ نامور ادیب نہیں تھے لیکن ان کی پوری زندگی ادبِ عالیہ تھی ۔انہوں نے مجھے ''نہیں'' کہنا سکھایا۔اور انحراف کی سزاؤں پر نہ پچھتانے کا حوصلہ بھی دیا۔میری ذات اور شاعری میں اگر کوئی باطنی قوت ہے تو اس کی بنیاد خون میں گردش کرتی ہوئی میرے والد کی آہنی شخصیت نے رکھی۔

والد کے بعد وہ احمد ندیم قاسمی کو اپنا منہ بولا باپ کہتی تھیں اور بابا کہہ کر پکارتی تھیں۔''طلوع'' کے بعد کی شاعری میں بابا (احمد ندیم قاسمی) کے جانے کا المیہ ہی پیشِ منظر میں ہے۔وہ مرحوم بابا کو یاد کر کے ملول سے ملول اور تنہا سے تنہا ہوتی جاتی ہے۔بلکہ ان کو یاد کر کے بڑے دکھ سے یہ انکشاف یا اعتراف کرتی ہے کہ اس کے بابا نے اس کو جن اصولوں، آدرشوں، اور اقدار کی بھٹی میں تپا کر کندن بنایا تھا وہ سب اپنے اعتبار اور وقار کا سونا گنوا کر کھوٹے سکّوں کی مثال ہو چکے ہیں۔

گلزار جی سے بھی ان کا محبت اور احترام کا رشتہ تھا۔انہوں نے گلزار جی کے لئے دو نظمیں بھی کہی ہیں۔تقریباً ڈیڑھ سال پہلے جب وہ دوسرے ایٹک سے باہر آئی تھیں گلزار جی کے بارے میں میں نے کوئی بات کی تو انہوں نے بہت اداس لہجے میں کہا تھا ''میری اب گلزار جی سے بات نہیں ہوتی ہے۔'' اس کے بعد نہ میں نے ان سے کچھ پوچھا اور نہ ہی انہوں نے کچھ بتایا۔

منصورہ احمد نے اپنے تمام رشتوں کو اپنی حد تک پورے خلوص سے نبھایا۔انہوں نے صفِ اوّل کے شاعروں اور شاعرات کے درمیان اپنی انفرادیت بنائے رکھی ہے۔منصورہ احمد کی شاعری کے بارے میں کچھ لکھنے سے قاصر ہوں۔ان سے جو میرا محبت کا رشتہ ہے وہ میرے قلم کو روک رہا ہے۔البتہ میں یہ ضرور کہوں گی منصورہ احمد خاتون شاعرہ ہونے کے ساتھ خواتین کی شاعرہ بھی تھیں۔ان کی شاعری میں کابل کی گل بی بی گل جاناں ہے جس کو جرگے نے سنگ زنی کی سزا سنائی تھی اور پہلا پتھر جرگے کے سرپنچ نے ہی مارا تھا۔منصورہ کی منظومات میں تین نظمیں بے نظیر کے لئے ملتی ہیں۔اس کے علاوہ دو شاعرات کا نہایت محبت اور خلوص سے تذکرہ ملتا ہے۔ساتویں صدی قبل مسیح کی شاعرہ سافو اور ہندوستان کی سب سے بڑی اور مشہور و مقبول شاعرہ میرا ہے ان شاعرات کے علاوہ ارون دھتی رائے بھی منصورہ کے کلام میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ منصورہ عورتوں کے حقوق کی کس حد تک پاسدار اور علمبردار تھی۔

میرا خیال ہے اب مجھے منصورہ کی شاعری کی جانب رجوع کرنا چاہئے۔اس کی زندگی میں اس کے والد (لکھی بابل) کے بعد رہبر جاوداں احمد ندیم قاسمی (جن کو وہ بابا کہتی تھی) کی شخصیت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔زندگی کے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر وہ ان ہی کی جانب رجوع ہوتی رہتی ہے۔اسنے شاید اس حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کیا کہ وہ زندگی کے سفر میں اس کا ساتھ چھوڑ کر راہی ملکِ عدم ہو گئے تھے۔درجِ ذیل نظم میں وہ احمد ندیم قاسمی سے مخاطب ہے۔آپ بھی سن لیجئے (یا پڑھ لیجئے۔)

سنو بابا!

سنو بابا! رتمہارے پاس سب سکے پرانے ہیں رنئے بازار میں ان کی کوئی قیمت نہیں رکوئی متروک سکے لے کے جب بازار جاتا ہے رتو خالی ہاتھ آتا ہے رتمہارا دوش یہ ہے کہ تم ابھی تک رحسن کی تخلیق کو کافی سمجھتے ہو رید انداز اب پرانا ہو گیا ہے رنیا انداز تو فن کے بنا تشہیرِ فن ہے۔

سنو یہ لمحہ تردید ہے رد و نفی ہے راس کے کچھ آداب تو سیکھو ریہ جتنی حوصلہ افزائیاں کرتے رہے ہو راہلِ فن کی رو ہ سب ماضی کا قصہ تھیں رو ہ ماضی جس کا مستقبل نہیں ہے رنئی تنقید کے اسلوب میں سب کے لئے لکھو رکہ وہ جہلِ مرکب، ننگِ دیں رننگِ وطن اور روسیاہ ہیں ریہ لکھتے ہی تمہارا قد فلک سے جا لگے گا رتو پھر اب کیا ارادہ ہے؟ رتمہیں اصرار ہے سکّے پرانے ساتھ رکھنے پر! رتو پھر آنسو تو پونچھو رجو تمہاری روح تک کو بھی بھگوئے دے رہے ہیں ریہ کن رشتوں کی یادیں تم کو اتنا خوں رلاتی ہیں؟ رو ہ رشتے جو تمہارے ذہن میں پیدا ہوئے راور مر گئے تھے رجو رشتے ٹوٹ جاتے ہیں رو ہ بے بنیاد کی دیوار ہوتے ہیں رجو ہاتھوں کے سہارے پر رکی رہتی ہے راور جب ہاتھ تھک جائیں تو اوپر آن گرتی ہے رآیئے اب میرا سے ملتے ہیں۔

مجھے میرا ملی تھی ندی کے تٹ پہ اِکتارا اٹھائے رمجھے میرا ملی تھی ر
بہت تشویش سے یہ کہہ رہی تھی رسنو! رانسان کے حلقوم میں نیلاہٹیں اچھی نہیں ہوتیں رسفر یہ دھوپ چھاؤں، شہر گاؤں کا ر بدن میں زہر کا دریا اٹھائے ر
بڑی مشکل سے کٹتا ہے رچلو اب مسکرا دو ریہی دیکھو رتمہاری آنکھ کی انتھک اداسی ر
مجھ کو صدیوں کی مسافت سے ر یہاں تک کھینچ لائی ہے رمیں کہتی ہوں رمگر میرا! یہ نیلا رنگ تو جنموں کا ساتھی ہے ر یہ ان سب دوستوں کی اِک امانت ہے رجنھوں نے ایک ہی دن رمجھ سے اور میرے عدو سے رعہد باندھا تھا۔

سوالوں کو جوابوں تک کوئی رستہ نہیں ملتا رتو ساری حیرتیں سکتے میں ڈھلتی ہیں ر یونہی پھر آنکھ کی پتلی سے رد ل کے برف زاروں تک ر یہ نیلا خون جمتا

باقی صفحہ ۱۲۲ پر ملاحظہ فرمایئے

شبنمی اسلوب کی افسانہ نگار

تسلیم الٰہی زلفی

(کینیڈا)

بیسویں صدی کا نصف آخر ادبی، سیاسی اور سماجی لحاظ سے تیزی سے بدلتے رجحانات اور اہم مثبت و منفی تبدیلیوں کا زمانہ ہے۔ ادبی تاریخ میں جدید روایت کے استحکام اور اس کے تھیسس اور اینٹی تھیسس کے طور پر ابھرنے والی مختلف تحریکوں کا دور ہے۔ ان میں سے خاص طور پر ترقی پسند تحریک، حلقۂ اربابِ ذوق کی تحریک اور ان دونوں کے امتزاج سے جدیدیت کی تحریک نے اردو ادب کو بہت سے نئے زاویوں اور اسلوبی روّیوں سے آشنا کیا ہے۔ سن ستّر کی دھائی میں بہت سے نئے لکھنے والوں کی تربیت کی ہے۔ جن میں، شبنمی اسلوب کی لطافت، فلسفے کے مسائل، روح کے اسرار، جذبے اور فکر کو ہم آہنگ کرنے والی افسانہ نگار شہناز خانم عابدی بھی نمایاں طور پر شامل ہیں۔ سیاسی سطح پر برِّ صغیر اور برِّ صغیر سے آگے نکل کر پورے گلوب پر یہ عرصہ انسانی مظلومی اور ناکامیوں کی کئی داستانیں سمیٹے ہوئے ہے۔ اسی عرصے میں انسانی شعور کی بہت سی کامیابیاں بھی تاریخ کا حصّہ بنی ہیں۔ جنگ، امن، سرمایہ دارانہ نظام کا استحکام اور اپنے ہی ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ، نو آبادیوں کی آزادی اور پھر اب ان ہی ملکوں کو نئے طریقوں سے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے نو آبادی بنانے کا عمل۔ جس کی تازہ ترین مثال افغانستان، تونس، الجزائر، مصر، یمن، اردن، ایران اور بحرین ہیں۔ اور اب ایک بار پھر باقی ماندہ پاکستان نشانے پر ہے۔ تیسری دنیا کے بیشتر ممالک میں جمہوریت اور انصاف کی جدوجہد وہ اہم موضوع ہیں جن سے آج کی دنیا اور دنیا کے حوالے سے آج کا فنکار دوچار ہے۔ شہناز خانم عابدی کے افسانوں کا سب سے زیادہ اہم موضوع ''پاکستان'' ہے۔ پاکستان کے بعد ان کا دوسرا موضوع ''عورت'' ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ''زندگی'' کے مثبت پہلوؤں کی عکاسی بھی جذبۂ رجائیت کے ساتھ کی ہے۔ شہناز خانم عابدی کے تمام افسانوں کے واقعات، کردار اور رجحانات، اس نئے شعور کی بھی خبر دیتے ہیں جو تمام رکاوٹوں کے باوجود آہستہ آہستہ اپنے قدم جماتا نئے خوابوں کی بنت کر رہا ہے۔ اس نئے شعور کا ایک اہم باب نئے اقتصادی اور سماجی حوالوں میں انسان کی دریافتِ نو ہے۔ انسان کی دریافت کا یہ عمل یوں تو صدیوں سے جاری ہے اور ہر دور کے فنکاروں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ انسان کی غایت کیا ہے اور ایک سماجی حیوان ہونے کے ناطے ایک بہتر سماج کی تعمیر کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن شہناز خانم عابدی نے اپنے شعور کی بلوغت سے اس سوال کی نوعیت بدل دی ہے۔ سائنسی دریافتوں سے پہلے کا انسان ان سوالوں کی گنجلک راہوں پر چلتا ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا تھا جو اس کے عقیدوں اور توہّمات سے وجود میں آتی تھی، یہ دراصل زمین اور زمین کی حقیقتوں سے ماوراء ہو کر نفیِ ذات کا عمل تھا۔ شہناز خانم عابدی نے شعور کے نئے دروازے کھولے ہیں اور بہت سے پرانے روّیوں کو نئی معنویت سے آشنا کرنے کی ضرورت کا احساس دلایا ہے، ایک طرف اگر تسخیرِ کائنات کے سلسلے میں انسانی بالادستی کا احساس ابھرتا ہے، تو دوسری طرف انسانی مظلومیت، چھوٹی قوموں کے مقدّر پر بڑی قوموں کی بالادستی اور طبقاتی سماج میں انسانی بے وقعتی کا احساس بھی جنم لیتا ہے۔ یہ سارے متصادم احساس، شہناز کی اُس نئی حسیّت کی اساس ہیں جن سے ان کے ہر نئے افسانے کا خمیر اٹھتا ہے۔ شہناز خانم عابدی کی یہ حسیّت اور سچائی کلاسیکی طرزِ فکر سے بہت مختلف ہے۔ کلاسیکی طرزِ احساس میں یہ سچائی ایک خاص مابعد الطبیعاتی پس منظر میں اپنی پہچان کراتی تھی۔ لیکن شہناز کے جدید سیاق و سباق میں اس کے معنی زمین اور معاشرے کے طبیعاتی پس منظر میں متعین ہو رہے ہیں۔ شہناز خانم عابدی کے افسانوں میں یہ معنویت اور حسیّت اُس شعور کا حصّہ ہے جس سے نیا شعری تناظر وجود میں آیا ہے۔ سوال یہ بھی کرتی ہیں، لیکن ان کا سوال سچائی کے انسان کے روپ میں مجسّم ہونے کے عمل سے عبارت ہے۔ جو انسان کے حوالے سے معاشرے اور اس کی طبقاتی اونچ نیچ، رنگ و نسل کے مسائل، موت جو کبھی جنگ اور کبھی آمریت کے تشدّد کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ کہانی نویس کے خواب اور تمنّائیں تو ہمیشہ اس وار کو سہتی اور شیو کی طرح اس زہر کو اپنے اندر سمو کر امرت بناتی رہتی ہیں۔ زہر کو امرت بنانے کا عمل ہی وہ مقام ہے جہاں بڑا فن وجود میں آتا ہے۔ ایسا فن جہاں کائنات اور انسان کے نئے رشتوں کو وجود میں لاتا ہے وہاں معاشرے کو بھی ایک نئے خواب، نئی تمنّا سے آشنا کرتا ہے۔ اور یہ خواب اور تمنّا کا رشتہ ہی ''خواب کا رشتہ'' کہلاتا ہے۔

''خواب کا رشتہ'' شہناز خانم عابدی کے (۱۷) افسانوں کا اوّلین مجموعہ ہے جسے اکادمی بازیافت کراچی نے نہایت سلیقے اور اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے اپنی تمہیدی سطور میں عرض کیا ہے کہ شہناز کے لیے سب سے زیادہ اہم پاکستان اور اس کے مسائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میں بھی، اسی تناظر میں لکھے گئے اپنے افسانے ''مکافات'' کو اوّلیت دی ہے۔ پاکستان میں سیلاب کا مسئلہ قریباً ہر سال کا مسئلہ ہے اور اس کی تباہ کاریوں کے معمول کے صرف دیہات اور اس کے باسی ہیں۔ سیلاب یوں تو یکے از آفاتِ قدرتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہر سال پاکستان کے مختلف مقامات میں اٹھائے جانے والے وہ اقدامات جن کا تعلق مقتدر طبقے سے اور ان سے ساز باز کرنے والے عمّالِ حکومت سے ہے۔ ان میں سب سے قابلِ اعتراض، دریاؤں

اور نہروں کے بہاؤ کا رخ بدلنے کے لیے چھوٹے اور اوسط درجے کی بندوں کو توڑ کر سیلاب کے ریلے کو نچلے اور اوسط طبقے کے رہائشی اور زراعتی علاقوں کی جانب ڈھکیل دینا ہے۔ اِس موضوع پر افسانوں کی کمی نہیں لیکن ''مکافات'' کے ایک کردار کا روّیہ شاید ہی کسی اور افسانے میں ملے۔ یہ روّیہ بہ یک وقت مثالی بھی ہے اور بے مثال بھی۔ جو قاری کو اپنے آپ کو نیکی اور بدی' انصاف اور ناانصافی' صداقت اور توہم' اچھی اور بری زندگی کے بارے میں سوال کرنے پر اکساتا ہے' نئے امکانات کا احساس دلاتا ہے اور تہذیبی بحران اور صنعتی معاشرے میں ڈوبنے والے انسان کی باطنی سرشت کو زبان دیتا نظر آتا ہے۔

آیئے آپ کو ''مکافات'' کا قیامت خیز پیراگراف پڑھواتے ہیں۔

''اس کے فوراً بعد قیامت سے پہلے ایک اور قیامتِ صغریٰ آ کھڑی ہوئی۔ صنعتی علاقے اور خاص طور پر سیٹھ حشمت کی ملوں اور فیکٹری کو بچانے کی خاطر' پاکستان کی معیشت کو ترجیح دیتے ہوئے اللہ دینو کینال پر چھوٹے نواب کے نام پر تعمیر شدہ قدیمی بند علی مراد تواڑا جا چکا تھا' پلک جھپکتے ہی شہر' بڑے گاؤں' بے شمار نام والے اور بے نام دیہات زیرِ آب آ چکے تھے۔ خلقِ خدا' آدمی' مویشی' کھیت' کھلیان' کچے کوٹھے' پکے کوٹھے' سب غرق ہو گئے۔ ملک کے غریب عوام سے ایک مرتبہ پھر جان و مال کا جبری نذرانہ وصول کیا جا چکا تھا۔ سب کچھ روایات' ریتی رواج اور معمول کے مطابق انجام دیا جا چکا تھا''۔

اسی طرح افسانہ ''فیصلہ'' بھی پاکستان اور پاکستان کے جیسے پس ماندہ یا ترقی پذیر ملکوں کا ایک خطرناک مسئلہ ہے۔ ایسے ملکوں سے Ambitions ماڈی ترقی کے لیے کوشاں ملازمانِ سرکار کو تربیت اور دیگر مقاصد کے لیے ترقی یافتہ ممالک سے بلوایا جاتا ہے۔ ان میں سے چند کو ایسے تجربات سے گزروایا جاتا ہے جن کا افشا ہو جانا ان کے لیے زبردست رسوائی کا باعث بنے۔ پاکستان واپسی پر بڑی طاقتوں کے اثر و رسوخ سے ان کو ترقی دلوا کر کلیدی عہدوں تک ترقی دی جاتی ہے۔ بالآخر ان کو بلیک میل کر کے ملکی سلامتی کے خلاف کام لیے جاتے ہیں۔ ''فیصلہ'' کا مرکزی کردار اس طرح کے ایک کام سے انکار کر دیتا ہے اور اپنی اس وطن دوستی کی بے حد گراں قیمت چکاتا ہے۔ افسانہ ''فیصلہ'' کا فیصلہ کن اختتامیہ ملاحظہ فرمایئے:

''میں ان نام نہاد مہربانوں سے مزید مہربانی نہیں طلب کروں گا۔۔ میں بلیک میل نہیں ہوں گا۔ ان ظالموں نے گویا مجھے لمبی رسّی سے باندھا ہوا تھا۔ پھر غائبانہ نوازشات کی بارش کر دی تھی۔ ایک دن' دو دن نہیں۔۔ سال ہا سال۔۔ میری صورت میں ایک فصل اگائی تھی اور اب وہ اسے کاٹنا چاہتے تھے۔ میرے ایک جانب زبردست رسوائی تھی تو دوسری جانب میرے اپنے ملک کا نقصانِ عظیم۔ صبح کے سورج نے مجھ سے کہا ''تیری پہلی ترجیح تیرا وطن ہے''۔

افسانہ ''بدا کرنا جو تھا'' بھی پاکستان کی صورتِ حال کا عکاس ہونے کے ساتھ ایک بڑے قومی و ملکی سانحے بے نظیر بھٹو کی شہادت اور ایک خاندان میں منعقدہ شادی کے دولھا میاں کے قتل کے سانحے سے متعلق ہے۔ اس میں دونوں سانحات اور دونوں مرکزی کرداروں کو انتہائی فنکارانہ چابکدستی سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اس پُراثر افسانے کا اختتامیہ ہم آپ کو پڑھواتے ہیں:

''ایک بار پھر میری روتی آنکھوں کے سامنے حنا بھابی کا ٹی وی اسکرین تھا۔ یاسر بھائی' میرے اپنے بھائی اپنی آئیڈیل خاتون لیڈر کے شانہ بہ شانہ کھڑے تھے۔ جس وقت بینظیر لیاقت باغ راول پنڈی میں آخری بار اپنے پرستاروں سے مخاطب ہو کر شہید ہونے جا رہی تھیں' یاسر بھائی کراچی کے ایک اسپتال میں ایمرجنسی کو اٹینڈ کرنے کے لیے داخل ہوتے ہوئے' ہمارے والد علی حیدر شہید کے راستے پر چلتے ہوئے' شہید ہو کر' کراچی سے لیاقت باغ راول پنڈی پہنچے ہوئے تھے۔ میں دیکھ رہی تھی یا مجھے دکھایا جا رہا تھا۔ گھر پہنچ کر یہ سب میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ میں اٹھی اور امی کی جانب چلی گئی۔ مجھے ان سے مل کر ان کے بیٹے' اپنے بھائی اور دلہن بھابی شائزہ کے دولہا کو بدا کرنا جو تھا۔''۔

اسی کتاب میں شہناز خانم عابدی کا ایک اور خوبصورت افسانہ ''رانی'' ہے۔ جس کا لوکیل لاڑکانہ (پاکستان) ہے اور پلاٹ کا محور لاڑکانہ کی ایک قدیم روایت چاندنی کی دیوی (پونم دیوی) کے گرد گھومتا ہے' جو امر ہے اور ہر دور میں کسی عورت کے اندر حلول ہو کر اپنا ظہور کرتی ہے۔ افسانہ نگار نے اس کو اساطیری فضاء سے مربوط کرنے کے ساتھ بطور ایک سانحہ فکشن کرافٹ کی تمام تر صناعی کے ساتھ ''رانی'' کے کردار کی مدد سے پیش کیا ہے۔ آیئے اس خوبصورت بنت کے کامیاب افسانے کا ایک اقتباس دیکھتے ہیں:

''وہ تھوڑی دیر تک کشمکش میں مبتلا رہی لیکن بیٹی کی محبت غالب آ گئی اور وہ ہمت کر کے اوپر چلی گئی۔ اس نے دیکھا پونم دیوی ایک اونچی اور بہت شان دار کرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں' سفید رنگ کی ساڑھی میں ملبوس' مانگ میں سیندور' ماتھے پر بندیا' آنکھوں میں کاجل' گلے میں ہیروں کا جگمگاتا نیکلس' کانوں میں ہیرے کے ٹاپس' انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں۔ ان کے سامنے بہت سارے لوگ ہاتھ جوڑے بیٹھے تھے' جیسے پوجا کر رہے ہوں۔ لالی کو ایسا لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ پھر اس نے دیکھا لوگ ایک ایک کر کے اٹھ رہے ہیں اور ڈاکٹر پونم کی آرتی اتار رہے ہیں۔ اس کی نظر رانی پر پڑی جو پونم دیوی کی کرسی سے لگی بیٹھی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ گئی' رانی کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر دروازے تک آ گئی۔ عجیب بات ہوئی کہ کسی نے لالی کو کچھ نہ کہا' اور ماں کے ساتھ باہر آ گئی۔ باہر آ کر لالی نے بھی رانی سے کچھ نہ کہا۔ وہ جانتی تھی' اس کو کچھ کہنا یا مارنا پیٹنا بے کار ہوگا۔ لالی نے کھانا بھی نہیں کھایا' دونوں ماں بیٹی بھوکے سو گئے''۔

ایسے ہی افسانہ ''سیٹھ'' پاکستان کے زوال پذیر معاشرے اور

مقتدر طبقے کی جانب سے عوام کے استحصال کا عکاس ہے۔اس افسانے کا بھی ایک اقتباس آپ کی قرآت کے لیے پیش ہے:

''رمضان نہیں سمجھ سکا' لیکن لالی سمجھ گئی کہ سیٹھ نے کیوں بلایا ہے۔وہ جانتی تھی کوئی بھی لڑکی ان کی برادری میں' جو خوب صورت ہو' اگر سیٹھ یا اس کے آدمیوں کی نظر میں آ گئی' سیٹھ فوراً اس سے شادی کر لیتا ہے۔لڑکی کے عوض تھوڑی سی رقم ماں باپ کو دے دیتا ہے۔پھر ساری زندگی لڑکی کا کچھ پتا نہیں چلتا۔تین سال پہلے کی بات ہے عرفان کی بیٹی شمو کو مانگا تھا۔عرفان نے انکار کیا تو سیٹھ کے غنڈے لڑکی کو اٹھا کر لے گئے تھے۔اور عرفان کو اتنا مارا کہ وہ پلنگ سے لگ گیا اور چھ مہینے میں ختم ہو گیا۔شمو کا آج تک کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں ہے؟ کیسی ہے؟ برادری کے سب لوگ واقف تھے' لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ سیٹھ کے آگے اپنی زبان کھول سکے''۔

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے کہ شہناز خانم عابدی کے افسانوں کا انتخاب ''خواب کا رشتہ'' (۱۷) افسانوں پر مشتمل ہے۔ان میں پانچ افسانے پاکستان کے اہم ترین مسائل کا احاطہ کرتے ہیں۔اس سے پتا چلتا ہے کہ ان کے افسانوں کو کسی خاتون کے لکھے ہوئے عام افسانوں کے کھاتے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ان پانچ افسانوں کے سرسری تجزیے سے یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ افسانہ نگار نے ان افسانوں کی فنّی قدر کو کسی بھی مرحلے پر ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور افسانوں کے ''کرافٹ'' کو بھی انتہائی مہارت سے برتا ہے۔آرٹ کے بارے میں یہ قولِ فیصل ہے کہ: ''فن کا اخفا' فن ہے'' Concealment of art is art ان افسانوں کی مقصدیت' افسانے کے دیگر اجزائے ترکیبی سے مل کر افسانے کا جز لاینفک بن جاتی ہے۔ان افسانوں میں افسانہ نگار باہر نکل کر اپنی موجودگی کا کسی بھی مرحلے پر ثبوت نہیں دیتا ہے۔

''پاکستان'' کے بعد شہناز خانم عابدی کے افسانوں کا دوسرا اہم موضوع ''عورت'' ہے۔اس موضوع کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک افسانے کا عنوان ہی ''عورت'' ہے۔''عورت'' کے علاوہ ان کے دوسرے افسانے: خواب کا رشتہ' نیا گرہ' گلی' عقبی آئینہ' وہ ایک لمحہ' صحیح کمرہ' ہیلن جارج گرین' گٹار' رانی' جنجال' اور امانت۔عورت کے موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔یہ افسانے صنفِ نسواں کے گہرے سماجی' صنفی' نفسیاتی مطالعے ہیں' لیکن کسی بھی افسانے میں افسانے کے فنّی اور تکنکی لوازمات سے غفلت نہیں برتی گئی ہے۔ان افسانوں میں ایک جانب عورت کے بڑے روپ: ماں' بیوی' بیٹی اور بہن' پیش کیے گئے ہیں۔تو دوسری جانب یہ بھی خیال رکھا گیا ہے کہ مشرق کی عورت کے ساتھ مغرب کی عورت کی نمائندگی ہو جائے۔ان کے افسانوں: نیا گرہ' عقبی آئینہ' ہیلن جارج گرین' گٹار اور جنجال' مغرب کی عورت کے چند اہم رخوں کے عکاس ہیں۔محبّت اور عشق کے موضوع پر بھی ان کے کامیاب افسانے: خواب کا رشتہ' نیا گرہ' وہ ایک لمحہ۔اس انتخاب میں شامل ہیں۔جنس کے موضوع سے مکمل اجتناب کی صورت بھی نظر نہیں آتی' لیکن صاف لگتا ہے کہ جنس ان کا موضوع نہیں ہے۔شہناز نے سماج کے جس کمزور اور المناک پہلو کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔اُس سے ان کی ذہنی اپج اور مشاہدے کا پتا چلتا ہے۔جنسی موضوع کو جس فنکارانہ انداز سے الفاظ کا پیرہن عطاء کیا ہے' اس سے افسانے میں نہ تو عریانیت جھلکتی ہے اور نہ قاری کے لیے لذّت کا سامان مہیّا ہوتا ہے۔بلکہ ذہن و دل میں ایک خراش چھوڑ جاتا ہے۔اس ضمن میں ان کے افسانے: گلی' صحیح کمرہ اور گٹار۔پڑھنے کے لائق افسانے ہیں۔شہناز خانم عابدی نے زندگی کے مثبت پہلوؤں کی عکاسی بھی کی ہے۔سجدہ اور امانت' کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔

شہناز خانم عابدی کی افسانہ نگاری کا زمانہ علامتی اور تجریدی افسانے کے زوال اور افسانوں میں کہانی کی بازیافت سے تعلق رکھتا ہے۔لیکن آج بھی ایک اچھا افسانہ نگار' علامت' استعارے' تجرید اور تجسیم سے کام لینے سے پیچھے نہیں ہٹتا۔شہناز خانم عابدی ایسے افسانہ نگاروں میں شامل ہیں۔اس انتخاب کے بعض افسانوں کے عنوان ہی علامتی انداز کے ہیں جیسے: خواب کا رشتہ' گلی' عورت اور صحیح کمرہ۔''نیا گرہ'' میں علامت ہے' تجرید ہے' تجسیم ہے اور ان کے باوجود کہانی بھی اپنے سب لوازمات کے ساتھ سلامت ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ شہناز خانم عابدی کا افسانہ' آج کا کامیاب افسانہ ہے۔فنِ افسانہ نگاری پر انہیں زبردست دسترس حاصل ہے۔ان کے افسانے فلسفے اور نظریے کے بوجھ تلے دبے ہوئے نہیں ہیں' بلکہ Human Relation سے جڑے ہوئے ہیں۔شہناز اپنے قاری کے دل و دماغ پر فوراً قابو پانے کے فن سے واقف ہیں۔اسی لیے انہوں نے عصرِ حاضر کی ہمہ جہت زندگی کے مسائل اور جدید ترین فنّی اسالیب سے اردو افسانے کو آشنا کیا ہے۔''خواب کا رشتہ'' کے سبھی افسانوں میں شہناز خانم عابدی نے حقیقت کی کسی نئی سطح کو چھونے اور انہیں نئے زاویے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔فکر و نظر کی تازگی اور گہرائی کے ساتھ حقائق کا تجزیہ کیا ہے۔اور دردمندی' تہہ داری اور نفسیاتی بصیرت سے کام لیا ہے۔وہ بکھرے ہوئے مشاہدات کو غور و خوض کے سہارے افسانے کی اکائی میں سموتی ہیں۔اور خارجی عمل کے مقابلے میں انسانی وجود کے داخلی سفر میں ان ذمّے داریوں کو فراموش نہیں کرتیں جو ایک غیر منصفانہ طبقاتی معاشرے میں اس کے فیصلوں کا احتساب کرتی ہیں۔شہناز کی کہانیوں کی تازگی دیکھ کر ساعت کے چہرے مایوسی سے نہیں اترتے۔سچ تو یہ ہے کہ زندگی ازل تا ابد ایک غیر منقسم وحدت ہے۔اور اپنی ساری وارداتوں کے جڑے پن کے باعث ہی ہمارے خالق کی لازوال تخلیق ہے۔اور ہر دور میں' ہر ذی جان سے' نمائندگی کی بجائے شرکت کا مطالبہ کرتی ہے۔دراصل شہناز کے بیان کا راستہ صاف اور ہموار ہے' یہ ان کے فن کا یہ اعجاز ہے کہ انہوں نے سیکڑوں

باقی صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ فرمایئے

خواب کا رشتہ

سید توقیر حسن ایڈووکیٹ
(کراچی)

اچھی کتاب کو Resis کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔آدمی اس کی گرفت میں آجاتا ہے اور اپنی تمام مصروفیات کو ایک طرف رکھ کر اس کا ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں کتاب ایک ہی نشست میں نہیں پڑھ سکتا اس کی وجہ میرا Profession اس بات کا متحمل نہیں ہو سکتا ۔محترمہ شہناز حانم عابدی کو میں بچپن سے جانتا ہوں۔میری ذاتی رائے ہے کہ وہ دیگر گھریلو خواتین سے مختلف ہیں۔سمجھ دار، دور اندیش اور پُر وقار۔ ہمیشہ سمجھداری کی گفتگو کرتے پایا۔میں ہمیشہ ان کی معاملہ فہمی کا قائل رہا۔آپ کا تعلق ایک معزز ادبی گھرانے سے ہے۔آپ نے اردو ادب میں ایم۔اے کیا ہے۔شادی کے وقت انٹر کا امتحان دیا تھا۔بقیہ تمام تعلیم شادی کے بعد مکمل کی ۔اس میں جہاں آپ کی محنت اور ہمت شامل ہے اس سے کہیں زیادہ آپ کے شوہر جناب عبداللہ جاوید صاحب کے تعاون اور رہنمائی کو بڑا دخل حاصل ہے۔محترم عبداللہ جاوید کے تین شعری مجموعے (۱)موجِ صدرنگ (پہلی اشاعت ۱۹۶۹ء دوسری اشاعت مئی ۲۰۰۶ء) حصارِ امکان (۲۰۰۳) اور (۳)خواب ساں (مئی ۲۰۰۶)شائع ہو کر ادبی حلقوں میں اپنی حیثیت منوا چکے ہیں۔عبداللہ جاوید صاحب نے اپنے تمام شعری مجموعے بڑی محبت کے ساتھ مجھے دیئے ہیں۔یہ میری نالائقی ہے کہ دل چاہتے ہوئے بھی میں اس سلسلے میں کچھ تحریر نہ کر سکا اس نا لائقی میں اس بات کا بڑا دخل ہے کہ محترم عبداللہ جاوید میرے والد حسن حمیدی کے قریبی دوستوں میں ہیں۔(ہم سب احترام کے ساتھ انہیں بھائیجان کہتے ہیں) کی دل سے عزت کرتا ہوں کہیں کوئی بات ایسی ویسی نہ لکھ جاؤں جس سے ان کے وقار یا احترام میں کوئی کمی آجائے۔انشاءاللہ بہت جلد یہ ہمت بھی کرونگا کہ آپ کی شاعری کے بارے میں اپنی ناچیز رائے بھی تحریر کروں۔محترمہ شہناز خانم عابدی کے چچا جناب شوکت عابدی (مرحوم) کا شمار بھی اچھے شعرا میں ہوتا ہے۔آپ کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر عظمت عابدی (ندیم) نے بڑی محبت سے آپ کے کلام کو یکجا کر کے کتابی شکل میں ''رخِ فردا ''(۱۹۹۷ء) کے نام سے شائع کروا کر آپکے کلام کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔بلکہ ادبی حلقوں میں ادب نواز دوستوں تک پہنچایا۔

افسانہ ہمیشہ سے اردو ادب کی مقبول ترین اور طاقتور صنف رہی ہے۔کہانی، افسانے ،تبصرہ ،تنقید، کچھ بھی لکھنے کے لئے مطالعہ کا وسیع ہونا بنیادی ضرورت ہے۔اس کے بغیر کوئی جاندار تخلیق صفحہء قرطاس پر منتقل نہیں ہوسکتی۔اچھے لکھنے والوں کا نہ صرف مطالعہ وسیع اور بلند ہوتا ہے بلکہ ان کی سوچ (اپروچ) کا کینوس بھی وسیع ہوتا ہے۔اردو افسانے کی تاریخ نہ صرف قدیم ہے بلکہ اس کے لکھنے والوں کی فہرست بھی طویل ہے۔اگر ہم اردو افسانے کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ ہمارا افسانہ مسلسل ترقی کے مراحل طے کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے انہی نئے تجربوں کی بنیاد پر آج اردو افسانہ دنیا کی ترقی زبانوں کے دوش بدوش کھڑا نظر آتا ہے۔ہمارے یہاں افسانے لکھنے والوں کی فہرست طویل ضرور ہے مگر معیار اور فن کو مدِ نظر رکھ کر مطالعہ کریں تو یہ فہرست مختصر ہو جائیگی۔

''خواب کا رشتہ'' شہناز خانم عابدی کے منتخب افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔اردو ادب کی تاریخ میں خواتین افسانہ نگاروں کی ایک بہت مضبوط اور قدیم روایت موجود ہے۔اردو افسانے کی ابتداء سے ہی ہمیں خواتین افسانہ نگاروں کے کئی معتبر نام ملتے ہیں ۔عصمت چغتائی، ڈاکٹر رشید جہاں ، خدیجہ مستور ، ہاجرہ مسرور، قرۃ العین حیدر، رضیہ بٹ، بانو قدسیہ وغیرہ یہ تو پرانے اور تجربہ کار افسانہ نگار ہیں ۔ موجودہ ہور میں بھی خواتین افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے ۔شاعری کے مقابلے میں افسانے کے میدان میں خواتین زیادہ نظر آئیں گی اور انہوں نے اس میدان میں نام بھی کمایا۔چند خواتین کے نام رجحان ساز افسانہ نگاروں کے زمرے میں شمار کئے جاسکتے ہیں ۔ چند ایک خواتین کے سوا اکثر افسانہ نگار خواتین میں ایک بات جو مشترکہ حیثیت رکھتی ہے وہ ہے مرکزی کردار کا عورت ہونا۔عورت سے متعلق مسائل کو ان تمام خواتین نے عورت کے نقطہء نظر سے ہی دیکھا اور سمجھا ہے مگر شہناز خانم عابدی کے افسانوں کا سب سے بڑا کمال یہ نظر آتا ہے کہ ان کے افسانے میں مرکزی حیثیت صنف یا جنس کی نہیں بلکہ فرد کی ہے۔مخصوص معاشرتی تناظرات میں محض عورت ہی مجبور و مقہور نہیں ہے مرد بھی اتنا ہی بے بس نظر آتا ہے جتنی کہ عورت۔ ان افسانوں میں مخصوص نسائی یا عورت کے مطالعے کے بجائے فرد کی فردیت کو معروضی تناظر میں دیکھا اور سمجھا گیا ہے۔

محترمہ شہناز خانم عابدی کا شمار اچھے اور معیاری افسانے لکھنے والوں میں ہوتا ہے آپ نے اپنے مجموعہ کلام کا نام ''خواب کا رشتہ'' اسی کتاب میں موجود ایک افسانے کے نام پر رکھا، کیوں رکھا؟ اس کا جواب تو مصنفہ خود دیں تو زیادہ بہتر ہوگا مگر مجھے مظہر الاسلام کی بات جو انہوں نے کتاب ''خط میں پوسٹ کی ہوئی دوپہر'' کے ابتدایئے میں تحریر کی اس وقت یاد آرہی ہے۔آپ بھی پڑھیئے۔

'' کہنے لگی تم نے ''خط میں پوسٹ کی ہوئی دوپہر'' کے نام سے کہانی بھی تو لکھی تھی

میں نے کہا: وہ کہانی اس کتاب میں شامل نہیں۔

کہنے لگی: کیوں

میں نے کہا: مجھے اچھا نہیں لگتا، ہر کہانی کی اپنی شخصیت ہوتی ہے، ایک

کہانی کے نام پر کتاب کا نام رکھ دینے سے لوگ ساری کتاب کو ایک ہی کہانی کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔''

اس کتاب میں شہناز خانم عابدی کا اسلوب نگارش بھرپور انداز میں نظر آتا ہے۔اس افسانے کے مجموعہ میں کل سترہ (۱۷) افسانے ہیں۔جس میں سے ایک طویل افسانہ ''نیاگرا'' جو بیس (۲۰) صفحات پر مشتمل ہے اور ایک مختصر ترین افسانہ ''صحیح کمرہ'' جو دو صفحات میں ہے اس کتاب کا پہلا افسانہ پڑھ کر سابق گورنر پنجاب سلمان تاثیر (مرحوم) کے قتل کی کہانی ذہن میں گھوم جاتی ہے حالانکہ یہ افسانہ اس قتل سے کافی عرصہ قبل تحریر کیا گیا ہے کم وبیش اس طرح کے کہانیاں اور افسانے ہمارے معاشرے اور خصوصاً اردو ادب میں بہت ملیں گے۔

محترمہ شہناز خانم عابدی کا ہر افسانہ تخلیقی توانائیوں سے بھرپور ہے۔ یہ افسانے قاری کو فکر و جزبے کے عیاں اور نہاں گوشوں میں پہنچا کر گویا افسانہ نگار کی اپنی تخلیق کردہ دنیا سے روشناس کرتے ہیں۔چند لفظوں سے منجمد ذہن کو شعلہ ور کر دینا اور سینہء سرد کو شعلہ بداماں بنا دینا بڑا مشکل کام ہے۔لیکن اتنے مشکل کام کو احسن طریقے سے سرانجام دیا گیا ہے۔ان افسانوں کے اسالیب میں جذبہ، تخیل، احساس، تشبیہ، استعارہ، علامت غیر محسوس انداز میں ان افسانوں کی تعمیر و تشکیل میں سنگ وخشت بنتے چلے گئے ہیں۔سوچ کے حسین اور منفرد زاویئے متعین کرنے والے یہ افسانے معنی، اصوات، جمالیات اور تصاویر کو خوبصورت انداز میں سمیٹے ہوئے ہیں۔مثال کے دور پر ان کا افسانہ ''صحیح کمرہ'' جو مختصر ضرور ہے مگر اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ قاری کو نہ صرف اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے بلکہ بہت کچھ سوچنے کی دعوت بھی دیتا ہے۔ایک اچھے افسانہ نگار کا یہی خاصا ہتا ہے کہ دریا کو کوزے میں بند کر دیا اور وہ بھی اس خوبصورت انداز میں کہ دریا پھر دریا رہے اور کہیں بھی کسی قسم کا کوئی جھول نظر نہ آئے۔

محترمہ شہناز خانم عابدی کا ہر افسانہ اپنی جگہ نمایاں ہے اور آپ کو زبان وبیان اور فضا بندی پر جو قدرت حاصل ہے اس کی جھلکیاں آپ کے ہر افسانے میں نظر آتی ہیں مگر بعض افسانوں میں موجود ماحول اور اس ماحول میں رہنے والی زندگیاں اور ان کی کہانیاں ہمارے اندر کے سوئے ہوئے انسان کو جگانے کے لئے کافی ہیں۔ان کو کہانی کہنے کا سلیقہ آتا ہے۔ان کی تحریروں میں جو زبان کی بے ساختگی اور بیانیہ پر جو قدرت حاصل ہے وہ بیشتر افسانہ نگاروں میں نہیں ملتی۔

میرے خیال میں کسی بھی افسانے اور کہانی والی کتاب پر کچھ لکھنا بہت مشکل کام ہے۔کیونکہ اس کا کوئی ایک مرکزی خیال نہیں ہوتا جسے موضوع بنایا جا سکے۔مضمون نگار یا تبصرہ نگار کے لئے یہ لازمی ہوتا ہے وہ ہر افسانے، کہانی، کا انفرادی طور پر تجزیہ کرے۔میں نے اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے افسانوں کا احاطہ کرنے حقیری کوشش کی ہے۔حلانکہ یہ مصنف کے ساتھ زیادتی ہے۔ ان افسانوں کے مطالعے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ کو نفسیات سے گہری دلچسپی ہے۔فکشن اور نفسیات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ادب میں تخلیقی محرکات اور تخلیقی عمل ایک اہم موضوع ہے۔اور نفسیات میں بھی ان موضوعات کو تحقیق کا مرکز بنایا گیا ہے۔کوئی بھی افسانہ نگار، کہانی نویس، یا ادیب اچھی اور معیاری تحریر اس وقت تک تخلیق نہیں کر سکتا جب تک وہ انسانی نفسیات سے واقف نہ ہو اور خاص طور پر نفسیاتی پیچیدگیوں اور الجھنوں سے واقف نہ ہو۔

ان کے افسانوں کی منفرد اہمیت وہ گداز ہے جو اپنے ماحول کو پُر حول ہوتے دیکھ کر لفظ ولہجہ میں سما جاتا ہے اور ان کی آواز پورے عہد کی ہمراز بن جاتی ہے، یوں عصریت اور آفاقیت گڈ مڈ ہو کر تخلیق وتحریر کا حصّہ بن جاتی ہے۔ان کا لکھا ہوا ہر افسانہ پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے جیسے سب کچھ ہم پر گزرا ہے۔

اس انتخاب کا اجمالی ذکر کرتے ہوئے میں اس کتاب کو باذوق قارئین کے حوالے کرتا ہوں اس امید کے ساتھ کہ شہناز خانم عابدی بہت جلد اپنے افسانوں کا دوسرا، تیسرا مجموعہ ہم تک پہنچائیں گی۔

وہاں بھی تیز رکھی ہے ہنر کی لو میں نے
جہاں ہوا نہ کسی کا چراغ جلنے دے

بقیہ: شبنمی اسلوب کی افسانہ نگار

کرداروں میں سے ایک ایک کی شرکت کے کُل امکانات اسی پر چھوڑ دیئے ہیں۔سبھی اپنے آپ کو نبھاتے چلے جاتے ہیں۔شہناز خانم عابدی کی تخلیق کا جادو یہ ہے کہ ہوتا وہی ہے جو ہونا ہوتا ہے' یعنی کہانی کے تار و پود کا باطنی وسیلہ خود بخود بنتا ہے۔اور کہانی اپنے ہی عمل کی ٹوٹ پھوٹ سے سے بن بن کر اپنی فطری پہچان کے خطوط اختیار کرتی ہے۔شہناز خانم عابدی کے ہاں اسلوبی دائروں کے بطن سے فکر کا ایک ایسا پیکر ابھرتا ہے جو سطح کے اوپر بھی ہے اور اس کے نیچے ذور گہرائی تک دھنسا ہوا بھی ہے۔اس پیکر کی شناخت اوپر شاخوں میں بھی ہے اور اندر جڑوں میں بھی ہے۔جڑوں سے آگہی کے لیے اوپر سے نیچے اور باہر سے اندر کی سمت پیش قدمی کرنی پڑتی ہے۔شاخوں کے شاداب وجود اور جڑوں کی مستحکم گرفت ہی سے درخت تن آور ہوتا ہے۔''خواب کا رشتہ'' کے افسانوں میں ہم جس فکر سے دوچار ہوتے ہیں' اس کی نشوونما شعور اور لاشعور کے سنجوگ سے ہوئی ہے' جو سطح کے اوپر شاداب اور سطح کے نیچے مضبوط ہے۔ان معنوں میں شہناز خانم عابدی زندگی کے خارج اور داخل دونوں کی بڑی گہری زمز شناس ہیں۔صحیح مشاہدہ' صحیح اور گہری فکر' صحیح احساس اور سلاستِ زبان ان کے افسانوں کی جان ہیں۔

میانِ خواب وحقیقت

شفیق احمد شفیق

(کراچی)

میرے پیش نظر شہناز خانم عابدی کا پہلا افسانوی مجموعہ ''خواب کا رشتہ'' ہے۔ کتاب کا پیش لفظ پڑھا۔ فکشن جس میں داستان، قصہ، افسانہ، ناول اور ڈرامہ شامل ہے، کم از کم میں تو یہی سمجھتا ہوں کیونکہ ان میں ماجرائیت، کردار نگاری، منظر نگاری اور چلتی پھرتی زندگی کی کرشمہ سازیاں قدر مشترک ہیں، مصنفہ کو ادب کے اس شعبے کی قوت، اثر پذیری اور سچائی کو تسلیم کرتے ہوئے پایا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انھوں نے موضوع کی اہمیت کو مانا اور اس کی اثر آفرینی کے ساتھ ساتھ اس کے معرض وجود میں آنے کی فعالیت اور تخلیقیت کی پر سراریت اور اصرار انگیزی کو بھی تسلیم کیا ہے۔ اہم موضوع کے اصرارِ تخلیق کے ساتھ اگر قلمکار کا اسلوب اور لفظیات ہم آہنگ ہو کر مستعد ہو جائیں تو تخلیق کار اس پر مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ قرطاس وقلم لے کر بیٹھ جائے یا کمپیوٹر آن کر لے اور تجربے یا خیال یا موضوع کو ٹھوس پیکر میں ڈھال دے۔

جب میں نے ''پیش لفظ'' کے اس جملے کو پڑھا ''میرا ہر افسانہ اپنا ایک جداگانہ موضوع ہی نہیں، اسلوب اور تکنیکی انداز رکھتا ہے''۔ تو اس سے ایک تعلی محض سمجھا اور زیر لب مسکرایا۔ کیوں کہ عصر حاضر میں نظم ونثر دونوں میں دعوے کرنے والوں کا ایک ہجوم نظر آتا ہے مگر عملی صورت اور حقیقی جوہر نبوغ کا مظاہرہ کم کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ لیکن جب میں نے زیر بحث افسانوی مجموعے کی مطالعاتی سیاحت کی تو میں پھر مسکرایا لیکن اس مسکراہٹ میں Eureka والی کیفیت تھی۔ سچائی کے ذائقے اور جوہر نبوغ کی دریافت کی نشاط پزیری تھی۔

اس میں دو رائیں نہیں کہ موضوع ہمیشہ نیا نہیں ہوتا مگر پرانے موضوع کو نئے زاویے، نئی تکنیک، شاداب اسلوبیات کی چاشنی، کرداری تنوع اور ماحول آشنائی کی بوقلمونی کے ذریعہ نیا بنا لیا جاتا ہے۔ یہی قلمکاری بھی ہے اور فن کاری بھی۔ شہناز خانم ہوا سے لڑتے ہوئے تازہ کاری کے اڑتے ہوئے دامن کو بار بار چھوتی ہوئی ملتی ہیں۔ ان کی جستجوئے تازگی ان کے فن کے لیے بھی پرکشش ثابت ہوئی ہے اور قارئین کے لیے بھی مقناطیسیت کی حامل ہے۔

پہلا افسانہ ''مکافات'' میں ایک ایسے موضوع کو افسانوی پیکر عطا کیا گیا ہے جو بہت تازہ ترین صورت حالات کا آئینہ دار ہے اور جہاں تک میرے مطالعے کی دوڑ، ڈور اور کھوج کی رسائی کا تعلق ہے میں بہت اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ اس موضوع کو ابھی تک اردو افسانوں میں پیش نہیں کیا گیا ہے۔ چونکہ افسانے کا تعلق سندھ سے ہے اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ سندھی زبان میں بھی ایسا کوئی افسانہ نہیں لکھا گیا ہے۔ اس افسانے کا موضوع یہ ہے کہ ایک سیٹھ بدین غربی کے ڈپٹی کمشنر کو رشوت دے کر خرید لیتا ہے اور سیلاب کا پانی جو اس کی فیکٹری اور جائیداد کا رخ کر رہا تھا اس کو روکنے اور اس کے رخ کو موڑنے کے لیے ان بندوں کو توڑ دینے پر مجبور کر دیتا ہے جو غریبوں کی بستیوں کی حفاظت کے لیے تعمیر ہوئے تھے۔ جلال دینا کو یہ بات پسند نہ آئی اس نے سیٹھ حشمت اور ڈپٹی کمشنر کو بہت سمجھایا مگر اس جیسے معمولی سرکاری ملازم کی کون سنتا ہے۔ وہی ہوا جو سیٹھ حشمت اور ڈپٹی کمشنر چاہتے تھے۔ آخر کار جلال دینا کو ہی قدم اٹھانا پڑا جسے وہ عام حالات میں کبھی نہیں اٹھاتا۔ اس نے ملک سے غداری اور عوام دشمنی کی سزا اپنے ضمیر کی عدالت سے حاصل کی اور ان دونوں کو قتل کر کے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ پاکستان کے حالیہ سیلاب میں بھی ایسا ہوا ہے۔ اخبار میں مسلسل خبریں آتی رہی ہیں۔ بات سچ ہونے کے باوجود اس انسان دشمن جرم کے خلاف کوئی کاروائی نہیں ہوئی۔ یہاں بڑے سے بڑے جرم کو لیپا پوتی کا لبادہ اوڑھا کر آنکھوں سے اوجھل کر دیا جاتا ہے۔ یہاں اس قسم کے جرائم اور غداری نما حرکات کا علاج جلال دینا جیسے لوگوں کے پاس ہی ہے۔ پاکستان کا ہر شعبہ اور وزارت، جلال دینا کے وجود کا متقاضی ہے۔ کاش جلال دینا جیسے مخلص، بہادر، ایثار کا پیکر محبِ وطن آدمی کچھ اور پیدا ہو جاتے جو ڈپٹی کمشنر بدین (غربی) اور سیٹھ حشمت جیسے لوگوں کو غریبوں کی بستیوں کے بند توڑ کر بہا دینے کے جرم کی سزا ''تنگ آمد بہ جنگ آمد'' کے مصداق دے سکتے۔

''خواب کا رشتہ'' میں دو محبت کرنے والوں کی کہانی ہے۔ کوئی نیا موضوع نہیں ہے مگر شہناز خانم عابدی نے تازگی کو جاری رکھتے ہوئے اور اسے کام میں لاتے ہوئے پیشکش کا ایک نیا انداز دیا ہے۔ کچھ خواب کچھ حقیقت کے درمیان یہ فن پارہ نمود وظہور پاتا ہے۔ اس میں کسی حد تک ڈرامائی کیفیت بھی موجود ہے۔

''نیا گرا'' طویل ہونے کے باوصف غضب کا افسانہ ہے۔ اس کی کئی تہیں ہیں۔ یہ فن پارہ اپنے اندر ایک لازوال محبت کی داستان لئے ہوئے ہے۔ یہ تہذیب وشائستگی سے آراستہ اور تمدن کی بازیافتگی کی کوشش کی ایک مثال ہے، ایثار اور اخلاص کی خوبصورت کہانی کی کیفیت اس افسانے کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں خواب اور حقیقت کے درمیان بیوی کو پروان چڑھتا ہوا دکھایا گیا جس کی مثال بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ اس میں ایک بیوی جس نے ایک ایسے چاہنے والے اور ایک ایسے خاوند کی اس کیفیات اور بوالعجبیوں کو پیش کیا گیا جس کی محبوبہ زندگی سے ہارتی جا رہی تھی مگر وہ ایک عزم دیوانہ پن لئے اسے مرنے نہیں دینا چاہتا تھا آخر کار وہ اسے بچا لینے میں کامراں ٹھہرتا ہے۔ اس

میں Mistry کی چھاپ بھی ہے اور حسی کیفیت کا منظر نامہ بھی ہے اور مبدا فیاض کی کرشمہ سازی بھی موجود ہے۔ نیاگرا میں جس طرح سرشاری، بے خودی، والہانہ پن، عقیدتی عروج کا منظر سامنے آتا ہے وہ مصنف کے قلم کی مضبوطی پر دال ہے۔ اسے اردو کا ایک قابل ذکر افسانہ کہا جاسکتا ہے۔

''گلی'' میں بھی تو ہم حقیقت اور ایک نئے ماحول کو کسی حد تک نئے انداز سے پیش کرنے کی سعی ہے مگر یہ کہانی مجھے زیادہ متاثر نہ کرسکی۔ کیوں کہ موضوع کے لحاظ سے بھی یہ نیا نہیں ہے اور مسرت خیز تحیر ہے جو ''مکافات''، ''خواب کا رشتہ'' اور ''نیاگرا'' میں وافر انداز میں ملتا ہے۔

البتہ افسانہ ''سجدہ'' انسانی فکر وخیال کے ایک خاص نکتے کو مضبوط بنیادوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ آپ اسے جذبہ رُاسخ العقیدتی کا نکتۂ عروج بھی کہہ سکتے ہیں۔ سماجی، معاشی کے باوصف اس میں ایک وضع داری کا جوہر بھی موجود ہے جو ما جرائیت کا اٹوٹ حصہ ہیں۔ یہ بہت مربوط اور رواں فن پارہ ہے۔

''فیصلہ'' ایک نوجوان کی استقامت، زندہ ضمیری اور حب الوطنی کو پیش کرتا ہے۔ اس میں ایک شریف خاندان کی کہانی ہے۔ باپ اسکول ٹیچر ہے، تنگدستی اور مالی مشکلات میں گھرے ہوئے خاندان میں ایک بیٹا اس قابل تھا کہ اگر نوکری مل جاتی تو پریشانیاں دور ہو جاتیں۔ اسے اس کے ایک دوست کی پس پردہ کوشش سے نوکری مل جاتی ہے۔ ٹریننگ کے بعد اس کی پوسٹنگ امریکہ میں ہو جاتی ہے۔ کافی ترقی کرتا ہے۔ خوشحالی پاوں سے لپٹ جاتی ہے۔ پھر اسے ماں باپ، بھائی بہن اور وطن کی یاد ستاتی ہے اور وہ کوشش کر کے اپنا تبادلہ اپنے وطن میں کرالیتا ہے۔ مگر جلد ہی اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے دوست نے یہ نوکری کیوں دلائی۔ اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے سبب ملک کے اہم معاملات اس کے رموز سے وہ واقف تھا اور بہت ہی اہم قسم کے کاغذات دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ بلیک ملینگ اور دھمکانے کے لئے امریکہ میں قیام کے دوران اس کی کچھ ایسی قابل اعتراض تصویریں بھی اس لفافے میں رکھ دی گئی تھیں جو اس کی لاعلمی میں اُتاری گئی تھیں۔ اسے شراب پلا کر اتنا بے خود کر دیا گیا تھا کہ اسے کچھ ہوش نہیں رہا تھا کہ اس دوران اس نے کیا کیا یا اس سے کیا کیا کرایا گیا تھا۔ تصویریں دیکھ کر وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اسے ناگردہ گناہ کی سزا کی دھمکی ملی تھی۔ وہ سوچتا ہے کہ یہ تصویریں اگر والد، بھائی، بہنوں، بیوی اور دیگر لوگوں تک پہنچے گی تو اس کی کیا عزت رہے گی۔ اس کے بارے میں کیا خیال کیا جائے گا۔ مگر اس نے کافی سوچ بچار کے بعد ایک فیصلے پر پہنچ جاتا ہے اور اپنی بے عزتی کی پروا کئے بغیر ملک وقوم کی خاطر وہ تمام اہم کاغذات فوراً محفوظ ہاتھوں میں دے دیتا اور ملازمت سے مستعفی ہو جاتا ہے اور ماں باپ، بھائی بہن اور بیوی کو کچھ بتائے بغیر لاپتہ ہو جاتا ہے۔

''عقبی آئینہ'' بہت شگفتہ فن پارہ ہے۔ مگر اس کا اختتام سوگوار کر دیتا ہے۔ رچرڈ نے اپنی بیوی میری اور کرس کو جس طرح دیکھا، کرس کی جانب اس کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو محسوس کیا، اس عورت کو دیکھا جو اس کے بغیر رہنے کا تصور نہیں کرتی تھی مگر کرس کی وجہ سے اس کی بیوی اسے چھوڑ کر تنہا رہنے کی للک کا مشاہدہ کیا۔ یہ ساری چیزیں ایسی تھیں جن کے سبب رچرڈ کو ایک تلخ ترین فیصلے تک پہنچنا پڑا۔ میرے خیال سے میری کو رچرڈ کا طلاق دے دینا کوئی ایسا غیر فطری اقدام نہیں تھا۔ میری کا دل کتنا ہی صاف کیوں نہ ہو اس سے غلطی ہوئی تھی۔ اس افسانے میں اس بات کی طرف بھی فنکارانہ اشارہ ملتا ہے کہ انسان جذبات کے سیل میں بہہ کر کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے اور کتنے خوفناک نتائج سے دوچار ہوتا ہے۔ افسانے کے تناظر میں اس کا اطلاق رچرڈ اور میری دونوں پر ہوتا ہے۔

فن پارہ ''عورت'' اثر آفرینی، ماجرائی تزئین کاری، کردار نگاری، ماحول شناسی، داخلی کشمکش اور خارجی جبر کو سلیقے سے پیش کرنے کے تناظر میں ایک عمدہ اور معیاری افسانہ کہلانے کا مستحق ہے۔ اس میں عورت کے عورت پن، وفاداری کے جوہر، فیصلے کی استقامت، تحمل کی سربلندی، احساس ہمدردی، جذبوں کی گہرائی اور ایثار وقربانی کی چمک دمک کو نہایت ادبیت، لطافت اور اشارت کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔

''بدا کرنا جو تھا'' ایسے موضوع کا افسانہ ہے جو ہمارے جسم وجاں، ہمارے احساسات اور نفسیات سے جبراً جڑا ہوا ہے۔ اس بلا کے شکار خصوصی طور پر افغانستان، پاکستان اور ہندوستان میں اور عمومی طور پر دنیا کے بہت سے ممالک ہیں۔ دہشت گردی کے پس پشت چاہے کتنا ہی نیک مقصد کیوں نہ ہو بے گناہ عورتوں، معصوم بالکوں، کمزور اور ناتواں ضعیفوں اور بے قصور نوجوانوں کو بے خبری کے عالم میں موت کے منہ میں دھکیل دینا کسی طرح بھی سراہنے کے لائق نہیں۔ اسلام میں کہاں لکھا ہوا ہے کہ نماز جنازہ میں بھی نمازیوں اور میت کو بم کا شکار بنا کر جہاد کیا جائے۔ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس کا مقصد جہاد کے نام پر اسلام کو بدنام کرنا اور اسے ایک دہشت پسند مذہب ہونے کا تاثر پھیلانا ہے۔ اس میں کچھ سیاسی مفادات کے حصول کو بھی دخل ہے۔ بہرحال ''بدا کرنا جو تھا'' کا مرکزی کردار یاسر بھی کسی نامعلوم سمت سے آئی ہوئی گولی کا شکار ہو گیا تھا۔ ٹھیک اسی دن جس دن اس کا ولیمہ تھا۔ اس دردناک واقعہ نے یاسر کا گھر اور نئی نویلی دلہن شائزہ کا سہاگ اجاڑ دیا تھا۔

بے نظیر کی شہادت کی خبر پھیلتے ہی جو ردعمل سامنے آیا جو توڑ پھوڑ، جلاؤ گھیراؤ اور غم وغصے کی لہر پورے ملک میں پھیلی اور جو افراتفری مچی، افسانے کا ہیرو اسی کا شکار ہوا۔ وہ خاندانی شہید ثابت ہوا کہ اس کے والد نے بھی ملک کی سرحد کی حفاظت کے دوران جام شہادت نوش کیا تھا۔

وہ ایک لمحہ ''جذبوں، چاہتوں اور قربتوں کی کہانی کے ساتھ ساتھ تحمل، ایثار، ہوشمندی اور خوبصورت گریز کی داستان بھی ہے۔ دو محبت کرنے والوں کے درمیان مذہب کی ناقابل تسخیر دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ اپنے اپنے مذہبی عقائد پر استقامت کے ساتھ قائم رہنے والی بات کو نشان زدہ کرتا ہوا یہ

ایک خوبصورت فن پارہ ہے۔ جنوں کی سرمستی کس طرح آ گہی کی شائستگی سے ہمکنار ہوتی ہے۔ یہ افسانہ اسی کی مثال پیش کرتا ہے۔ سیما کا والہانہ پن کے ساتھ اشعؔر سے ملنے کے لئے ٹریفک کی پروا کئے بغیر بڑھنا اور اشعر کا سیما کو دیکھ کر بے چین ہو جانا اور سیما ہی کی طرح اس کا بڑھنا مگر پھر ایک لمحے میں اس کا رکنا، پلٹنا اور راستہ بدل کر غائب ہو جانا معنویت کی بہت سی تہیں رکھتا ہے۔ یہ فن پارہ بہت خوبصورت موڑ پر آ کر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے شہناز خانم نے افسانہ ''صحیح کمرہ'' لکھا تھا۔ یہ کہانی ان کے فن کے مزاج سے میل نہیں کھاتی۔ اسے اس افسانوی انتخاب میں شامل نہ کرتیں تو زیادہ بہتر تھا۔

''ہیلن جارج گرین'' حقائق ہستی اور معاشی جبر لئے ہوئے ہے۔ شوہر جتنا نکما بیوی اتنی ہی مصروف کار، مرد جتنا غیر ذمہ دار عورت اتنی بردبار اور فرض شناس، ہیلن جتنا اوباش بیوی اتنی پاکباز۔ دونوں کی شادی کو اجتماع ضدین بھی کہہ سکتے ہیں۔ مسز ہیلن افسانہ ''عورت'' کے مشابہ ایک عورت ہے۔ وہ بھی معاشی جبر وقہر کی اسیر ہے، بچوں کے روشن مستقبل میں خود کو تاریکی میں دھکیلتی رہی ہے زندگی کو پرتعیش اور فراغت کے ساتھ گزارنے کی اسے مہلت نہ ملی اور نہ غیر ذمہ دار شوہر کی بے فکری کی راہوں پر چل کر اس کی ہمسفر بن سکی۔ شوہر کے خود غرضانہ سلوک کے باوصف وہ اندر سے ہیلن جارج ہی کی تھی اسی کو چاہتی تھی۔ قطع تعلق کے باوجود بے رخی اور کربناک تنہائیوں میں روز وشب بتا کر بھی۔ دونوں کے ماحول، فضا، صورت حالات اور تہذیبی وثقافتی اقدار میں افتراق ضرور ہے مگر نسوانی فطرت کی وفا پرستی، ایثار پسندی، بہتر اور باوقار زندگی گزارنے کا عزم ایک ہے۔ اس افسانے میں اثر آفرینی بھی ہے اور جذبے کی تلخی وشیرینی بھی ہے۔ اس میں وقوعوں کی بنت اور بیانیہ کی روانی پر کشش ہے۔

افسانہ ''امانت'' میں بھی بڑا تنوع ہے۔ موضوع کو نیا پن دینا آسان تخلیقی عمل نہیں ہے۔ مگر مصنفہ نئے بیانیہ، نئے اسلوب اور لفظیات کے نرالے پن کی ساحل سے موجوں کی طرح ٹکراتی ہیں اور گرداب کے ماحصل کو نئی سج دھج کے ساتھ آسودگان ساحل تک پہنچا دیتی ہیں۔ ایثار، احساس زیاں، ماتا، احساس ندامت، انسانی فطرت کی کمزوری اور دیگر بہت سے عناصر کو گوندھ کر شہناز نے اپنے افسانے کو فن کا حسن اور تکمیلیت کی لذت بخشی ہے۔ دو رویوں اور احساسات کی گہرائیوں اور وسعتوں کو فن کی شائستگی کے سہارے پھیلایا ہے۔ اس میں صرف ماں کی قربانی ہی کو نشان زد نہیں کیا گیا بلکہ باپ کے کردار کو بھی اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

''گٹار''، ''رانی''، ''جنجال'' اور ''سیٹھ'' بھی اچھے افسانے ہیں اور تازہ کار فن پارے کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہناز کی زیر نظر کتاب اردو افسانہ نگاری میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

☆

بقیہ: حقیقت زندگی ہے

''عورت'' مشرقی روایات سے بھرپور افسانے کی اعلیٰ مثال ہے۔ وہ ایک آدرش ماں ہے اور آدرش بیوی بھی۔ اس افسانے کا انجام غور کرنے کے لائق ہے اور غیر متوقع بھی۔

''سجدہ'' ایک ایسا شاہکار افسانہ ہے جس کو پڑھ کر قاری کو روحانیت کا سبق ملتا ہے۔ عبدالغفور انتہائی نامساعد حالات کے باوجود اپنے دوست سے قرض کی واپسی کا تقاضا نہیں کرتا۔ یہ افسانہ علاّمہ اقبال کے شعر

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

کی بہترین تصویر کشی کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا افسانہ ہے جس کے کردار کی ذہنی کشمکش قاری کو کئی بار یہ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ ایسی صورت میں سب سے بہتر لائحہ عمل کیا ہے۔ آج کی دنیا بھی عبدالغفور جیسے لوگوں سے خالی نہیں۔

شہناز خانم عابدی نے اپنی کتاب ''خواب کا رشتہ'' میں اپنے قارئین کو بہت سے اچھّے افسانے پڑھنے کو دیئے ہیں۔ اس افسانوی مجموعے کی دنیا آپ کی ہماری دنیا ہے۔ اس دنیا میں بسے ہوئے لوگ بھی ہمارے اور آپ کے جیسے ہیں۔ یہ ایک زوال پذیر معاشرے کی پیداوار ہیں اور افسانہ نگار نے اپنے برے سے برے کردار کے لئے 'نفرت' کے جذبات کو کھلی چھٹی نہیں دی ہے۔ یہ احساس ہمیشہ باقی رکھا ہے کہ اقدار سے تہی معاشرے میں ایسے لوگوں کا وجود قرینِ قیاس ہے۔

ان کرداروں میں جو منفی عناصر ملتے ہیں وہ خلقی اور وہبی (God Given) نہیں بلکہ معاشرے کی دین ہیں اسی معاشرے میں، اسی دنیا میں مثبت عناصر کے حامل لوگ بھی موجود ہیں خواہ کیسا بھی معاشرہ ہو، کیسی ہی دنیا ہو، قدرت کا دستور ہے جہاں شر ہو تو وہاں خیر بھی موجود ہوتا ہے۔ ان افسانوں کے بارے میں یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ ہر افسانہ اس انصاف کا مظہر ہے جس کو شاعرانہ انصاف (Poetic Justice) کہا جاتا ہے اگر ایسا ہوتا تو میں ان افسانوں کے معیار سے ہرگز مطمئن نہیں ہوتا۔ ہر افسانے میں جو وقوعہ اور اس کا انجام دکھایا گیا ہے وہ اس افسانے سے جڑا ہوا ہے بالکل اسی طرح جس طرح حقیقی زندگی میں ہوتا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے افسانہ حقیقی زندگی کی عکاسی ہی نہیں تفسیر بھی ہوتا ہے۔

شہناز خانم عابدی کے افسانوں کی بڑائی اس امر میں مضمر ہے کہ یہ افسانے عصری ہوتے ہوئے آفاقی بھی ہیں۔ یہ آفاقیت افسانہ نگار کی فکر سے ہم رشتہ ہے۔

''حقیقت زندگی ہے''

سہیل جاوید
(کینیڈا)

میں نے شہناز خانم عابدی کو اپنے بچپن میں بیشتر وقت لکھنے پڑھنے میں مصروف دیکھا ہے۔ کچھ سوجھ بوجھ آئی تو معلوم ہوا کہ وہ کہانیاں لکھتی ہیں۔ میرے بے حد مجبور کرنے پر حال ہی میں انہوں نے اپنے سترہ افسانوں کو مختلف ادبی رسائل سے باہر نکال کر ''خواب کا رشتہ'' کی صورت دی۔ اس کتاب کا سرِ ورق اور عنوان (جو ایک افسانے کا عنوان بھی ہے) قاری کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ کتاب کو شیلف میں رکھنے سے پہلے کھول کر ضرور دیکھے۔

اس کتاب کا پیش لفظ قاری کے ذہن کو یوں جکڑ لیتا ہے گویا پیش لفظ خود بھی ایک کہانی ہو۔ ''شہرزاد کی کہانی۔'' جس نے شہریار کو ایک ہزار راتوں تک دلچسپ کہانیاں سنا کر نہ صرف اپنی جان بچائی بلکہ شہریار کے جنون پر اس طرح قابو پایا کہ ایک ہزار ایک ویں رات کو بغیر کوئی کہانی سنے بھی شہریار نے اس کی جان بخش دی۔ یہ ایک ہزار قصّے، کہانیاں یا افسانے جو بھی تھے الف لیلیٰ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

شہناز رخانم عابدی کے افسانوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کا ہر افسانہ مختلف ہے، اتنا مختلف کہ قاری کبھی بھی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ وہ کہانی پلاٹ اور کرداروں کو افسانے میں کس طرح ٹریٹ کرنے والی ہیں۔ اس طرح وہ ہر افسانے میں بالکل مختلف ٹیکنیک استعمال کر کے قاری کی دلچسپی کو مہمیز کرتی ہیں۔ بعض اوقات افسانہ نگار کے لئے تکنیک کی یکسانیت ایک ایسی مجبوری بن جاتی ہے جس سے بچنا بڑے بڑے افسانہ نگاروں کے لئے بھی ممکن نہیں ہوتا اس کی ایک جھلک کرشن چندر کے افسانوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ایسے افسانہ نگاروں کے دو چار افسانے پڑھ لینے کے بعد قاری کے لئے ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ قیاس کر لے کہ کہانی کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ ایسے افسانے بسا اوقات بہترین کہانی کے باوجود قاری کی دلچسپی کو برقرار نہیں رکھ پاتے۔

شہناز خانم عابدی خود کہتی ہیں کہ ''کوئی کہانی، افسانہ، یا قصّہ لکھنے والے کے ذہن میں اس طرح سما جاتا ہے کہ جیسے حکم حاکم مرگِ مفاجات اور اپنے کو خلق کروا کے رہتا ہے۔ ایسی ہی صورتِ حال مرزا غالب کے شعر سے ابلاغ ہوتی ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اس بات کی حقیقت یوں بھی عیاں ہوتی ہے کہ ان کے ہر افسانے کا موضوع دوسرے سے بالکل مختلف ہے ان کی تحریر پڑھ کر ایسا ہی احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے افسانہ لکھا نہیں ہے بلکہ کہانی نے انہیں مجبور کیا ہے کہ اسے اپنے قلم سے تخلیق کریں۔

شہناز خانم عابدی کے افسانے ''خواب کا رشتہ'' ہی کو لیں۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے ارجمند بانو اور پروفیسر اقبال حیدر جنجوعہ کے تعلق کو ارجمند بانو کی موت کے بعد خواب میں جس طریقے سے جوڑا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔

''نیاگرا'' ایک عجیب وغریب داستانِ محبت ہے۔ ہیری جیکسن کا کیتھرین مرفی کی محبت میں مبتلا ہونا اور پھر کیتھرین کے والدین کے انکار کے باوجود بالآخر اسے حاصل کر لینا۔ پھر ہیری کے لاکھ جتن کرنے کے باوجود اپنی بیوی کو الزائمر (Alzheimer) کے ہاتھوں کھو دینا، قاری کے جذبات کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ اس افسانے میں نیاگرا فال کی عظمت کو شہناز خانم عابدی ایک بالکل ہی نئے انداز میں بیان کر رہی ہیں۔ ''نیاگرا کی اپنی ایک آواز تھی، ایسی آواز جو سماعتوں کے لئے نہیں بلکہ وجودوں کے لئے ہوتی ہے۔ ایک وجود سے دوسرے وجود میں داخل ہو کر ان کو اپنی لپیٹ میں لینے والی۔۔۔ ان کے اندر گردش کرنے والی اس آواز سے ہم رشتہ آواز جو تخلیقِ کائنات کا آغاز کر کے ختم نہیں ہوتی بلکہ زمان ومکان کی ہر چھوٹی بڑی اکائی میں موجود ہے، دراز سے دراز، وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔'' اس افسانے میں نیاگرا کیتھی کے وجود پر جس طرح اثر انداز ہوتا ہے وہ جادوئی ہونے کے باوجود بہت بھلا محسوس ہوتا ہے۔

شہناز خانم عابدی کے افسانے ''ہیلن جارج گرین'' میں ایک ایسی مضبوط عورت کو پیش کیا گیا ہے جو اپنے اوباش شوہر کے گھر کو چھوڑ کر چلے جانے کے بعد اپنی اولاد کے لئے اپنی ذاتی زندگی وقف کر دیتی ہے اور موقع ملنے کے باوجود کسی اور مرد کا سہارا نہیں لیتی۔ اس افسانے میں ہیلن اور اس کے کرداروں کی کشمکش میں قاری بھی ملوث ہو جاتا ہے اور قاری کی ترجیحات ہیلن کے حق میں ہوتی ہے۔ اگر ہیلن کے نام سے پڑھنے والوں کے ذہن مشہور یونانی حسینہ 'ہیلن' کی جانب متوجہ ہو بھی جائیں تو 'ہیلن جارج گرین' ان کو عصری حقیقی زندگی کی جانب لوٹانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

''عورت'' ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو ساری زندگی اپنے ناکارہ اور جواری شوہر کی بدسلوکیوں کو انتہائی صبر وتحمل سے سہتی رہتی ہے لیکن یہ اس لمحے ایک فولادی چٹان بن کر اپنے شوہر کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے جب اس کا شوہر اپنی جوان بیٹی کو بیچنے کی کوشش کرتا ہے۔

باقی صفحہ ۵۹ پر ملاحظہ فرمائیے

''نیاگرا''

شہناز خانم عابدی

اس دن موسم بہت خوشگوار تھا۔آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا۔ہلکی ہلکی بوندا باندی ہورہی تھی۔وہ کاؤنٹر سے کافی لے رہی تھی۔میں لے چکا تھا۔گورا رنگ، گہری نیلی آنکھیں، بھورے بال، گلابی لانگ اسکرٹ اور گلابی ہیٹ میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔میں اس کے نزدیک گیا اور بولا۔

''ہائی''

اس نے نظریں اٹھائیں، ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی۔اس کو یہی مسکراہٹ کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔اس نے ہلکے سے 'ہائی' کہا یا' ہائی' کہنے کے انداز میں ہونٹوں کو حرکت دی۔اس کی آنکھوں میں تعجب تھا ۔نجانے کیوں میرا دل چاہا اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں ڈوب جاؤں۔

''مجھے ہیری کہتے ہیں ۔۔ہیری جیکسن۔۔'' ہم دونوں ایک ساتھ باہر نکلے۔

''کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں۔؟''

''کیتھرین۔۔کیتھرین مرفی۔''اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا

شاید وہ حیران ہورہی تھی کہ میں کیوں اس کا پیچھا کررہا تھا۔پُروقار چال چلتے ہوئے وہ ساحل کے کنارے بیٹھے ہوئے اپنے لوگوں میں پہنچ گئی۔ پورا ساحل لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔دور دور تک لوگ ہی لوگ نظر آرہے تھے۔اس موسمِ گرما کا یہ پہلا ویک اینڈ تھا۔یوں لگتا تھا پورا شہر ساحل پر امنڈ آیا ہے ۔بیشمار مرد، عورت، لڑکے، لڑکیاں، اور بچے پانی کے مزے لوٹ رہے تھے، کشتی رانی ہورہی تھی، چند ایک نوجوان سرف رائیڈنگ (Surf Riding) میں مصروف تھے۔کچھ لوگ چہل قدمی کررہے تھے، تو کچھ جاگنگ، کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے، کچھ بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ لوگ لیٹے تھے۔بچے ریت کے گھروندے بنانے او رتوڑنے میں مصروف تھے۔قدرے بڑے لڑکے اور لڑکیاں سائیکلیں دوڑا رہے تھے۔ایک جانب رسیوں سے احاطہ سا بنا ہوا تھا جس کے اندر تیراکی کے لباس میں لڑکیاں بیچ والی بال میچ کھیل رہی تھیں۔کچھ شوقین مرد اور عورتیں میچ دیکھ رہے تھے۔ایک صاحبہ اپنے کتے کو لئے دوڑ رہی تھیں۔دو ایک کتے اپنے مالکوں کے ساتھ ساحل کی تفریح میں مصروف تھے۔کچھ لوگ کرسیاں رکھکر ساحل کے نزدیک بیٹھے ہوئے تھے۔ساحل کے اکلوتے ریسٹو رنٹ میں بھی کافی گہما گہمی تھی۔بہت سے لوگ ساحلِ سمندر پر کھانے پینے کا لطف اٹھا رہے تھے۔

اس گہما گہمی اور شور وپکار میں وہ مجھے سب سے جدا، سب سے الگ لگی۔میں اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔اسنے میری طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی بات کرتا اس نے کہا''ہماری فیملی میں لڑکیاں اجنبی لڑکوں سے بات نہیں کرتی ہیں اور نہ ہی ملتی ہیں''''او۔''میرے منہ سے ایک دم نکلا۔کیونکہ میرے لئے یہ بات بڑی عجیب تھی۔پھر میں نے دیکھا اس فیملی کی لڑکیاں علیحدہ بیٹھی تھیں اور لڑکے علیحدہ۔تھوڑی بڑی عمر کے لوگ علیحدہ ایک جگہ بیٹھے تھے، کچھ گپ شپ کررہے تھے، کچھ تاش کھیل رہے تھے، اور کچھ شطرنج میں مصروف تھے۔اتنے میں کیتھرین کا بھائی جارج آیا شاید اسنے مجھے اس کے نزدیک بیٹھے دیکھ لیا تھا۔

''کیتھرین تم یہاں کیا کررہی ہو تمہیں موم بلا رہی ہیں۔'' جارج کیتھرین کو مجھ سے دور کرنے کے لئے بولا اور وہ فوراً کھڑی ہوگئی میں جارج کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا''ہیری جیکسن۔''

جارج نے مجھے غور سے دیکھا۔تھوڑے توقف کے بعد اس نے ہاتھ بڑھایا اور بولا۔''جارج مرفی''۔جارج وہیں میرے قریب بیٹھ گیا اور ہم دونوں باتیں کرنے لگے۔پھر اس نے مجھے اپنے خاندان کے کچھ اور لوگوں سے ملوایا۔رات تک میں ان لوگوں کے ساتھ ہی رہا۔مگر کیتھرین سے میری بات نہ ہو سکی۔

رات کے دس بج رہے تھے۔سبھی لوگ بہت تھک گئے تھے۔پورا دن ساحل پر گزارنے کے بعد آہستہ آہستہ لوگ اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔اب اتنا ہجوم بھی نہیں رہا تھا۔کیتھرین کی پوری فیملی سے میری اچھی خاصی جان پہچان ہوچکی تھی۔ہم سب لوگ اپنی گاڑیوں کی طرف جارہے تھے۔ پارکنگ ایریا وہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔کیتھرین اپنی ماں اور بہن (این) کے ساتھ چل رہی تھی۔میں اس کے دونوں بھائیوں جارج اور رابرٹ کے ساتھ تھا لیکن میری نظریں بار بار کیتھرین کا تعاقب کررہی تھیں۔ایک دفعہ کیتھرین نے بھی میری طرف دیکھا، مجھ سے نظریں ملتے ہی اس نے جھینپ کر دوسری طرف نگاہ کرلی۔

میں گاڑی چلا رہا تھا لیکن مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے میں خود کو کیتھرین کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔گھر پہنچتے پہنچتے بہت دیر ہوگئی تھی۔بھوک بھی نہیں تھی جیسے تیسے لباس تبدیل کر کے لیٹ گیا۔صبح دیر سے آنکھ کھلی وہ بھی اس

طرح کہ میرا ایک دوست آدھمکا۔ وہ مجھے ریسٹورنٹ لے گیا وہاں ہم دونوں نے برنچ کیا۔ پھر وہ مووی پر چلنے کی ضد کرنے لگا۔ اگرچہ میرا دل بالکل نہیں چاہ رہا تھا مگر اس کی خاطر جانا پڑا۔ مووی چل رہی تھی مگر میں کہیں اور تھا۔۔۔۔۔

میں سوچنے لگا یہ مجھے کیا ہو گیا ہے ۔۔۔؟ زندگی میں بہت سی لڑکیاں آئیں مگر میں کبھی کسی لڑکی سے متاثر نہیں ہوا آخر کیتھرین میں ایسی کیا بات ہے کہ اس کا تصوّر، اس کا خیال، میرے ذہن و دل پر چھایا ہوا ہے۔ میرے دوست نے بھی میری طبیعت کی تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا وہ سمجھ رہا تھا شاید میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے مجھے گھر پر چھوڑا اور آرام کرنے کے لئے کہہ کر چلا گیا۔ صبح جوب پر جانا تھا جلدی سونے کی کوشش کی۔ مگر نیند تو جیسے کوسوں دور تھی۔۔۔۔ نہ جانے کب آنکھ لگی۔ صبح ہڑبڑا کر اٹھا، آٹھ بج رہے تھے، رات الارم لگانا بھی بھول گیا تھا۔ جلدی سے تیار ہو کر آفس بھاگا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ مجھے آفس کے کام سے پندرہ دن کے لئے فوری طور پر مشی گن جانا ہے۔ آفس سے گھر پہنچا۔ ضروری سامان پیک کیا اور مشی گن کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچتے ہی کام میں بری طرح مصروف ہو گیا۔

مشی گن سے واپسی پر میں بہت خوش تھا۔ میرے ذمّہ جو کام تھا وہ خوش اسلوبی سے ختم ہوا تھا۔ میں یہ سوچ کر بھی خوش ہو رہا تھا کہ شکاگو پہنچ کر کیتھرین سے ملوں گا۔۔۔ مگر کیسے۔۔۔۔؟ میرے پاس تو ان لوگوں کا پتہ بھی نہیں تھا۔ اچانک یاد آیا جارج نے مجھے اپنا کارڈ دیا تھا جس میں اس کے گھر کا فون نمبر بھی تھا۔ ''کارڈ کہاں ہو سکتا ہے۔۔۔؟'' میں نے اپنے ذہن پر زور دیا، میں نے گاڑی کی رفتار کم کر دی، ٹریفک جیسے تھا ہی نہیں، دور دور تک کوئی گاڑی نہیں تھی۔ میں نے اپنا پَرس نکالا، کارڈ پَرس میں سے جھانکنے لگا۔ میری خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ گھر پہنچ کر فون کرنے سے بمشکل اپنے آپ کو روکا کیونکہ رات زیادہ ہو گئی تھی۔ دوسرے دن جوب سے آتے ہی میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ جارج کا نمبر ملایا۔

''ہلو'' دوسری طرف سے نسوانی آواز آئی

'' میں ہیری جنکسن بول رہا ہوں ، جارج کا دوست ۔ آپ کون۔۔۔؟ میں نے ایک ہی سانس میں سب کہہ ڈالا۔

''جی میں کیتھرین بول رہی ہوں''۔ دوسری طرف سے آواز آئی'' بھائی گھر پر نہیں ہیں'' تھوڑے توقف کے بعد کیتھرین بولی۔

''کیا میں تم سے بات کر سکتا ہوں۔'' میں نے کہا

''جی۔'' اس کی ہلکی سی آواز آئی۔

''کیتھرین میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم سے بہت ساری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت بھی خدا نے میری سن لی۔ میں تم ہی سے بات کرنا چاہتا تھا۔''

''یہ ناممکن ہے ہماری کمیونٹی میں لڑکیاں غیر مردوں سے ملتی جلتی نہیں ہیں۔''

''میں بھائی کو بتا دوں گی کہ آپ نے کال کی تھی۔'' اس نے کہا اور پھر ''بائی'' کہہ کر فون رکھ دیا۔

رات میں جارج کا فون آیا۔ اس سے بہت ساری باتیں ہوئیں۔ اس نے ملنے کے لئے کہا اور یہ طے ہوا کہ میں ہفتے کی رات ڈنر اس کے گھر کروں۔ مارے خوشی کے میرا دل حلق میں آ گیا۔ لیکن جارج پر میں نے ظاہر ہونے نہیں دیا۔ اور ہفتہ کی رات کا وعدہ کر لیا۔

''آج بدھ ہے ابھی تو پورے تین دن باقی ہیں۔'' میں نے سوچا۔ یہ تین دن تین سال کی طرح گزرے۔ اللہ اللہ کر کے ہفتے کا دن آیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد میں اس جگہ پہنچا جہاں سے یہ آبادی شروع ہوتی تھی۔ درختوں میں گھرے بڑے بڑے مکانات۔ جس طرف نظر ڈالو خوبصورت پھول پودے۔ لان ایسے جیسے سبز قالین۔ جگہ جگہ چشمے، چھوٹے چھوٹے آبشار، تھوڑی دیر تک تو میں اس علاقے کی خوبصورتی میں کھو گیا۔ پھر مجھے خیال آیا مجھے گھر تلاش کرنا ہے۔ زیادہ دقّت نہیں ہوئی، دو تین گلیوں کے بعد مجھے وہ مکان نظر آ گیا۔ گھر پر خوبصورت تختی لگی ہوئی جس پر لکھا تھا ''جوزف مرفی لیگل کنسلٹینٹ''۔ مکان کا نمبر وہی تھا جو جارج نے بتایا تھا۔ میں نے بیل بجائی، دروازے پر جارج ہی آیا۔ وہ مجھے اندر لے گیا، لونگ روم میں بٹھایا، وہاں پر رابرٹ (جارج کا چھوٹا بھائی) اور جارج کے والد مسٹر جوزف بھی موجود تھے انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

''گھر تلاش کرنے میں کوئی دقت تو نہیں ہوئی۔''

''بہت زیادہ نہیں۔'' مسکراتے ہوئے کہا۔

کافی دیر تک گپ شپ کے بعد ہم لوگ ڈائینگ روم میں پہنچے۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ کھانے کی میز پر گھر کے سارے لوگ موجود تھے۔ ورنہ میں تو سوچ رہا تھا کہ آج کا آنا تو بے کار ہی جائیگا۔ کھانے کے دوران بھی باتیں ہوتی رہیں۔ سب ہی باتوں میں حصّہ لے رہے تھے۔ یہاں تک کہ کیتھرین کی نانی ہیلری جانسن بھی بول رہی تھیں۔ کیتھرین نے بھی گفتگو میں حصہ لیا لیکن بہت کم۔ اس کی بڑی بہن این بہت بول رہی تھی۔ میری نگاہیں بار بار کیتھرین پر جا کر ٹِک جاتیں۔ وہ مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے نروس ہو جاتی۔ پورا وقت میں یہی سوچتا رہا کہ کیتھرین سے مل کر کیسے اپنے دل کی بات کہوں۔

میں اس وقت لونگ روم میں تنہا بیٹھا تھا کہ سامنے راہداری سے کیتھرین کو گزرتے ہوئے دیکھ کر میں تیزی سے اٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا۔

''میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

'' اگر کسی نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو میری شامت آ جائیگی۔'' اس نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ جب تک تم میری بات نہیں سنوگی ۔'' میں نے کہا۔

''کل میرے اسکول کے گیٹ پر دو بجے۔'' یہ کہہ کر وہ بھاگ گئی۔

دوسرے دن وہ اپنی دوست حنا کے ساتھ گیٹ پر موجود تھی۔ میں گاڑی نزدیک لے گیا۔ وہ اپنی دوست کے ساتھ گاڑی میں پیچھے بیٹھ گئی۔ تھوڑی دور ایک پارک تھا اس کے نزدیک گاڑی روکی اور ہم لوگ پارک میں گئے۔ حنا نے ہم کو تنہا چھوڑ دیا اور خود تھوڑی دور جا کر بنچ پر بیٹھ گئی۔

''بولئے کیا بات ہے۔'' کیتھرین نے معصومیت اور شوخی سے کہا۔

''مجھے اس قسم کی باتیں کرنی نہیں آتیں اس لئے میں تم سے صاف صاف کہوں گا۔۔۔۔۔۔تم ہر وقت میرے سامنے رہتی ہو اور میں بہت ڈسٹرب ہوتا ہوں۔'' اتنا کہہ کر میں رکا۔ ایک نظر اس کی جانب ڈالی۔ وہ اپنی ہتھیلی کو دیکھ رہی تھی۔ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے اپنی نظریں اٹھائیں۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھیں ایک دم سے جادوئی ہوگئیں۔ اس کی پتلیوں میں نیلی روشنیاں چمک اٹھیں۔ میں نے ان نیلاہٹوں میں جھانکتے ہوئے اپنی بات پوری کی۔

'' جب سے تمہیں دیکھا ہے، سمجھ میں نہیں آتا مجھے کیا ہو گیا ہے۔۔؟''

میری دوبارہ خاموشی نے اسے بولنے پر مجبور کر دیا

''تو میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔۔۔''؟ اسنے سادگی اور بھولے پن سے کہا۔

''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' میں ایکدم بول گیا۔

میرے اس اظہارِ مدعا سے اس کے ہونٹ کانپنے لگے جیسے وہ بولنے کے لئے الفاظ ڈھونڈھ رہی ہو۔۔۔۔

''ہمارے گھر میں یہ فیصلے والدین کرتے ہیں۔'' اس نے ایک بار پھر ہتھیلی پر نظریں جما کر کہا۔

پھر ہم نجانے کیا کیا باتیں کرتے رہے، وقت کا ہوش ہی نہیں رہا۔ حنا نے نزدیک آ کر کہا۔ ''چار بجے بس آجائیگی۔''

دل تو نہیں چاہ رہا تھا مجبوراً ہم لوگوں کو چلنا پڑا۔

وقت گزرتا رہا۔ میرا کیتھرین کے گھر آنا جانا جاری رہا۔ اس کے دونوں بھائیوں جارج اور رابرٹ سے میری اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ کھانا ہم لوگ اکثر ساتھ ہی کھاتے اس کے بعد عورتیں فیملی روم میں اور مرد لونگ روم میں۔۔۔۔ اس سے پہلے میں نے اس طرح کی پابندیاں کہیں نہیں دیکھی تھیں۔ یہ پورا علاقہ ایسے ہی رسم و رواج رکھنے والے لوگوں کا تھا۔ کیتھرین نے اسے بتایا تھا کہ اس پورے علاقے میں ایک گھر بھی کسی اور کا نہیں ملے گا سوائے ہمارے لوگوں کے۔

اس علاقے کی عورتوں کا لباس ایسا ہوتا جس سے پورا جسم ڈھکا ہوتا۔ زیادہ تر لمبے اسکرٹ ان کا لباس ہوتا۔ جب یہ باہر نکلتیں تو ان کے بال ڈھکے ہوئے ہوتے۔ بڑوں کا ادب، چھوٹوں سے محبت۔ اٹھنے بیٹھنے میں، کھانے، پینے میں تہذیب اور اخلاق۔۔۔۔۔۔ میں یہ سب دیکھ کر بہت حیران تھا کہ یہ لوگ کون ہیں۔۔۔؟

اتنی پابندیوں کے باوجود میں اکثر کیتھرین سے تھوڑی بہت بات کرنے کا موقعہ نکال لیتا۔ اور کبھی یوں بھی ہوتا کیتھرین مجھے اپنی دوست حنا کے گھر بلا لیتی اور مختصر مختصر ملاقاتیں چرالی جاتیں۔ کیتھرین دوست بنانے میں بہت کنجوس تھی، اس کی صرف ایک ہی دوست تھی۔۔ حنا۔۔۔۔ حنا ایک مسلم لڑکی تھی اور بہت اچھی فیملی سے اس کا تعلق تھا۔ حنا اور کیتھرین کی فیملی میں خاندانی مراسم تھے۔ ہر تقریب میں دونوں خاندان ضرور اکھٹا ہوتے۔ کیتھرین کی وجہ سے حنا کے سارے گھر والے مجھ سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے، بلکہ میری حیثیت اس گھر کے ایک فرد جیسی تھی۔

وقت گزرا چلا گیا حنا اور کیتھرین کے اسکول کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا اور انہی دنوں این کی شادی بھی ہوگئی۔ شادی میں مجھکو بھی دعوت نامہ دیا گیا تھا۔ اس سے مجھے دوہری خوشی ہوئی۔ اس چھوت چھات والے خاندان میں میری باعزت رسائی اور دوسرے یہ کہ این کی شادی سے کیتھرین کی شادی کے لئے راستہ کھلا تھا۔ کیتھرین نے مجھے بتایا تھا ''جب تک این کی شادی نہیں ہو جاتی میری شادی کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ہمارے پاس بڑی بہن کی شادی پہلے ہوتی ہے۔''

کیتھرین ماں کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ اس کی تعلیم ختم کر دی گئی تھی۔ حنا کے گھر والوں نے اسے یونیورسٹی میں داخلہ دلوا دیا تھا۔ ہمارے ملنے میں اب بڑی رکاوٹیں تھیں۔ ایک طویل وقفے کے بعد ہم نے ایک ملاقات چرالی، حنا کی مہربانی سے۔۔۔ میں آپے سے باہر ہو گیا میں نے کیتھرین کو لپٹا لیا، اس نے بھی جیسے اپنے آپ کو میرے سپرد کر دیا۔ حنا نے سپردگی کے اس لمحے کو اس طرح طول دیا کہ کچھ دیر کے لئے وہ لونگ روم سے اندر کی طرف چلی گئی، ہم دونوں کے لئے جوس لانے کے بہانے۔۔۔۔۔۔ اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر میں نے کیتھرین سے کہا۔ ''اب تو این کی شادی ہوگئی میں تمہارے والدین سے اپنی اور تمہاری شادی کی بات کرتا ہوں۔'' کیتھرین نے ''ہاں میں گردن ہلائی۔

دوسرے دن میں جارج سے ریسٹورنٹ میں ملا اور اس سے بولا۔

''جارج تم میرے دوست ہو اس معاملے میں تم ہی میری مدد کر سکتے ہو۔۔۔۔ میں اور کیتھرین ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''جارج نے میری طرف دیکھا پھر تھوڑے توقف کے بعد بولا۔

''ہیری ہم لوگ شادی بیاہ صرف اپنی کمیونٹی کے اندر ہی کرتے

ہیں۔پھر بھی میں موم اور ڈیڈ سے بات کروں گا''

اور پھر جو کچھ ہوا وہ ہماری توقع کے بالکل خلاف۔۔۔۔کیتھرین کو شاید اس کا اندازہ تھا مگر مجھ کو نہیں۔جارج نے مجھے بتایا۔

''ہیری میں نے بہت کوشش کی موم ااور ڈیڈ کو بہت سمجھایا لیکن وہ نہیں مانے ۔ایک تو تم ہماری کمیونٹی سے باہر ہو، دوسرے تمہارا فیملی بیک گراؤنڈ۔'' جارج یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

میں نے ہی تو ان کو بتایا تھا کہ جب میں چار سال کا تھا تو میرے موم ڈیڈ علیحدہ ہو گئے تھے اور پھر دونوں نے علیحدہ علیحدہ شادیاں کر لی تھیں۔میں کبھی موم کے پاس رہتا تھا اور کبھی ڈیڈ کے پاس۔۔۔۔میری سوتیلی ماں کو بھی میرا رہنا پسند نہیں تھا اور میرا سوتیلا باپ بھی نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کے گھر رہوں ۔ یہی وجہ تھی کہ میں ہائی اسکول کے بعد گھر چھوڑ دیا تھا۔ جو کچھ بھی میں تھا اور جیسا بھی تھا خود تشکیل کردہ (Self made) تھا۔

جارج کے جواب نے میرا دل توڑ دیا تھا۔وہ میرے دل کی حالت سمجھ رہا تھا۔اس نے مجھے دلاسہ دیا۔''تم بہت اچھے لڑکے ہو تمہیں کیتھرین سے اچھی لڑکی مل جائیگی۔۔۔وغیرہ غیرہ۔۔۔لیکن میں تو جیسے ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے پھر وہ اٹھا محبت سے اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور خاموشی سے چلا گیا۔میں بھی اس وقت تنہا رہنا چاہتا تھا۔ جارج کے جانے کے بعد میں نے یہ بات فون پر کیتھرین کو بتائی۔وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔۔۔شاید رو رہی تھی پھر اس کی سسکیاں صاف سنائی دیں اور فون بند ہو گیا۔'' سنا تو میں نے بھی تھا (Calvinist) کیلوینسٹ لوگ سب سے الگ تھلگ سوچ رکھنے والے ہوتے ہیں، اب دیکھ بھی لیا۔''

''میں نے حنا سے مدد چاہی۔۔۔۔دو تین دن خاموشی سے گزر گئے۔میں بہت بے چین تھا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔۔۔۔؟''

ایک ہفتے کے بعد حنا کا فون آیا اس نے کہا'' کہ آج شام کیتھرین کو اس نے اپنے گھر بلایا ہے میں وہیں پہنچ جاؤں۔''

''کیتھرین مجھ سے لپٹ کر بہت روئی۔۔۔اس نے بتایا کہ اس کے گھر والوں نے اس کی بات آئن (Ian) سے طے کر دی ہے۔اور بہت جلد کسی تاریخ کا فیصلہ کر کے اس کی منگنی ہو جائیگی۔'' آئن انہی کی کمیونٹی کا تھا۔میں اس سے این کی شادی میں ملا بھی تھا۔بہت اچھا لڑکا تھا حال ہی میں اس نے اپنی تعلیم ختم کی تھی۔میری اس سے اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے۔۔۔۔کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔۔۔۔پھر میں نے کیتھرین سے کہا۔

'' ہمارے سامنے ایک ہی راستہ ہے کیتھی تم میرے ساتھ نکل چلو۔۔۔۔''

''اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔۔۔پھر شاید اس کی سمجھ میں آ گیا۔''

حنا نے ہمارے اس طرح بھاگنے کی مخالفت کی۔۔۔۔۔لیکن پھر وہ خاموش ہو گئی۔کیونکہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ ہی نہ تھا۔

میں نے جوب چھوڑی، اپارٹمنٹ چھوڑا اور ایک رات ہم شکاگو سے ڈیٹرائنڈ (Detroid) کی طرف چل دیئے۔ میرے کہنے کے مطابق کیتھرین نے اپنے چار جوڑے کپڑے، اسناد، اور ضروری کاغذات ساتھ لئے کوئی قیمتی چیز یا زیور وغیرہ نہیں لیا سوائے اس کے نام کے لاکٹ کے جو اس کی خوبصورت گردن میں ہر وقت جھلملاتا رہتا تھا، یہ لاکٹ اس کے موم ڈیڈ نے اس کی ایک سالگرہ پر اس کو دیا تھا جب ہم ہوٹل پہنچے تو ہم دونوں بہت تھکے ہوئے تھے۔۔۔سو گئے۔۔۔سو کر اٹھے نہا دھو کر نیچے ہال میں آئے۔ برنچ کیا اور فوراً چرچ گئے۔اس چرچ سے ہم کو صحیح جواب نہیں ملا۔البتہ دوسرے چرچ میں انتہائی سادہ طریقے سے ہم نے شادی کر لی۔اس سے قبل ہم قانونی شادی کی شرط سے فراغت حاصل کر چکے تھے۔کیتھرین اس تمام دوران زیادہ تر خاموش ہی رہی۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ ''اگر تمہیں ایسا لگتا ہے کہ یہ ہمارا غلط فیصلہ ہے تو ہم واپس چلتے ہیں۔تمہارے والدین سے معافی مانگ لیں گے۔۔۔۔'' مگر اس نے انکار کر دیا۔

شادی کے بعد فادر نے ہماری اچھی زندگی کے لئے دعائیں کیں۔اور ہم دونوں کے سر پر ہاتھ رکھا تو کیتھرین رو پڑی۔میں سمجھ سکتا تھا اس وقت اس کے جذبات کیا ہونگے۔۔۔۔اسے اپنے گھر کے سبھی لوگ بے حد یاد آ رہے ہونگے خاص طور پر موم اور ڈیڈ۔ میں نے اس کے لئے دلہن کا ڈریس، ایک چھوٹا سا گولڈ کا سیٹ اور ایک ڈائمنڈ رنگ خریدی تھی۔لباسِ عروسی میں وہ آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور لگ رہی تھی۔ میں اس پر دوبارہ عاشق ہو گیا۔ ۔۔۔ہم دونوں نے خاوند اور بیوی کے طور پر حلف اور عہد کے الفاظ ادا کئے۔پھر فادر کے کہنے پر میں نے کیتھرین کا پہلا بوسہ لیا۔وہ بوسہ اب بھی میرے ہونٹوں پر تازہ ہے۔۔۔۔۔

رات کو ہم دونوں نے ڈنر کیا۔کوئی اور جاننے والا تو تھا نہیں جو ہمارے ساتھ ڈنر میں شریک ہوتا۔۔۔ہم دونوں اکیلے ہی تھے۔سامنے کی ٹیبل پر ایک عمر رسیدہ جوڑا بیٹھا تھا وہ ہمارے پاس آیا اور اس نے ہمیں مبارکباد دی۔ ہم نے ان سے کہا وہ ہمارے ساتھ ڈنر میں شریک ہوں۔۔۔۔وہ راضی ہو گئے ۔دونوں میاں بیوی بہت خوش مزاج تھے۔خوب گپ شپ، ہنسی مذاق، ہوتا رہا دونوں میں سے کسی نے بھی کوئی پرسنل بات نہیں کی۔البتہ چلتے وقت دونوں نے کیتھی کو باری باری لپٹایا اور دعائیں دیں۔

میں نے جوب تلاش کرنا شروع کر دی اور فوری گزارے کے لیے ایک گیس اسٹیشن کے اسٹور میں جوب کر لی۔رات کی جوب تھی جو ایک نئے شادی شدہ جوڑے کے لئے ناپسندیدہ ہونی ہی تھی۔لیکن اس کا ایک فائدہ یہ بھی

تھا کہ میں دن میں اپنے فیلڈ کی جوب تلاش کرنے کے لئے آزاد تھا۔ ہوٹل کے کمر توڑ خرچ سے بچنے کے لئے گیس اسٹیشن کے نزدیک ہی ایک کمرے کا اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا۔

اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ سے ہماری نئی شادی شدہ زندگی کا آغاز ہوا۔ ہم دونوں بہت خوش تھے۔ کیتھی نے اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ کو بہت خوبصورت طریقے سے سجایا تھا۔ جب میں جوب سے اس چھوٹے سے خوبصورت گھر میں آتا، کیتھی کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھاتا، اس کی محبت بھری باتیں سنتا، اسکی نیلی سمندر جیسی گہری آنکھوں میں چراغ جھلملاتے دیکھتا تو سوچتا۔۔۔ جنت شاید یہی ہے۔۔۔۔۔

کبھی کبھی کیتھی بہت دکھی سی ہو جاتی تھی۔ شاید اس کو اپنی موم کی یاد ستاتی ہو۔۔۔۔۔ یا پھر ڈیڈ کو صدمہ پہنچانے کی کھٹک۔۔۔ وہ ایک باضمیر اور حساس ہستی تھی۔ میرا دل اس کے لئے احساسِ جرم کا بوجھ اٹھائے پھرتا تھا۔ یہ میں ہی تھا جس نے اس کو اس کے خاندان سے کاٹ دیا تھا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ بہت جلد اس کو ایک خوبصورت سا بڑا سا گھر لے کر دے دوں، دنیا کا سارا عیش اس کے قدموں میں ڈال دوں۔ ہم دونوں اگرچہ پریشانی کی زندگی گزار رہے تھے لیکن پھر بھی بہت خوش تھے۔ کیتھرین کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی بے حد خوش ہو جاتی تھی۔ اسنے مجھے کبھی محسوس نہیں ہونے دیا کو وہ اپنی عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر میرے ساتھ تکلیف کی زندگی گزار رہی ہے۔ اس کی کمیونٹی میں عورتیں جوب نہیں کرتیں۔ لیکن اس نے میرا حوصلہ بڑھانے کے لئے خود جوب کرنے کی پیشکش کی۔ میں نے مسکرا کر ٹال دیا۔ جلد ہی مونٹریال سے ایک جوب کا آفر آیا۔ انٹرویو سے قبل ہم لوگ ٹورانٹو گئے وہاں نیاگرا فال کے ایک موٹیل میں قیام کیا۔ یہاں سے فال بالکل صاف نظر آتا تھا۔ کیتھرین فال دیکھ کر بچوں کی طرح خوشی سے اچھلنے لگی۔

یہاں پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ ہر قسم کے لوگ۔ ہر قوم کے لوگ۔ مختلف رنگ و نسل کے لوگ۔ مختلف ملکوں کے لوگ۔ لوگ ہی لوگ۔ سیّاح۔ مقامی۔ طرح طرح کے لباسوں میں ملبوس۔ کچھ جیسے بے لباس سب اپنے اپنے طریقے سے جینے کے مزے لوٹ رہے تھے۔ گھوم پھر رہے تھے۔ جب چلتے چلتے تھک جاتے تو بیٹھ جاتے، پھر چلنے لگتے ہم دونوں بھی گھوم رہے تھے۔ ہم نے آئسکریم کھائی، ایک ہوٹل میں ناشتہ کیا، اس ہوٹل میں ناشتہ صبح سے دوپہر تک ملتا ہے۔ ناشتہ کر کے ہم فال کی طرف روانہ ہوئے۔

نیاگرا سے میرا پہلی بار سامنا نہیں ہوا تھا۔ لیکن کیتھی نے اس سے قبل نیاگرا اپنی موم کی گود میں دیکھا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد کیتھی نے پہلی مرتبہ نیاگرا کو اپنے مقابل پایا۔ پانی کی بوندوں کی بوچھاڑ سے اسکا چہرہ بھیگ گیا۔ پانی اس کی آنکھوں میں بھی بار بار جا رہا تھا اور آنکھوں کو ہاتھ سے صاف کرنے کی ضرورت پڑ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''کیتھی ڈارلنگ آنکھوں کو بھیگی رہنے دو اور دیکھو ہمارے سامنے نیاگرا کھڑا ہے، بہتے اور گرتے پانی کی بڑی سی چادر لئے۔۔۔ عظیم نیاگرا۔۔۔ وسیع و عریض نیاگرا۔۔۔ ایک زندہ اور متحرک وجود جو اوپر آسمان اور نیچے چٹانوں سے بنی ہوئی زمین پر ایک جانب سے دوسری جانب تک پھیلا ہوا ہے۔۔۔۔۔'' میرے الفاظ پتہ نہیں اس کے کانوں میں جا رہے تھے یا وہ نیاگرا فال کی آواز سن رہی تھی۔۔۔۔

نیاگرا کی اپنی ایک آواز تھی۔۔۔ ایسی آواز جو سماعتوں کے لئے نہیں ہوتی بلکہ وجودوں کے لیئے ہوتی ہے۔۔۔ ایک وجود سے دوسرے وجودوں میں داخل ہو کر ان کو اپنی لپیٹ میں لینے والی۔۔۔۔ ان کے اندر گردش کرنے والی۔۔۔ اس آواز سے ہم رشتہ آواز جو تخلیق کائنات کا آغاز کر کے ختم نہیں ہوتی بلکہ زمان و مکان کی ہر چھوٹی بڑی اکائی میں موجود ہے۔۔۔ دراز سے دراز تر۔۔۔ وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔۔۔ میں نے کیتھی کو۔۔ کیتھی کے سارے وجود کو۔۔ نیاگرا کے وجود سے ہم آہنگ ہوتے دیکھا۔ ساتھ ہی مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ نیاگرا پہلی بار مجھے دکھائی بھی دیا اور سنائی بھی دیا۔۔۔ کیتھی کے وجود کے ذریعہ۔

اور جب ہم دونوں نے ایک ساتھ سَت رنگی دھنک کی کمان پر نظر ڈالی۔ جس کی جانب ساری دیکھنے والی آنکھیں انگلیوں سے اشارہ کر کے دیکھ رہی تھیں اور اپنے ساتھیوں اور پیاروں کو دکھا رہی تھیں تو شاید ہم دونوں کو ایک سا احساس ہوا۔۔۔ خالق کے جلال سے جمال کا احساس۔۔۔ ذہن اور روح کو ہلکا کرنے والا۔۔۔ طفلانہ حیرانی کا۔۔۔ معصوم مسرت اور طمانیت کا۔ دوسرا دن ہم نے لیک شور (Lakeshore) میں اس جگہ گزارا جہاں ہسکروں (Huskers) نے میلہ لگا رکھا تھا۔ وہاں ٹکٹ وغیرہ کی بکنگ نہیں تھی۔ ہر شو کے بعد ہیٹ کو چکر دلواتے اور لوگ اس ہیٹ میں پیسے پھینک دیتے۔ وہاں لوگوں کا زبردست ہجوم تھا، لوگوں کا شانے سے شانہ چھلتا تھا۔ کیتھرین نے وہاں سے اپنے لئے ایک ہیٹ خریدا اور میرے لئے ٹائی پن اور کفلنگ کا ایک سیٹ لیا۔ پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک ہیومن اسٹیچو کے سامنے لے گئی۔ ایک جوان خوبصورت عورت، وِشنگ فیئری، کیسینڈرا (Cassandra) کا مجسمہ بنی بیٹھی تھی۔

''تم بھی کوئی خواہش (Wish) کرو۔'' ضرور تمہاری خواہش پوری ہوگی۔ کیتھرین بولی۔

میں نے آنکھ بند کر کے دعا کی، میرے بعد کیتھی نے دعا کی۔

''کیا مانگا۔؟'' کیتھی نے پوچھا

''تمہاری خوشیاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اور تم نے۔؟'' میں نے کہا۔

''تمہاری خوشیاں، تمہارا ساتھ، اس نے جواب دیا۔

میں نے محبت سے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

ہوٹل پہنچے تو کافی رات ہو چکی تھی۔اور ہم تھک بھی بہت گئے تھے۔ لیٹتے ہی سو گئے۔

صبح آنکھ دیر سے کھلی۔ناشتہ کرتے ہی ہم مونٹریال کے لئے نکل گئے۔دوسرے دن میرا انٹرویو تھا۔

انٹرویو بہت کامیاب رہا۔۔۔ایک ہفتے کے بعد مجھے جوائن کرنا تھا۔ہم دونوں مونٹریال میں گھومتے رہے خاص طور پر پورٹ کا علاقہ اور قدیم شہر۔۔۔۔سترھویں (۱۷) سے لیکر انیسویں (۱۹) صدی کے آرکیٹیکچر کی یادگار عمارتیں۔۔۔اور پرانی وضع کی اینٹوں سے بنی ہوئی سڑکیں۔۔۔۔آج کی دنیا میں رہتے ہوئے پرانی دنیا میں سانس لینے کا احساس۔۔۔۔مونٹریال قدیم انگلینڈ اور خاص طور پر فرانس کی بازیافت کا شہر۔۔۔۔ہم دونوں تاریخ کی کتاب کے اوراق الٹے بغیر تاریخ کا مطالعہ بلکہ مشاہدہ کر رہے تھے۔شاید ہم اس با زیافت میں گم سے ہو گئے تھے۔اس نے کہا یہ وہی شہر ہے جس میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان فیصلہ کن جنگ ہوئی تھی اور انگریزوں کو کامیابی حاصل ہو ئی تھی۔ہم دونوں کو یہ شہر راس آیا یا شاید اس شہر کو ہم پسند آئے تھے۔یہ شہر ان لو گوں کو کھلے دل سے قبول کرتا ہے جو فرانسیسی زبان بول سکتے ہوں۔یا بولنے کی کوشش کرتے ہوں۔ہم دونوں گھر سے باہر فرنچ بولنے لگے۔کچھ عرصہ مونٹریال میں ایک اپارٹمنٹ میں رہے اس کے بعد میں نے ایک ایسے گھر کی تلا ش شروع کر دی جو کیتھی کے شکاگو کے گھر سے زیادہ سے زیادہ مشابہہ ہو۔ شومیڈی لاوال □ (Chomedy laval) میں ہمیں ایک ایسا ہی گھر مل گیا۔۔۔بڑا سا۔۔۔کھلا کھلا۔۔۔بڑا سا خوبصورت بیک یارڈ۔۔۔سامنے پھول پودوں سے ڈھکا ہوا ہرا بھرا لان۔پڑوسی ملنسار تھے۔یہ ایک نئی آبادی تھی، بے حد صاف ستھری۔یہ سوسائٹی جدید طرز میں پلان کی گئی تھی۔۔۔ایک دائرے کے اندر۔بالآخر کیوبک نے ہم بے گھروں کو گود لے لیا تھا۔ہم جلد ہی گھر والے ہی نہیں بلکہ خاندان والے بن گئے۔البتہ ایک کانٹا ابھی تک کھٹک رہا تھا۔ہم کیتھرین کے خاندان سے ابھی تک روابط استوار کرنے میں ناکام رہے تھے۔ پھر بھی ہم اپنے دو بچوں پال اور میری کے ساتھ بہت خوش تھے۔بچوں اور گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی۔ویکینڈ پر ہم گھومنے پھرنے نکل جاتے۔یہاں ہمارے دوستوں کا اچھا خاصا حلقہ بن گیا تھا۔

حنا (کیتھی کی دوست) سے ہمارا رابطہ تھا۔اس کی شادی ہو چکی تھی اور وہ شکاگو ہی میں رہ رہی تھی۔اپنے شوہر کے ساتھ وہ اکثر چھٹیوں میں ہمارے گھر آجاتی۔کیتھرین کی بہن این لندن میں رہتی تھی۔اس کا شوہر ان ہی کی کمیونٹی سے تھا۔اس لئے اس نے این کو کیتھرین سے تعلقات رکھنے سے منع کر رکھا تھا۔ لیکن پھر بھی ہر سال این کرسمس پر اپنے شوہر سے چھپ کر کیتھرین کو ضرور فون کرتی۔ کیتھرین نے اپنی نانی کی وفات کی خبر ملنے پر بہت سوگ منایا تھا۔۔۔ حنا نے بتایا تھا کہ مرتے وقت کیتھرین کو اس کی نانی نے بہت یاد کیا تھا۔وہ ملنے کے لئے بھی بہت تڑپتی رہی تھیں۔۔۔جارج سے میری دوستی قائم تھی شروع میں وہ مجھ سے بہت ناراض رہا،لیکن آہستہ آہستہ اس کی ناراضگی کم ہو گئی۔جب میں نے اس کو فون پر پال کی پیدائش کی اطلاع دی تھی تو وہ بے حد خوش ہوا تھا۔ فون پر اس کی بیوی بھی کبھی کبھی بات کر لیتی۔جارج پال کی دوسری سالگرہ پر اپنی بیوی اور ننھی سی بیٹی کے ساتھ آیا تھا۔اس دن کیتھرین کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا میں نے اس سے پہلے کبھی کیتھی کو اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔

کیتھی میری چھوٹی سے چھوٹی خوشی کا بے حد خیال رکھتی تھی لیکن کبھی کبھی اچانک اداس ہو جاتی اپنے گھر اور اپنے لوگوں کی باتیں کرتے سمے ۔۔۔دن، ہفتے، مہینے، اور برس گزر رہے تھے۔لیکن ہماری خوشیوں کے گلاب میں کانٹا بدستور کھٹک رہا تھا۔کیتھرین آہستہ آہستہ جیسے ٹوٹتی جا رہی تھی۔وہ جلد تھکنے لگی تھی اکثر کھوسی جاتی۔میں نے سوچا شاید اس پر بچوں کی وجہ سے کام کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔میں نے خود کو اس کے کاموں میں داخل کرنا شروع کر دیا۔ اسکو یوں ظاہر کرتا جیسے میں اپنے شوق سے یہ سب کام کر رہا ہوں۔اس کے علاوہ مہینے میں دو مرتبہ گھر کی صفائی کے لئے ایک خادمہ کا انتظام کر دیا تھا۔۔۔ادھیڑ عمر کی جولیا اسٹیل بے انتہا مستعد اور محنتی خاتون تھیں، پورے گھر کو آئینے کی طرح چمکا دیتی تھیں۔یہ سب کرنے کے باوجود بھی میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کسی پرانی عمارت کی مانند ڈھے جا رہی تھی۔یا وہ ایک شاخِ گلاب تھی جس پر پھپھوند آ گئی تھی۔۔۔افسوس میں نے اپنی کیتھی کے لئے پھپھوند جیسا لفظ استعمال کر گیا۔مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔کیتھی میرے سینے میں گلاب کی طرح کھلی تھی ،اور ہمیشہ مہکتی، دمکتی رہے گی میں کیتھی کے لئے بہت فکر مند تھا۔لیکن جب میں نے کیتھی سے ڈاکٹر سے مشورہ لینے کی بات کی تو وہ حیران سی ہو گئی۔

''کیوں مجھے کیا ہوا ہے۔؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''تمہیں کچھ نہیں ہوا ہے ڈارلنگ لیکن ڈاکٹر سے مل لینے میں کیا حرج ہے۔'' میں نے جواب دیا

''پھر بھی۔۔۔میں ڈاکٹر سے کیا کہونگی۔'' اس کے اس سوال نے مجھے لاجواب کر دیا۔

وہ بہت بھولنے لگی تھی۔میں اسے Bills دے کر جاتا کہ Pay کر دینا۔۔۔جب آکر پوچھتا تو کہتی ''کون سے Bills۔تم نے مجھ سے کب کہا تھا بل پے کرنے کے لئے۔؟''

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کھانا کھانے کے کچھ دیر بعد وہ کہتی ''ابھی تک ہم نے کھانا نہیں کھایا۔''

میں اسے یاد دلاتا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی ہم نے کھانا کھایا ہے ۔مگر وہ نہیں مانتی اور کہتی۔''تمہیں نہیں کھانا ہے تو نہ کھاؤ۔'' اور خود کھانا کھانے بیٹھ جاتی۔

بالآخر میں اس کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے میں کامیاب ہو

گیا۔۔۔ اس کے کئی ٹیسٹ ہوئے ۔ ایک ٹیسٹ جس کو(Neuro Imaging Test)نیوروامیجنگ ٹیسٹ کہتے ہیں ۔ وہ بھی ہوا اس کے علاوہ حافظے سے متعلق اور بھی ٹیسٹ ہوئے ۔ڈاکٹرز کے ساتھ ہماری میٹنگس (Meetings)ہوئیں۔تقریباً دوماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔پھر ایک دن ڈاکٹر نے بتایا کہ کیتھرین الزیمر(Alzheimer) کے ابتدائی اسٹیج میں ہے۔ڈاکٹر نے مجھے بہت ساری ہدایات دیں۔ پابندی سے دوائیاں کھلانے کے لئے کہا اور تسلی دی کہ وہ بہت جلد اچھی ہوجائیگی۔

میں نے کیتھرین کو کچھ نہیں بتایا۔صرف یہ کہ کمزوری ہے ۔کچھ وٹامنز ڈاکٹر نے دیئے ہیں۔۔۔البتہ ایک خادمہ کا انتظام کیا کہ جب تک میں آفس میں رہوں وہ کیتھرین اور بچوں کی دیکھ بھال کرے۔بچوں کو اسکول چھوڑنے اور لانے کی ذمہ داری بھی میں نے خود ہی سنبھال لی۔کیتھرین کبھی کبھی خود ہی ہر کام کرنے کو کہتی۔۔۔''میں یہ کہ کر کہ پہلے تم پوری طرح صحتیاب ہوجاؤ۔۔۔ڈاکٹر نے تمہیں آرام کرنے کے لئے کہا ہے۔۔۔اسے کام کرنے سے روکتا۔''اس کی دوائیاں اور علاج جاری تھا۔ڈاکٹرز بھی بہت حوصلہ دیتے کہ کیتھرین جلد صحت یاب ہوجائیگی۔

اتوار کا دن تھا،موسم بہت خراب تھا،ساری رات برف برستی رہی تھی۔ میں نے کیتھرین کو دیکھا وہ سو رہی تھی۔ وہ دیر تک سوتی رہی۔ میں نے ناشتہ تیار کیا۔۔۔کیتھرین کو اٹھایا۔وہ مشکل سے جاگی اور دیر تک اپنی خوبصورت انگلیوں سے آنکھیں ملتی رہی۔۔۔ایسا ہماری شادی شدہ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا ۔وہ تو بستر سے ایسے اٹھتی جیسے چھلانگ لگائی جاتی ہے۔میں نے اسے ایسا کرنے پر ٹوکا بھی تھا۔اس کا اس طرح بستر پر بیٹھے رہنا اور آنکھیں مَلتے رہنا میرے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔میں بستر کے پاس کھڑا اسے دیکھتا رہا۔تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں ۔عجیب سی آنکھیں تھیں ۔۔۔آنکھوں کی پتلیوں کا نیلا رنگ بھورا ہوگیا تھا۔اس کے اندر کی جادو بھری۔۔۔رنگ اور نور کو ملا کر تیار کی ہوئی تجلی غائب تھی۔ میں اس کے اور زیادہ قریب ہوگیا ۔۔۔اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آواز دی۔۔۔کیتھی۔۔۔کیتھی ڈارلنگ۔مگر ان آنکھوں میں کوئی ہلچل نہیں ہوئی۔۔۔وہ مجھکو دیکھ کر بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔کیتھرین مجھے پہچان ہی نہیں رہی تھی۔۔۔وہ ماحول کو بھی نہیں پہچان رہی تھی۔وہ ہماری دنیا سے کسی اور دنیا میں چلی گئی تھی۔ میں نے دونوں بچوں کو اس کے سامنے کھڑا کر دیا۔اس نے ان کو بھی نہیں پہچانا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر کوشش کی کہ کیتھرین کے والدین ہم لوگوں سے اپنی ناراضگی ختم کردیں۔ان کو یہ امید بھی ظاہر کی مبادا کیتھی ان سے مل کر ہماری اور ان کی دنیا میں واپس آجائے۔اور نارمل ہوجائے۔اس کی والدہ تو رونے لگتی تھیں۔لیکن والد ملنے پر رضامند نہ ہوئے۔ایک دن فون پر میں نے رو رو کر اور گڑگڑا کر ان کو بہت راضی کرنے کی کوشش کی تو وہ بے اختیار رو پڑے لیکن راضی نہ ہونا تھا نہ ہوئے۔فون بند کرنے کے بعد میں پھوٹ پھوٹ کر رویا اور روتے روتے میری آنکھ لگ گئی۔ نیند میں مجھ کو یہ احساس ہوا کہ میں کیتھی کے ساتھ نیاگرا کے بالکل مقابل کھڑا ہوں اور نیاگرا ہم دونوں سے باتیں کررہا ہے اپنی مخصوص آواز میں۔۔۔۔دوسری رات بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔تیسری رات میں بھی نیاگرا ہمارے سامنے تھا اور کیتھرین نارمل حالت میں اس سے مصروفِ گفتگو تھی۔۔۔۔۔۔۔تیسری رات کے اس خواب یا حیران کُن وژن نے میرے اندر زبردست تحریک ڈال دی۔میں نے فیصلہ کیا کہ کیتھی کو ساتھ لے کر نیاگرا کا سامنا کروں گا۔تاکہ تین راتوں میں جو کچھ دیکھا، یا مجھے دکھایا گیا ہے اس کو حقیقت کا روپ دے سکوں۔میں جانتا تھا کیتھی کو اس حالت میں ساتھ لے کر سفر کرنا آسان نہ ہوگا۔مگر میرے اندر مجھے کوئی اس اقدام پر مجبور کررہا تھا۔ میرے ذہن کے کسی کونے میں یہ خطرہ بھی موجود تھا کہ کہیں میں کیتھی کو ہمیشہ کے لئے کھو نہ دوں۔کیتھی کے ڈاکٹر نے بھی مجھے وارننگ دی تھی کہ تم کیتھی کو کسی بڑے خطرے میں مبتلا کرنے جارہے ہو۔میں نے دونوں بچوں کو اپنے دوست کے پاس چھوڑا اور بالآخر کیتھی کو نیاگرا فال لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔

کیتھی وہیل چیئر پر تھی اور میں اس کی چیئر تھامے کھڑا تھا۔نیاگرا اپنی پوری شان کے ساتھ ہمارے مقابل موجود تھا،اس کی آواز ہمیں اور ساری کائنات کو اپنے سحر میں لئے ہوئی تھی۔ میں چیخ چیخ کر رو رہا تھا اور نیاگرا سے مخاطب تھا۔۔۔۔۔۔۔لوگوں کا ہجوم ہم دونوں کو گھیرے میں لے رہا تھا اور آہستہ آہستہ ان کا گھیرا تنگ ہوتا جارہا تھا۔نیاگرا کی پھوار۔۔۔اور خود میرے آنسوؤں سے میرا چہرہ تربتر ہورہا تھا۔کیتھی کی آنکھیں بھی نیاگرا کے پانی سے بھیگ رہی تھیں۔ میں نیاگرا سے مخاطب تھا اور چلاّ چلاّ کر کہ رہا تھا۔نیاگرا۔۔۔او۔۔۔نیاگرا تو نے ہمیں بلایا ہے۔میں اور کیتھی تیرے سامنے ہیں۔جس خدا نے تجھے اتنا عجیب،اتنا وسیع،اتنا عظیم، بنایا ہے اس خدا سے میں اپنی کیتھی کی تندرستی مانگتا ہوں۔۔۔یا خدا! میری کیتھی کو مجھے واپس دیدے۔۔۔میں اور نہ جانے کیا کیا بکتا رہا۔۔۔چیختا رہا۔۔۔روتا رہا۔۔۔اچانک کیتھی کے بازو میری ٹانگوں سے لپٹ گئے۔میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔اس دوران وہ کرسی سے اتر رہی تھی، جیسے ہی میں کرسی کے سامنے آیا وہ مجھ سے لپٹ گئی۔میرے گیلے چہرے پر اپنے پیارے پیارے ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں نے جھک کر اسے گود میں اٹھالیا۔اس کے چہرے کو،اس کی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے چھوا۔۔۔اس کی آنکھوں میں نیلی روشنیاں جھلملانے لگی تھیں۔۔۔ میری کیتھی واپس آچکی تھی۔ مجمے نے جب ہم دونوں کو ایک دوسرے سے لپٹتے اور پیار کرتے دیکھا تو ان کا گھیراؤ خود بخود ختم ہوگیا۔سب ہنس رہے تھے۔کسی نے آواز لگائی''کریزی۔''ان میں سے کسی کو بھی اصل معاملے کی خبر نہیں تھی۔ ان میں سے کسی کو یہ پتہ نہیں تھا کہ میں''کریزی''نہیں بلکہ دنیا کا''سب سے خوش نصیب آدمی ہوں۔''

''خیالِ خاطر''

عروب شاہد

(اسلام آباد)

شہناز خانم کے افسانوں کو میں نے اپنی بساط بھر پڑھ کر دیکھا ہے اور میں پڑھنے والوں کو اطمینان دلا سکتا ہوں کہ یہ وہ نیا افسانہ نہیں ہے جو کہانی سے بے نیاز ہوگیا تھا یہ خالصتاً کہانی والا افسانہ ہے۔ بلکہ شہناز خانم کا امتیاز اسی بات میں ہیکہ انہوں نے کہانی سنانے کے فن میں زیادہ مہارت حاصل کی ہے۔شہناز خانمکہانی سلیقے سے لکھتی ہیں،کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے۔کہیں جھول کا احساس نہیں ہوتا۔نہ یہ شک گزرتا ہے کہ ایسا ہو بھی سکتا ہے کہ نہیں۔واقعہ جس طرح بیان ہوتا ہے، وہ ہمیں یقین دلاتا نظر آتا ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔کردار بھی صحیح طور پر نشو نما کرتے ہیں ہر کردار اپنی پہچان الگ کراتا ہے۔جب یہ سب کچھ ہوگا تو افسانہ نگار کو اپنی طرف سے معنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔وہ خود ہی کہانی کے اندر سے برآمد ہوں گے۔ان افسانوں میں سماجی معنویت کا رنگ بھی مل جائیگا اور سماجی معنویت بھی انمیں جھلکتی نظر آئے گی۔

انتظار حسین (لاہور)

شہناز خانم عابدی کو پڑھتے ہوئے اکثر معلوم ہوتا ہے گویا اسے آپ ہی آپ بنی بنائی کہانیاں سوجھ جاتی ہیں۔مگر ایسا نہیں ہوتا ہوگا۔لکھنے سے پہلے اسے بھی ہم سب کی مانند بہت سوچنا ہوتا ہوگا اور کہانی کے فطری بہاؤ کا اہتمام کر پانے کے لئے بہت رک رک کر لکھنا ہوتا ہوگا۔لکھی ہوئی رواں دواں کہانیاں اکثر (قیام) کی کیفیات سے عاری ہوتی ہیں۔'خواب کا رشتہ' ہی کو لے لیجئے اس کے مطالعے سے قاری کو طبع زاد معانی کی ٹٹول ہونے لگتی ہے اور یوں گویا اس نے بھی کہانی کی تخلیق میں اپنی ساجھے داری نبھائی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ شہناز خانم عابدی اپنی اس نمایاں خوبی کی بدولت اردو کہانی میں اہم رول ادا کرے گی۔

شہناز خانم عابدی کے فن کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مانو وقوعہ اس کے یہاں کہانی شروع کرنے سے پہلے ہی انجام پا چکا ہوتا ہے۔۔۔۔مگر نہیں اسے بھی سبھوں کی مانند موزوں وقوعوں کی تلاش میں بہت دقت کا سامنا رہتا ہوگا تاہم اپنی یہ دقّت ایک اچھّے فنکار کی طرح وہ اپنے قاری تک نہیں پہنچنے دیتی جو دلچسپ مطالعہ کی تیز روی میں کہانی کے اختتام سے پہلے کہیں دم نہیں لیتا۔

رائٹر اگر اوریجنل ہو تو اپنی اوریجنلیٹی سے بہ حسن وخوبی نمٹ پانے کیلئے اسے بہت زیادہ اور لگاتار محنت اور زندگی کے مطالعہ سے کام لینا ہوتا ہے۔ خانم کی موجودہ تخلیقی بے چینیاں اس امر کی شاہد ہیں کہ اس کے شوق اور شدت میں اضافہ ہوتا چلا جائیگا اور یوں وہ اپنی فکشن کی تخلیق کے اسباب تادمِ آخر بنائے رکھے گی۔کسی مصنف کے اوائل کی اچھی تحریریں اس تاثر کے باعث قابلِ اعتنا ہوتی ہیں کہ وہ اواخر تک آتے آتے ڈھیروں اور بھی اچھا لکھے گا۔شہناز خانم عابدی سے بھی ایسی توقعات باندھنا عین فطری معلوم ہوتا ہے۔تخلیقی انہماک بڑا جان لیوا ہوتا ہے ۔خدا کرے اس کے انہماک میں انحطاط واقع نہ ہو۔

اردو کہانی کا یہ باب یقیناً بڑا حوصلہ افزا ہے کہ ہمارے بعض لکھنے والے برِصغیر کے باہر بسے ہوئے ہیں۔اور یوں بھی ہماری کہانی کے وقوعی اور فکری اسباب میں وسعت پیدا ہو رہی۔خانم اور چند دیگر لکھنے والے اس تعلق سے بھی ہمارے افسانوی اسکوپ میں اضافہ کر رہے ہیں۔نئے ادب کی زندگی پر بھر پور نظر رکھے بغیر بھی چارہ نہیں۔خانم کے وقوعی اسباب میں ان امکانات کا بھرپور اسکوپ موجود ہے۔

طبعزاد کہانیاں زندگی کرنے کے باب سے بھی زیادہ کٹھن اور محنت طلب ہوتی ہیں۔شہناز خانم عابدی کی موجودہ تخلیقی شرکتیں گواہی دیتی ہیں کہ وہ اوّل بھی تخلیق کار ہے اور آخر بھی۔خدا اسے لکھنے کی صعوبت سے عہدہ برآ ہو پانے کے ذرائع اور ہمت عطا کرتا رہے

جوگندر پال (دہلی بھارت)

شہناز صاحبہ کے افسانوں میں تحیّر ہے، اضطراب ہے، نہ ہیجان اس کے باوجود ان کی تحریر میں خود کو پڑھوانے کا دم ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ابھی سیدھی راہ پر چلنے والے لوگ کسی نہ کسی حد تک کامیابی کا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔کہانی البتہ ان کے ہاں اُسی قدر دستیاب ہے جس قدر ایک خاتونِ خانہ کے ہاں ہوسکتی ہے مگر اُس کو کہنے کا فن شہناز صاحبہ کا اپنا ہے۔

محمود ہاشمی (یو۔کے)

شہناز خانم عابدی سے میری تمام تر شناسائی اُن کے افسانوں کے توسط سے ہے جنہیں پڑھ کر میں اعتماد سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ یہ افسانے ایک پڑھی لکھی اور مہذب تخلیق کار کے تحریر کردہ ہیں۔روانی اور سلاست اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں، ایک چیز جس نے مجھے شہناز خانم عابدی کے افسانوں پر اظہارِ خیال کے لیے اُکسایا وہ ہے اُن کا سنجیدہ مطالعہ اور گہرا مشاہدہ جو جگہ جگہ اپنا آپ دکھاتا اور منواتا ہے۔ یہ اگر پہلی اُڑان ہے تو بہت بھرپور ہے جس کا اعتراف ہر صاحبِ ذوق کو کھلے دل سے کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ (کناڈا)

آپ کی کتاب کو نہایت دلچسپی سے پڑھا بلکہ کتاب نے خود مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔خوبصورت افسانے ہیں، دلفریب منظر کشی ہے اور اسکا پڑھنا سہل ہے جو اعصاب کو ایک گونہ سکون دیتا ہے۔دوسرا افسانہ ''خواب کا

رشتہ'' ہی قاری کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ آپکا انداز بیان خوب ہے۔ اس قسم کے پراسراریت لئے افسانے کبھی حجاب امتیاز علی تاج لکھا کرتی تھیں۔ مجھے سب سے زیادہ آپکا افسانہ ''نیا گرا'' پسند آیا۔ ایک تو اس میں جذبات کی شدید ترجمانی کی گئی ہے دوسرے الزائیمر پر آپ نے ایک خوبصورت کہانی کی بنیاد کھڑی کی ہے۔ اس کی ایک اچھائی یہ بھی ہے کہ شروع میں قاری کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کا اختتام کیسے ہوگا۔ اس کے علاوہ مجھے ذاتی طور پر یہ افسانہ اس لئے بھی زیادہ اچھا لگا کہ جن علاقوں کی آپ نے منظر کشی کی ہے (اور خوب خوب کی ہے) میں ان علاقوں میں رہا ہوں۔ اس کو پڑھ کر وہ مناظر آنکھوں میں دوبارہ زندہ ہو اٹھے۔ میں نے اپنی امریکی زندگی کی ابتداء ڈیٹرائیٹ سے کی تھی پھر شکاگو میں دس سال گزارے۔ ان دنوں کینیڈا آنا جانا خوب رہا۔ درجنوں دفعہ ٹورانٹو اور نیاگرا فالز گیا اور مانٹریال بھی جانا ہوا۔ باقی افسانے بھی پرکشش ہیں۔ آپ کے انتساب نے مزید متاثر کیا۔

ڈاکٹر فیروز عالم (یو۔ایس۔اے)

شہناز خانم عابدی ایک عرصے سے کہانیاں لکھ رہی ہیں۔ وہ کہانیاں چپ چاپ ادبی رسالوں میں چھپ جاتی ہیں ۔ پبلک ریلیشنگ کا کوئی ہنگامہ کئے بغیر ادب کی خاموش خدمت گار کی طرح شہناز خانم عابدی نے اپنا کام جاری رکھا ہوا ہے۔ ''خواب کا رشتہ'' ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس میں سترہ افسانے شامل ہیں۔ افسانہ ''خواب کا رشتہ'' جس کے نام پر کتاب کا نام بھی رکھا گیا ہے بلاشبہ حاصلِ کتاب ہے۔

اس کتاب کا پیش لفظ شہناز خانم عابدی نے خود لکھا ہے۔ افسانوں کے مطالعے کے بعد ان کے پیش لفظ کے بیشتر مندرجات سے اتفاق کرنا پڑتا ہے خاص طور پر ان کے آخری الفاظ سے۔ ''میرا افسانہ آج کا افسانہ ہے لیکن ''آج'' میں ''کل'' بھی شامل ہے جو بیک وقت دیروز بھی ہے اور فردا بھی۔۔''

فلیپ پر انتظار حسین اور جوگندر پال کے تاثرات درج ہیں جنہیں شہناز خانم کے فن کے اعتراف کے طور پر شمار کیا جانا چاہئے۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے شہناز خانم عابدی کی پہچان قائم کرنے میں ان کا یہ مجموعہ بنیادی کردار ادا کرے گا۔ اور افسانے کے قارئین کو ان کے فنِ افسانہ نگاری کے مزید امکانات بھی دیکھنے کے مواقع نصیب ہوں گے۔ امید ہے اس افسانوی مجموعے کی بھرپور پذیرائی ہوگی۔

حیدر قریشی (جرمنی)

شہناز خانم عابدی ایک باخبر اور اہلِ نظر خاتون ہیں۔ اس بات کا ثبوت ہمیں ''خواب کا رشتہ'' کے ہر ایک افسانے سے مل جاتا ہے۔ انھوں نے افسانہ لکھنے کے لیے جن موضوعات کا انتخاب کیا ہے اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ کوئی گوشہ گیر اور اپنی ذات میں سمٹی ہوئی خاتون نہیں ہیں بلکہ کھلی آنکھوں سے دنیا کو دیکھنے اور بیدار ذہن کے ساتھ اس کے بارے میں سوچنا ان کا معمول ہے۔ اسی لیے اُن کے ہاں ہمیں رنگ رنگ کے کردار اور الگ الگ موضوعات کے افسانے ملتے ہیں۔ وہ افسانوں کو اور زندگی کو اپنی ہی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور اپنے ہی ذہن سے ان کے بارے میں سوچتی ہیں۔ ان کا زاویۂ نگاہ ایسا ہے کہ وہ انسانوں کے اندر جھانک کر دیکھنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں اور ایسے حقائق کو آسانی سے پا لیتی ہیں جو عام طور سے دیکھنے والوں کی نظر سے اوجھل رہ جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے اس مجموعے میں موضوعات کا جو تنوع اور کرداروں کی جو رنگا رنگی ہمارے مطالعے میں آتی ہے، اس کی تو ہم داد دیتے ہیں لیکن ایک اور چیز جس کو ہم محسوس کیے بغیر نہیں رہتے، وہ ان کے مشاہدے اور تخیل کا آپس میں ملاپ اور اس کے نتیجے میں بننے والی کہانی کا دل کش اسلوب ہے۔

کرن سنگھ (کراچی)

محترمہ شہناز خانم عابدی کے افسانے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ واقعی خواتین کسی بھی طرح مردوں سے پیچھے نہیں ہیں۔ وہ معاشرے میں مردوں کے شانہ بشانہ چلنے اور قدم سے قدم ملا کر کام کرنے کی نہ صرف اہلیت اور قابلیت رکھتی ہیں بلکہ ان میں ہمت و حوصلہ بھی موجود ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں اردو کے افسانوی ادب میں نظر آتا ہے۔ زاہدہ حنا، رئیس فاطمہ، ڈاکٹر شہلا نقوی، رضیہ فصیح احمد کے ساتھ ساتھ شہناز خانم عابدی وہ نام ہے جو اسد محمد خان، پروفیسر شمشاد احمد، مبین مرزا کے ساتھ ساتھ ایک جیسا افسانوی ادب اور تسلسل کے ساتھ تخلیق کر رہے ہیں ان کے افسانے اس زمانے کے افسانے ہیں اور ان کا بیان بیانیہ افسانہ ہے جس میں علامت اور تجریدنگاری ذرہ برابر بھی نظر نہیں آتی مگر افسانے کے تمام لوازمات اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں اور قاری کے دل پر براہِ راست اثر کرتے ہیں۔ ان کی تحریر کا اثر دیرپا ثابت ہی نہیں ہوتا بلکہ معاشرے میں تبدیلی کا پیش خیمہ بھی بن جاتا ہے۔

شاعر علی شاعر (کراچی)

''خواب کا رشتہ'' کے تمام افسانے اپنی جگہ خوب بلکہ خوب تر ہیں۔ موضوعات کے چناؤ اور اُن کے بیان میں اس قدر سادگی اور سچائی محسوس ہوتی ہے کہ قاری خود کو اُن کہانیوں کا کردار سمجھتے ہوئے کہانی کار کی انگلی تھامے ٹھوک ٹھوک اُس کے ساتھ چلنے پر مجبور رہتا ہے۔

انوار شریف (لاہور)

اِک عالمِ حیرت ہے فنا ہے نہ بقا ہے
حیرت بھی یہ ہے کہ کیا جانیے کیا ہے
سوبار جلا ہے تو یہ سوبار بنا ہے
ہم سوختہ جانوں کا نشیمن بھی بلا ہے

(اصغر گونڈوی)

طلوعِ خورشید

نعت

اُسی سے لیں اذنِ لب کشائی، ہُنر بیاں کے
وہ جس کی خاطر کھُلے ہیں دروازے لامکاں کے

وہ ذات جس کے محیط میں آفتاب نقطہ
اُسی میں گم فاصلے مکاں کے، سفر زماں کے

بطونِ گیتی میں ہے بپا انقلاب کیسا!
اُلٹ گئی ہے ہوا ورق سارے آسماں کے

طلوع اُس کا، طلوعِ خورشید کا نشاں ہے
شکستہ زنجیرِ شب ہے، قدموں میں کارواں ہے

وہ ذات جیسے تمام صدیوں کا ماحصل تھی
یقیں کی منزل پہ آ گئے، قافلے گماں کے

وہ اُنگلیاں جب فضا میں لہرائیں نور لکھیں
کہ جیسے روشن فلک پہ الفاظ کہکشاں کے

نہ پہنچے اُس دردِ لادوا تک جو خود دوا تھا
فغاں، کہ ہم لوگ کام آئے غمِ جہاں کے

○

توصیف تبسم (اسلام آباد)

نعت

(اب شافعِ اممؐ کے قدموں میں آ گئے ہیں)

میرا نبیؐ رحمتؐ، محبوبِ دوسرا ہے
قرآن جس کے رب کی آوازِ دل کشا ہے

وہ سامنے نظر کے جو اُس کا نقشِ پا ہے
خورشیدِ منزلِ حق، کعبہ کا راستا ہے

لطف وکرم سراپا، وہ رحمتِ مجسمؐ
جو اُسؐ کے پاس آیا، وہ اُسؐ کا ہو گیا ہے

آنکھوں میں جگمگاہٹ، قندیلِ لامکاں کی
اُسؐ کا کرم، کرم ہے، اُسؐ کی عطا، عطا ہے

جبرئیلؑ جانتا ہے سدرہ تلک کا رستہ
سردارِ انبیاءؑ ہی اِک عرش آشنا ہے

دن رات مل رہا ہے پیغام زندگی کا
پھیلاؤ جا کے دامن رحمت کا درکھلا ہے

وہؐ احمدؐ ومبشرؐ، مامونؐ و مجتبیٰؐ بھی
جس نام سے پکارو، ہر نام دل رُبا ہے

اب شافعِ اممؐ کے قدموں میں آ گئے ہیں
ہر خوف ہم نے راحتؔ، دل سے مٹا دیا ہے

○

امین راحت چغتائی (راولپنڈی)

اسطوخودوس

شاہد جمیل
(گوجرنوالہ)

چلو تہذیب چلو، ہری اپ، جلدی سے سامان باندھو۔ ہمارے تبادلے کے احکامات آچکے ہیں۔ ہمارے سے مُراد میرے ٹرانسفر آرڈر آئے ہیں۔ چاکری تو دراصل میں ہی کرتا ہُوں، تم تو حُکم چلانے کے لیے بنی ہو۔ پھر مصیبت! میں تو تنگ آ گئی ہوں گول گلوب گھوم گھوم کے۔ مسئلہ یہ ہے کہ تہذیب تمدن کے بغیر رہ نہیں سکتی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے تمدن کے چہرے کو مظبوطی سے تھاما اور شوخی سے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی! اچھا یہ بتاؤ اس بار جانا کہاں ہے۔

آج بھی وہ شرمائے بغیر نہ رہ سکا اور زبردستی اپنا چہرہ ایک طرف گھماتے ہوئے اور اپنی لمبی پلکیں جُھکاتے ہُوئے بولا! اس دفعہ تو کالے پانی کی سزا ہوئی ہے۔ اب تو خیر تم مجھ سے کافی تگڑی ہوگئی ہو لیکن شروع شروع میں تو بہت ہی شرمیلی ہوا کرتی تھی۔

یاد ہے جب تین ہزار سال قبل مسیح تُم پتھر، کانسی، تانبے اور لوہے کے ادوار سے گزرتی ہوئی، ہانپتی کانپتی بلاد الرافدین میں دجلہ و فرات کے کناروں پر اُگی ہری ہری نرم گھاس پر اُوندھی لیٹی سورج دیوتا کی گرمی سے محظوظ ہو رہی تھی اور میں نے ایک عکادی کے روپ میں تمہارے سرین پر چمڑے کی چابک کی ہلکی ضرب سے تمہیں بیدار کیا۔

یہ وہ پہلا کام تھا جو میں نے مہذب طریقے سے سرانجام دیا۔ اِس سے پہلے تو ہم لوگ بولنے کی جگہ چنگھاڑتے تھے۔ مذاق کے لئے ایک دوسرے پر پتھروں کا مہینہ برساتے اور پھر لہولہان ہو کر ایک دوسرے کے سروں، چہروں اور ماتھوں سے انگلیاں بھر بھر کر خُون چاٹتے۔ ہمارے بانس کے بھولوں کو دُور سے دیکھ کر درندے بھاگ جایا کرتے تھے۔ ہم لوگ تب خون سمیت گوشت کھایا کرتے۔ سب سے مزیدار گوشت مانس کا ہوتا، بس کوئی بخت مارا، شکم نہارا پھنسا نہیں کہ ہم نے اُسے دھریک کی گیلی کی طرح کلہاڑوں سے بیچوں بیچ چیر انہیں۔

ہاں! یاد ہے تمدن، سب یاد ہے۔ تُم لوگ کتنے عجیب ہُوا کرتے تھے، بلکہ تُم لوگ تو اب بھی اُتنے ہی عجیب ہو۔ کھیل کھیل میں ایک دو ماڑے دُبڑے کو پھڑکا کر بھُوننے کیلئے بھیج دیتے اور دوبارہ گتکا کھیلنے لگتے۔ یاد ہے تُم پَر جا کِس کِس چیز کا گوشت کھاتے تھے! اری ماں! تُم عوام ہر چیز کا گوشت کھاتے تھے، اپنا بھی!

تُم لوگ گائے بھینسوں کی جگہ اپنی عورتوں کو ہل میں جوتتے جیسے آج کل ٹی بی زدہ اور دمے کی مریضوں سے روٹی گُھواتے ہو، چھی چھی چھی! میرے آنے سے دُدھیا علاقوں میں تھوڑی بہت کایا کلپ ہوئی بیچاروں کی۔ کردیا ناں چالاک ہوشیار میں نے اِن کو، بنا دیا ناں معاشرے کی پردھان، باپ رے! چشم آسماں نے وہ دِن بھی دیکھے جب آج کی یہ کمزور مخلوق مردوں پر ڈونگرے برسایا کرتی۔ سارا کام سنبھال لیا تھا اِنہوں نے۔ بھئی ہل یہ چلاتیں، ساری کھیتی باڑی کرتیں، اناج سنبھالتیں جبکہ تُم لوگ صرف اک کے چولہے گرم کرنے کیلئے تھے۔ صحیح معنوں میں فلاح کا کام یہ کرتیں تھیں۔

تمدن نے اپنی بانہیں اُس کی کمر میں حمائل کرتے ہوئے عین اُس کے ساتھ اور بالکل اُسی کے سائز کی مخالف سمت میں دھکیلتی سانس لی اور سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا، نہیں یار! فلاح و بہبود کے الفاظ کا یہ مطلب نہیں ہوتا۔

اِدھر تو آ میرے مدھُو مکھے! اُس نے اِتنے جوش سے اُسے بھینچا کہ اُس کے سامنے کے دانت اُپس میں کڑکڑا گئے۔ فلاح کا لفظی مطلب ہوتا ہے پھاڑنا، زمین کے سینے کو ہل سے پھاڑ کر فصلیں اُگانے اور خوشحالی لانے کو فلاح کہتے تھے۔ اور اب جو لوگ کچھ نہیں کرتے یعنی اپنے ہاتھ سے کچھ نہیں کرتے ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ فلاح کا کام کرتے ہیں! آہا! وقت نے ساتھ الفاظ کے معنی بھی کس قدر بدل جاتے ہیں۔ دراصل انسان نے الفاظ کے معنی کو لفظی اور اصطلاحی کے خانوں میں تقسیم ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ انہیں اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق استعمال کر سکے۔

میں نے پھر کروٹ بدلی، جب میں کروٹ بدلتی ہوں تو انقلاب آتے ہیں! بول آتے ہیں ناں! شاما کیوں گیا! میں بھی ہیجان کی بات کر رہی ہوں۔ خیر چھوڑ! سیریس بات کو سیریس ہو کر سُن۔ جو لوگ شام کے وقت اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ رکھ کر دُور سے آنے والی اپنی کچھ لگتیوں کے راہ دیکھا کرتے تھے، اب علی الصبح فصلوں کا کاشت و برداشت کے لئے خود گھر سے نکلنے لگے۔ اِن کے گھروں سے نکلنے کا واقعہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ایک دن ایک اڑیل بیل کو غصہ آ گیا، اُس نے پہلے تو چھڑ مار کر بیچاری کی لات توڑی، پھر پیٹ میں زور کا سینگ ٹکایا، اِتنے زور کا کہ بیچاری کا ڈھول ہی پھٹ گیا۔ اُس دن جاگی تھی سُورماؤں کی غیرت۔

میں نے ہی نکالا تھا اِن بُزدلوں کو اِن کی بلوں سے۔ گھا مڑ کہیں کے، چُھپے رہتے تھے اپنی عورتوں کے مٹکوں کے پیچھے۔ مٹکوں سے مجھے یاد آیا، مٹی کے برتن بنانا بھی سکھایا تھا میں نے اِن کو۔ اینٹیں بنانا، سُکھانا اور پکانا بھی۔ اور بھی چیزیں بنانا سکھائی تھیں میں نے تمہارے لوگوں کو۔ لکڑی، دھات اور ہڈی کے ہتھیار، چمڑے، لوہے اور پتھر کی ڈھالیں۔ اب سوچتی ہوں کیوں سکھایا تھا میں نے یہ سب کچھ۔ سکھایا تو اس لئے تھا کہ تُم اِن چیزوں کو بُروئے کار لا کر ضرر

رساں مخلوقات کے حملوں سے محفوظ رہ سکو مگر تُم لوگوں نے تو ایک دوسرے پر ہی اپنے ہتھیار تان لئے، تان کیا لئے! برسا دیے بابا، گھمسان کا رَن ڈال دیا اپنی ہی صفوں کے بیچ۔

دِل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اِس گھر کو آگ لگ گئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میں دراصل تُم لوگوں کو تمام جانوروں میں اچھے جانور تصور کرتی ہُوئی تمہارے بیچ آئی تھی۔ شاید تمہاری سُتواں شکلوں کی وجہ سے، یا پھر عقل کی وجہ سے یا تمہارے بول چال کی وجہ سے مگر تمہارے!! تمہارے نہیں! میرے انسانوں نے اپنے اچھے ہونے کی کُچھ بھی لاج نہیں رکھی۔ انسانوں کے ساتھ میرے کا لاحقہ اس لئے استعمال کیا ہے کہ میں بھی تو اِن کی نصف سے بہتر ہوں یا شاید اس بھی زیادہ۔ کتنا اچھا ہوتا جو تم لوگ اپنے اچھے ہونے کی لاج رکھ پاتے۔

خیر! مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا اِن باتوں سے۔ میری ایک کروٹ کی مار ہیں ساری چیزیں۔ بڑوں بڑوں کو جھر جھری آ جاتی ہے میری ایک انگڑائی اور میری ایک پنہائی سے۔ ہاتھ لگا لگا کر دیکھتے ہیں لُہو ہے کہ پانی ہے۔ دیکھا تھا ناں تُم نے فرانس میں، رُوس میں۔ پڑھا تھا ناں تُم نے۔ A TALE OF TWO CITIES میں! کہا ناں! میری ایک کروٹ کی مار ہے سب کچھ! جس طرف میرا چہرہ ہوتا ہے وہ تو خوش ہوتے ہی ہیں لیکن جس طرف میری پیٹھ ہوتی ہے وہ بھی بہت خوش ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو پسِ پُشت لوگ زیادہ عرصہ خوش رہ جاتے ہیں۔ جس طرح تم لوگ اپنے نام کے لئے جان دیتے ہو اور بسا اوقات اچھی خاصی زندگی کو از خود جہنم بنا لیتے ہو اُسی طرح میں بھی اپنے ذکر سے خوش ہوتی ہوں۔ مزے کی بات بتاؤں! دُنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں مگر میرا نام دونوں کے ساتھ عزت کے طور پر آتا ہے یعنی تہذیب یافتہ لوگ اور غیر تہذیب یافتہ لوگ، ایک وہ جو مجھ سے ہیں اور دوسرے وہ جنہیں مجھ سے ہونا چاہیے۔

اچھا بابا! میں تیرا تمدن ہاتھ جوڑ کر تجھ سے استدعا کرتا ہوں کہ تو جیتی اور میں ہارا۔ باپ رے، تیری یاداشت تو ملینیم کے بعد بھی ویسی کی ویسی ہے۔ کِس دھات سے بنوائی ہے گوریے۔ تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ جہاں جا رہے ہیں وہاں کی زبان کیسی ہے۔ وہاں کی زبان ہے الفسادو الفساد، النفاق و النفاق۔

میں نے جان بوجھ کر تم سے یہ سوال نہیں کیا تھا، مجھے علم تھا کہ تم مجھے پُوری زبان نہیں بتاؤ گے۔ وہاں کی
زبان یہ بھی تو ہے!
کِس موڑ سے آتے ہیں، کچھ سست قدم رستے۔۔۔۔۔۔
اور پھر!
باغوں میں پڑے جھولے، تم بھول گئے ہم کو۔۔۔۔۔۔
اور!
اللہ ھوتو نبہ کہندا اے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اے چپ! شی! آواز نہ آئے! تمدن نے اِدھر اُدھر چونکتے ہو کر دیکھا جیسے اُسے یقین ہو کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ رُندھی ہوئی زبان میں کہنے لگا، یہ زبان حرام ہے! وہاں! وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اُس کی آواز گلے کی دیواروں سے پھسل کر پیٹ کے کنوئیں میں گر گئی۔

گوریا یعنی تہذیب پھر بولی! اچھا یہ بتاؤ کہ مجھے تمہارے ساتھ جانا ہے کہ نہیں اور وہاں! وہاں کا نقشہ بھی لائے ہو کہ نہیں! نقشہ بھی لایا ہوں اور تمہیں ساتھ بھی چلنا ہے۔ بڑی ضرورت ہے وہاں تمہاری! ویسے بھی تم تو سمیریا، ساٹرا، یروشلم، عرب، اسرائیل، کوفہ و بغداد اور نہ جانے کہاں کہاں سے گزر چکی ہو، تمہیں کیا ڈر! وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی! لاؤ نقشہ کہاں ہے۔ یہ ہے جناب نقشہ اور آج تاریخ ہے چودہ جنوری دو ہزار گیارہ اور یہ نقشہ ہے پُورے تریسٹھ سال اور پانچ ماہ پُرانا۔ اچھا اچھا! سمجھ گئی! ٹھیک ہے، چلتے ہیں، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ موسم بھی ٹھیک ہے وہاں کا! عام طور پر تو چاروں ہی موسم پڑتے ہیں۔

تمدن نے خوشی سے دونوں آنکھیں مٹکائیں اور کہنے لگا! یہ تم نے جو بچوں کی پیدائش پر روک لگا رکھی ہے، ہو سکتا ہے تُم وہاں جا کر اپنا ارادہ بدل لو۔ یہاں تو تمہیں ڈر ہے کہ کہیں کوئی ہمارے بچوں کو ہل میں نہ جوت دے اس لئے تم بچے پیدا ہی نہیں کرنا چاہتی۔ تہذیب نے غصے سے اُسے دیکھا جیسے وہ سب جانتی ہو۔ کہنے لگی! وہاں بچوں کی ٹولیوں میں پھلجھڑیوں کی طرح بم پُھوٹتے ہیں، کِس بُھول میں ہے!

رُوئی کی طرح اُڑتے ہیں چیتھڑے بیچاروں کے۔ تمدن ایک دم جھنجھلا گیا! تُم نے تو وقتی مزا بھی کِرکرا کر دیا۔ تہذیب نے اُسے نظروں سے دیکھا اور بولی! چُو چُو چُو! کوئی بات نہیں! وقتی مزا تو خیر آ ہی جائے گا۔ ابھی طعام کھولتی ہُوں تمہارے اور تمہارے سگے سودرے کیلئے۔ سوچتی ہُوں کیا مزا اِس عارضی، مختصر اور ریٹنڈ مزے کا۔

کچھ ہی دنوں بعد وہ دونوں اپنے دائیں بائیں ہاتھوں کی انگلیوں کی کنگھی ڈالے، اپنے پاؤں تلے بے انت سُوکھے پتے چُرمراتے گراسی لان کے بیچوں بیچ سیمنٹ کی راہداری سے پختہ عمارت میں داخل ہو رہے تھے۔ تمدن نے مین گیٹ کھولتے ہوئے تہذیب کی طرف اشارہ کیا اور کہنے لگا، یہ ہے جناب ڈاک بنگلہ۔ تہذیب جو بنگلے کو چاروں طرف گرے درختوں کے پتوں، شاخوں اور گلے سڑے پھلوں سے اٹا دیکھ چکی تھی، کہنے لگی یہ ڈاک بنگلہ ہے یا بھوت تو تم سے ویسے ہی ڈرتے ہیں، جنگلوں میں بھاگ جاتے ہیں تُم سے ڈر کر۔ تہذیب نے لمبی سانس لی اور کہنے لگی! مجھے بہر حال اِنسانوں سے ڈر ہے۔

لَونگ رُوم میں پہنچ کر وہ کچھ دیر کیلئے رُک گئے اور پریشان دِکھائی

دِیے۔ یُوں لگتا تھا جیسے جنم جنم سے نہ یہاں کوئی آیا اور نہ اس گھر کی دیکھ بھال کیلئے کسی کو بھیجا گیا۔ وہ کہنے لگی! مجھے تو شدید بدبُو آرہی ہے۔ تُم ٹھیک کہتی ہو! یہاں کسی زمانے میں انگریز رہا کرتے تھے۔ خُدا کا نام لو تمدن! بدبُو کسی رنگ، نسل، قوم، مذہب یا خطے سے مخصوص نہیں بلکہ بدبُو تو ہمیشہ گندے لوگوں سے آتی ہے۔ سوری سوری! بُھول گیا تھا! پہلا ہی سبق بُھول گیا تھا۔

تہذیب کہنے لگی! اگر لونگ رُوم کا یہ حال ہے تو پھر باورچی خانے اور بیڈرُوم کا تو کوئی حال نہ ہوگا۔ مجھ سے اِتنی صفائی نہیں ہوتی۔

چھوٹی چھوٹی غلاظت ہو تو انسان صاف بھی کرلے اور اگر ہر طرف گند ہی گند ہو تو کہاں سے اُٹھائے اور کہاں گرائے۔ آخر اُن دونوں نے لاشعوری طور پر فیصلہ کیا کہ صرف لونگ رُوم کو صاف کرلیا جائے۔ اُن کے دلوں کے بیچوں بیچ یہ بات چھپی ہوئی تھی کہ لونگ رُوم دراصل کسی گھر کا دماغ ہوتا ہے۔ یہیں پر ساری گُفت وشنید ہوتی ہے اور یہیں منصوبے بنائے اور گرائے جاتے ہیں۔ اگر دماغ کو صاف کرلیا جائے تو ماحول خود بخود صاف اور موزوں ہو جاتا ہے۔

اِس وقت وہ دونوں ایک ہی طرح کی سوچ میں غرق تھے، وہ گھر کے دِل، دماغ، ہاتھ اور پیر بنا رہے تھے۔ ٹیلی پیتھی کے ذریعے تہذیب نے تمدن سے پُوچھا! بتاؤ گھر کا دِل کہاں ہوتا ہے! اُس نے جواب دیا بیڈروم، گھر کے ہاتھ کہاں ہوتے ہیں! کہنے لگا کچن، گھر کے پیر کہاں ہوتے ہیں! بولا باہر والے دروازے کا صحن۔ پوچھتی جاؤ، سب بتا سکتا ہوں، آنتیں، اوجھڑی، گردے۔۔۔۔۔۔بس کرو! پلیز!

تہذیب چلو صفائی شروع کریں۔ اچھا یہ بتاؤ میں تُمہیں بنگلے کی صفائی کیلئے کیا لا کروں؟ تم مجھے اَسطوخودوس لا کردو! ہیں! کیا کہا؟ یہ کیا ہے؟ میں کہاں سے لاؤں! اَسطخ۔۔۔۔۔وہ ایک دم پزل ہوگیا۔ تہذیب اُس کی سٹپٹائی ہوئی حالت دیکھ کر ہنسنے لگی اور بولی، کوئی بات نہیں! میں جہاں جاتی ہوں اپنے نسخے ساتھ لے کر جاتی ہوں۔ اُس نے اپنے نیفے سے ایک سنہری کاغذ نکالا اور پڑھنے لگی۔

"ازل تا ابد خیر وشر کی جنگ کے میان کام آنے والے لہو کی لکیر اور تنتیر کو خراج کہ وہ ہمیں سیاہ رات کے اندھیرے سے اُفق کے اُس پار لانے میں کامیاب ہوئی جہاں سے ہم فکرِ نو کے سورج کو طلوع ہوتا دیکھ سکتے ہیں۔ ضرورت اِس بات کی ہے کہ ہم اپنے روایتی گیان، دھیان، وجدان، ادیان، بیان اور نسیان کی اکتاہٹ کے سائے سائے چلیں۔ اِس کے لئے انسان کو اندر سے بدلنے کی ضرورت ہے۔ ایک مکمل طور پر اندر سے بدلا ہوا انسان ہی دیگر انسانوں کے لئے بے ضرر ہوسکتا ہے"

تہذیب نے ابھی چند سطریں پڑھیں تھیں کہ لونگ روم کا ایک کونہ صفائی سے چمچمانے لگا۔

بقیہ: مدد چاہتی ہے حوا کی بیٹی

آتے نانی کا پیار یاد آتا اور وہ اُٹھتی اور اُنہیں خط میں سب بیان کردیتی اور وہ ڈاک میں نہ بھیج کر اپنے پاس ہی اُمید کی اِک کرن ہمیشہ جلائے رکھتی کہ ایک روز تو اس کے دن بدلیں گے۔

کل رات تو ساری اُمیدیں ہی ختم ہوگئی جب اُس نے ماں کی طعنہ زنی سے پریشان ہوکر اکیلے میں اپنی تکلیف بابا کو بتانی چاہی تو اُنہوں نے اُس کی ایک نہ سُنی اور غصّے میں اس پر برس پڑے۔

''ہُوا تیری وجہ سے ہمارا گاؤں میں جینا محال ہوگیا ہے۔ سوچا تھا تیرے ہاتھ پیلے کردوں مگر جس جگہ بھی بات کرتا ہوں تیری رسوائی کے قصّے پہلے ہی وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ گاؤں والے تو پہلے ہی تجھے واپس لانے کی خلاف تھے پنچایت کے آگے ہاتھ جوڑے منتیں کیں تو وہ راضی ہوئے۔ اب سوچتا ہوں وہ ٹھیک تھے میں ہی غلط تھا۔ تو چلی گئی تھی تو رو دھو کر صبر کرلیا تھا مگر تو واپس کیا آئی ہمارا جینا حرام ہوگیا۔ نہ گھر میں چین نہ باہر سکون۔ گاؤں میں بہت سے کنویں ہیں جو تجھے دکھائی نہیں دیتے؟

''مگر بابا میرا قصور کیا ہے؟''

''قصور تیرا نہیں میرا ہے جو میں تیرا باپ ہوں۔ بس معاف کردے ہمیں''۔ دونوں ہاتھ اُس کے آگے جوڑے اور غصّے سے پیر پٹکا تا باہر نکل گیا۔

وہ سوچتی ہی رہ گئی کہ یہ شخص اُس کے بابا نہیں ہوسکتے۔ شاید ماں اُس کے بابا کو بھی ساتھ لے گئی۔ یہ تو سوتیلی ماں کے پتی ہیں۔

رات بھر وہ سو نہیں سکی۔ وہ روئی بھی نہیں یہ ہی سوچتی رہی کہ گاؤں کے کنویں بہت پاس ہیں اُس کی ماں بھی وہیں سو رہی ہیں وہ بھی اُن کے پہلو میں جا کر سو جائے تو شاید اُسے بھی سکون مل جائے اور پھر نانی کا آشرم یاد آیا مگر وہ بہت دُور میلوں دُور جدھر اکیلے پہنچنا آسان نہیں۔ اب دو ہی راستے ہیں وہ کدھر جائے؟ اسی کشمکش میں رات آنکھوں میں کٹ گئی۔

صبح پو پھٹنے سے پہلے جب ساری دُنیا آرام سے سوئی تھی اُس نے گھر سے باہر قدم نکالا اور سیدھے اُس کنویں کی طرف چل دی جدھر اُس کی ماں سوئی تھی۔ کنویں کے پاس رُکی جھانک کر کنویں میں دیکھا پھر بند مٹھی کھولی اُس میں بابا کے چرائے ہوئے نوٹ تھے۔ کچھ دیر خاموشی سے کنویں کو دیکھنے کے بعد سیدھی شہر جانے والی پکّی سڑک کی جانب ڈگ بھرنے لگی۔ اُس کی چال میں بلا کا اعتماد، جینے کی تمنّا اور مقابلہ کرنے کا عزم نمایاں تھا!

قصور کس کا؟

شائستہ عالم
(یو۔ایس۔اے)

چلتے چلتے وہ تھک کر چور ہو گیا تھا۔سڑک کے کنارے ایک پلیا پر بیٹھ کر وہ آتے جاتے لوگوں کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ہر انسان ایک جیسا لگ رہا تھا، پریشان، بے حال، ہر چہرا ڈرا ہوا رنگ اڑا ہوا۔کس کس کے کیا مسائل تھے، وہ نہیں جانتا تھا لیکن اتنا معلام تھا کہ آج کل شہر تو کیا پورے ملک کے ہی ایک جیسے حالات تھے۔پانی بجلی گیس کا تو مسئلہ تھا ہی ۔لوگ اب ان مسئلوں سے خود ہی نبٹنے لگے تھے۔حکومت نہ کچھ کرنے پر آمادہ تھی، نہ ہی شاید کچھ کر سکتی تھی۔مہنگائی تھی کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔لوگوں کا جینا محال تھا۔حالات بے حد خراب تھے۔

بیٹھے بیٹھے اُکتا گیا تو پھر چل پڑا۔۔کہاں؟۔۔اسے معلوم نہ تھا۔ایک ہوٹل کے دروازے پر آ کر رک گیا۔صبح صرف ایک کپ چائے پی کر گھر سے نکلا تھا۔نوکری چھوٹے ایک مہینہ کے قریب ہو گیا تھا۔روز نوکری کی تلاش اب معمول بن گیا تھا مگر ایک مہینے کی مسلسل کوششوں کے بعد اب کام کا ملنا ایک خواب سا لگنے لگا تھا۔

عام سا ہوٹل تھا۔درمیانے طبقے کے کچھ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ سارے ماحول میں باتوں کی ہلکی ہلکی بھنبناہٹ تھی۔سامنے ایک چھوٹا سا ٹی وی لگا ہوا تھا۔پروگرام کی میزبان کہہ رہی تھیں'' آج میں آپ کو مزیدار چکن ریپ اور میٹھے میں فروٹ ٹرائفل بنانا سکھاؤنگی۔فروٹ کاٹن آپ سوپر مارکیٹ سے بھی لے سکتے ہیں مہنگا تو پڑیگا مگر مزہ آ جائے گا۔چاہیں تو تازہ فروٹ بھی ڈال سکتے ہیں۔تلخی سے اسکا گلا کڑوا ہو گیا۔آج کوئی تیسرا دن تھا کہ اس نے اور اس کی بیوی بچوں نے باسی روٹی چائے میں ڈبو کر کھائی تھی۔میزبان اب اجزا کی مقدار بتا رہی تھی۔وہ کس دیس کی رہنے والی تھی جسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس شہر میں لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں، مہنگائی کے ہاتھوں دم توڑ رہے ہیں۔آج کل تو دال روٹی بھی ایک سہانا خواب ہے۔

شام ہونے لگی تھی۔اس نے گھر کی طرف قدم بڑھائے مگر تیزی سے بڑھتے قدم خود ہی رک گئے۔گھر جا کے کیا کرونگا، کیا کہوں گا۔نوکری تو آج بھی نہیں ملی۔

بچوں کی چہکار اور انکے بولنے کی آوازوں نے اسکی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔وہ کھلونوں کے ٹھیلے کے آس پاس تھے۔کچھ خرید رہے تھے کچھ صرف دیکھ رہے تھے۔اس ٹھیلے میں کافی مختلف کھلونے تھے۔رنگ برنگی گیندیں، ہوائی جہاز، ٹرینیں، پلاسٹک کی خوبصورت گڑیاں، کھلونا پستول۔

آج کل ایسا ہی ہو رہا ہے۔کھلونا پستول دکھا کر لوگ بڑی بڑی وارداتیں کر جاتے ہیں۔اگر وہ نقلی پستول دکھا کر کسی کو ڈرائے تو سو پچاس تو مل ہی جائینگے۔کچھ تو مسئلہ حل ہو جائیگا۔اسکا ذہن مجرمانہ نہیں تھا مگر فی الحال تو وہ ایسا ہی سوچ رہا تھا۔جیب میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو پانچ کا نوٹ ہاتھ میں تھا۔پستول تین روپئے کی تھی۔ہاتھ میں پستول لے کر اب وہ سوچ رہا تھا کہاں جائے؟ قدم ایک طرف کو اٹھ گئے۔خوف زدہ تھا۔ایسا کرنا تو درکنار کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔دل کو تسلی دی۔کوئی بات نہیں۔ایسا ہوتا ہی رہتا ہے اس شہر میں۔کچھ نہیں ہوگا۔چلتے چلتے اچانک وہ رک گیا۔ایک گاڑی آ کر رکی تھی۔ڈرائیور اتر کر دکان میں گیا تھا۔اس نے دیکھا ایک عورت گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔اس کا پرس اسکے پاس تھا۔گلے اور ہاتھوں میں سونے کی کوئی چیز نہیں تھی آجکل عورتوں نے سونا پہننا ہی چھوڑ دیا تھا۔لیکن پرس میں اچھے خاصے پیسے ہونگے۔وہ خاصی متمول لگ رہی تھی۔

وقت کم تھا ڈرائیور کبھی بھی آ سکتا تھا۔ہمت کر کے وہ گاڑی کی طرف بڑھا شیشہ اترا ہوا تھا ادھر ادھر دیکھ کر اس نے کھلونا پستول سیدھا کیا اور عین عورت کی آنکھوں کے سامنے دکھا کر بولا پرس میرے حوالے کر دو۔اسے اپنی آواز کی کپکپاہٹ کا خود ہی اندازہ ہو رہا تھا۔وہ خود ہی ڈرا ہوا تھا لیکن پستول دیکھتے ہی عورت کے اوسان خطا ہو گئے۔اس کے منہ سے زور کی چیخ نکلی۔ ڈرائیور دوڑ کر دوکان سے باہر آ گیا۔آس پاس کے لوگ ڈر کر دور ہٹے اور رک کر دیکھنے لگے اتنی ہمت کسی میں بھی نہیں تھی کہ اس کو پکڑنے کی کوشش کرتا۔حالات کا اندازہ کر کے اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اس کی بدنصیبی کہ گشت کرتی ہوئی رینجر کی گاڑی وہیں سے گذر رہی تھی۔چند لمحوں میں بھاری بھاری بوٹوں کی آوازیں اس کے سر پر پہنچ گئیں۔'' پکڑو جانے نہ پائے'' شاید وہ انچارج تھا۔ڈرا اور سہما ہوا وہ نقلی پستول وہیں پھینک کر ہاتھ اٹھا کر بولا ''نقلی ہے جی نقلی ہے'' '' پکڑو سالے کو، جینا حرام کر دیا ہے'' بھاگنے کی کوشش میں وہ سڑک پر گر گیا۔ایک رینجر نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور دو تین جھٹکے دیئے۔

انچارج کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔بیس سال ہو گئے تھے وہ اس شہر میں پڑے تھے۔گھر کے چین سکون آرام کو ترس گئے تھے۔ان جیسے لوگوں اور اس شہر کے حالات نے ان کو انکے گھر والوں اور انکی محبت سے دور کر دیا تھا'' مار دو سالے کو'' وہ زور سے چلّایا۔بے انتہا خوف زدہ ہو کر اس نے ہاتھ جوڑ دیئے گھگھیا کر بولا ''نہیں سر جی پہلی دفعہ ہے کھلونا پستول تھی جی۔اس بار جانے دیں''۔۔''مارو'' دوبارہ آرڈر آیا۔ایک رینجر نے بندوق سیدھی کی۔کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے آگے بڑھ کر اسکی نالی کو نیچے کیا'' اس بار معاف

باقی صفحہ ۸۲ پر ملاحظہ فرمائیے

گڑیا

ڈاکٹر عمران مشتاق

(یو۔کے)

''میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' بڑی شائستگی سے کیے گئے سوال کے جواب میں، میں نے سر اُٹھایا اور سر ہلا دینے پہ ہی اکتفا کیا۔ وہ میرے سامنے رکھی ہوئی کُرسی پہ بیٹھ گیا۔ یہ میری مان سنگھ سوڈھی سے پہلی مُلاقات تھی۔ لائبریری میں ہونے والی یہ مُلاقات ایسی ہی کئی مُلاقاتوں کی پیش خیمہ تھی۔ وہ ویسا ہی تھا جیسے کہ نوجوان سکھ ہوتے ہیں یا جیسا کہ میں نے ساؤتھ آل میں دیکھا ہے۔ نوجوان، خوش باش، زندہ دِل، ہنسنے بولنے والے اور یار باش۔ یاروں کے لیے جان بھی لُٹا دینے والے۔

مان سنگھ کو جب یہ پتہ چلا کہ میرا تعلق سرگودھا سے ہے تو اُس کی دیوانگی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اُس کا مُجھ سے بات کرنے کا انداز ہی بدل گیا تھا جیسے میں نے اُسے دُنیا کی کوئی بڑی خوشی دے دی ہو۔ اُس کے لیے یہ بات واقعی ایک خاص مُسرت کا باعث تھی۔ لفظ ''سرگودھا'' میں ایسا کیا جادو تھا کہ اُس کا انگ انگ جھوم اُٹھا تھا۔ آنکھیں باتیں کرنے لگی تھیں اور ہونٹوں کی ہنسی جھنکار کی مانند۔ وہ ہنسے ہی جا رہا تھا اور اُس کے ہونٹوں سے پھسل پھسل جانے والے الفاظ۔ ''بھرا جی! تُسی وی سرگودھے دے او۔ (بھائی جی! آپ بھی سرگودھا کے ہیں)۔ سرگودھا۔ ساڈھا (ہمارا) سرگودھا۔ ساڈھا سرگودھا۔۔۔'' میں جو سرگودھا کی پیدائش تھا۔ وہیں پلا بڑھا تھا۔ میرے سارے رشتے اُس شہر سے تھے مگر وہ کبھی بھی مُجھے ''ساڈھا سرگودھا'' نہیں لگا تھا۔ مانی کی وجہ سے مجھے بھی ''سرگودھا'' میں کُچھ خاص سا محسوس ہونے لگا۔ میں اُسے اب مانی کہنے لگا تھا کہ ''بقول مان سنگھ کے اب میں اُس کا دوست تھا اور اُسے پیار سے مانی کہہ سکتا تھا اور یہ کہ خالص دوستی تو ہوتی ہی پیار کی ہے۔''

مانی نے مُجھ سے پوچھا کہ ''سرگودھا کیسا ہے؟ لوگ ٹھیک ہیں؟ حویلیاں اب بھی قائم ہیں یا کوٹھیوں نے شب خون مار کر اُنہیں اور ایک تہذیبی دور کو مار ڈالا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔''

میں سرگودھا سے اُس کا پیار اور لگاؤ دیکھ کر خود شرمندگی محسوس کرنے لگتا تھا کہ وہ میرا شہر تھا اور میں نے اُسے کبھی سوچا نہیں تھا، مگر مانی کے تصورات اور خیالات میں بسا ایک دور دیس کا وہ شہر جہاں اُس کی ماں تقسیم سے پہلے رہتی تھی۔ اُس کی محبت، چاہت اور لگاؤ صرف اِس لیے تھا کہ وہ اُس کی ماں کی جنم بھومی تھی۔

میرے پوچھنے پر کہنے لگا۔ ''بھرا! مجھے اپنی ماں کی ہر شے سے عشق ہے۔ حتیٰ کہ اُس کی یادوں سے بھی۔ وہ سرگودھا کا ذکر ایسے کرتی ہے جیسے تُم مکہ و مدینہ کا کرتے ہو۔''

اُس کی باتیں مُجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیتیں کہ تقسیم کا عمل سرحدوں کے پار لوگوں کو دھکیل کر ہی سُرخ رو نہیں ہوتا بلکہ انسان کی شخصیت کو بھی توڑ پھوڑ کا شکار کر دیتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کی تشکیل کے عمل کے دوران، ذہنی اور روحانی طور پہ اُسی جگہ ٹھہر جاتا ہے جہاں تقسیم کی تلوار اپنا کاری وار کرتی ہے۔ سال بیت جاتے ہیں اور صدیاں اپنا عمل مکمل کر لیتی ہیں مگر انسان وہیں رُک جاتا ہے، ٹھٹھر کر مُنجمد ہو جاتا ہے۔ ایک ایسی برف کی طرح جسے دھوپ سے کوئی علاقہ نہ ہو۔

ایک دِن مانی نے ماں کی کہانی سُنائی۔ وہ کہانی سُناتے ہوئے یوں کہیں کھو گیا جیسے سب کُچھ اُس کے سامنے ہو رہا ہو۔ ''ماں کے لیے وہ حویلی اب بھی ویسی ہی ہے، جہاں اُس کا بچپن گزرا، گُڑیوں سے کھیلا، سکھیوں کے سنگ گڈے گڈیوں کے ویاہ (بیاہ) رچائے۔ ابھی گڈیوں سے کھیلنے کی عُمر ہی تھی کہ اُس کے باپو نے اُس کا ویاہ رچا دیا۔ مُلک تقسیم ہوا۔ مذہب نے اک دیوار اُٹھائی تو نفرتوں نے اُس دیوار کو دیوارِ چین بنا دیا۔ سرحدوں نے تبادلے کا کام شُروع کیا تو ماں کو بھی اپنا ''سرگودھا'' چھوڑ کر آنا پڑا۔ اُس کی گُڑیا وہیں رہ گئی۔ ماں اب بھی اپنی گُڑیا کے لیے روتی ہے۔ ماں کو موقعہ ہی نہیں مِل سکا کہ اپنی لاڈلی گُڑیا کو ساتھ لا سکتی۔''

اُس کی بات سُن کر میرے اندر کہیں کوئی آگ سی جل پڑی۔ میں اُسے بتانا چاہتا تھا کہ ''تیری ماں کو تو صرف اپنی گُڑیا ہی یاد ہے اور یہاں تقسیم کے عمل نے انسانیت کی تاریخ کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ خون کے دریا پار کر کے لوگ لاہور اور سرگودھا پہنچے تھے۔ ماؤں نے جوان بیٹے اور آبرو سے محروم بیٹیوں کے زندہ لاشے بھی اُٹھائے تھے۔ ایسی بھی تھیں جنہوں نے پانی کے کنوئیں اپنے پامال جسموں سے بھر دیئے تھے۔ شاید اُمید رہی ہو کہ پوتر جل اُن کے جسم کی گندگی کو دور کر دے۔ عورتوں نے بیوگی کی چادر اُوڑھی تھی تو بہنوں نے جوان بھائیوں کو خون میں لت پت دیکھا تھا۔ بیویوں کے شوہروں سے کیے وعدے اور شوہروں کے بیویوں سے کیے دعوے سبھی ریت پہ لکھی تحریر ثابت ہوئے تھے۔ اتنا سستا خون تاریخ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔'' میں اُس سے کُچھ بھی تو نہ کہہ سکا کہ وہ میرا دوست تھا۔ میں کوئی سیاست دان تو نہیں تھا کہ اُسے پھر ایک تقسیم کے عمل سے گزارتا۔ نہ ہی رہنما کہ اُسے بھاشن دینے لگتا۔

اُس نے جب مجھے خاموش دیکھا تو نہ جانے کیا سمجھا، بولا۔ ''یار میں نے تُجھے بور تو نہیں کر دیا۔ کیا کروں یار۔ سرگودھا ہے ہی ایسا۔''

''سرگودھا پھر سرگودھا۔'' اماں اللہ بخشے بتاتی تھیں کہ سرگودھا پہنچنے کا عمل تو آگ کے دریا کو پار کرنے جیسا تھا۔ بھرا پُرا خاندان سکڑ سمٹ کر صرف چار لوگوں تک رہ گیا تھا۔ حویلی کے بدلے جھونپڑی بھی مِلی تو رب کا شُکر کیا کہ آزادی کا سورج دیکھنا تو نصیب ہوا۔

ایک دِن وہ کہنے لگا۔''میں نے ماں سے تیراذکر کر دیا تھا۔وہ جھلی میرے پیچھے ہی پڑ گئی کہنے لگی جا بس اُسے میرے پاس لے کر آ۔اُس کے پاس تو سرگودھے کی باس آتی ہو گی۔سرگودھے کی ہواؤں نے اُس کے جسم کو چھوا ہو گا۔میں وہ پیارا''جسم'' دیکھنا چاہتی ہوں۔اپنا سرگودھے کا پُتر (بیٹا) دیکھنا چاہتی ہوں۔پُتر بس تو اُسے لے کر آ۔''

وہ میری طرف دیکھنے لگا جیسے جواب چاہ رہا ہو۔میں اُسے کیا جواب دیتا۔وہ ایک ماں تھی جس نے اپنی آنکھوں میں کچھ خواب ہمیشہ کے لیے رکھ چھوڑے تھے۔کیا میں اُسے خوابوں سے حقیقت کی دردیلی دُنیا میں لے آؤں۔ماں کا سرگودھا اب ویسا سرگودھا نہیں رہا تھا۔اب وہ ایک''بڑا گاؤں'' نہیں تھا۔ایک شہر تھا اور شہر والی ساری سفاکیوں سے لیس اور خوابوں کو خون کے آنسو بخش دینے والا۔میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتا تھا اور سچ بول کر ماں کو دُکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ماں کو کیا پتہ کہ سرگودھا نے،لاہور نے مجھے نوکری روٹی دینے سے معذرت کر لی تھی اور اب سات سمندر پار میں ہندوستان کی تقسیم سے پہلے،ہندوستانیوں سے روٹی چھیننے والوں سے اپنے حصے کی روٹی لینے آیا تھا۔جواباً چھیننے کی جُرات مُجھ میں اب بھی نہیں تھی۔

یار تو کیا سوچنے لگا۔مانی نے میرا گھٹنا ہلایا تو میں ساؤتھ آل واپس آ گیا۔ہم دونوں لائبریری کے باہر والے چبوترے پر بیٹھے تھے۔

''یار مانی! ہم کسی دِن تیرے گھر چلیں گے۔ماں جی کے ہاتھ کا ساگ اور مکئی کی روٹی بھی کھائیں گے۔''میں نے اُسے یقین دلانا چاہا۔

''نہیں یار!تو وعدہ کر۔مجھے چکر نہ دے۔''مانی نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔''ماں بڑے دنوں سے کہہ رہی ہے اور میں اُس سے ہوں ہاں ہی کر رہا ہوں۔ماں آج کل اپنی گُڑیا کی باتیں بہت کرنے لگی ہے۔شاید تجھ سے اُس کا پتہ۔۔۔''

''گُڑیا۔۔۔گُڑیا۔۔۔۔۔''میں اُس کی بات کاٹ کر جنونی انداز میں بولا۔نہ جانے مجھے اچانک ہی کیا ہو گیا تھا۔''تیری ماں کی گُڑیا کا سُن سُن کر میرے کان پک گئے ہیں۔اُسے تو صرف اپنی گُڑیا ہی یاد ہے۔وہاں جیتے جاگتے لوگ خونم خون ہو کر رہ گئے تھے۔''

''اوہ یار!میری بات تو سُن۔۔۔۔''مانی نے کُچھ کہنا چاہا۔

''نہیں پہلے تو میری بات سُن۔''میں نے اُس کی بات پھر کاٹ دِی۔''ہزاروں لاکھوں عصمتیں لُٹیں۔لاکھوں لوگ اپنے ہی لہو میں نہلا دیئے گئے اور یہ کس نے کیا؟تُمہیں تو پتہ ہی ہو گا۔''میرا لہجہ اتنا زہریلا ہو گا اِس کا تو مجھے خود بھی احساس نہیں تھا۔

''یار یہ سب سیاست کی باتیں۔۔۔۔''اِس بار بھی وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔

''انسان کو اپنی عقل کا مظاہرہ بھی تو کرنا چاہیے ناں کہ درندوں کے ساتھ درندہ بن جائے۔''

''یار!یہ ساری باتیں تو میری پیدائش سے بھی پہلے کی ہیں۔ماں کی گُڑیا تو۔۔۔۔۔''

''آخر تیری ماں کی گُڑیا میں ایسے کیا ہیرے جواہر جڑے ہوئے تھے کہ وہ اب تک اُسے بھول ہی نہیں سکی؟''میں نے پھر اندر کا زہر زبان سے نِکالا۔

''وہ تو ماں کا دِل تھی۔جگر کا ٹکڑا تھی۔اُس کی پہلی اولاد مجھ سے دو سال پہلے پیدا ہوئی تھی اور پھر وہ سرگودھا کی ایک حویلی میں ہی رہ گئی۔''مانی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔پھر وہ اُٹھا،میری جانب اک دردیلی نظر ڈالی،مُڑا اور پھر مان سنگھ سوڈھی اپنے راستے پہ چل پڑا۔

بقیہ:''تمنائے ثمر''

''یہ بچہ ابھی دنیا میں آنے کے لیے تیار نہیں۔مریضہ کے بجائے دنیا کو ایک نئی ڈرپ لگاؤ''

''بھرم'' دل خراش معنویت کا حامل افسانہ ہے جسے پوری ٹیکنکی مہارت اور کامل ضبط سے لکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر سید سعید نقوی کے افسانے بیشتر فکریات پر مشتمل ہیں دو ایک نفسیاتی مطالعے کا انداز لئے ہوئے ہیں۔ایک دو جو شاید فرمائشی نوعیت کے موضوعات پر مشتمل ہیں یا فرض جان کر لکھے گئے ہیں ادبی قدر کی کمی اور صحافتی قدر کی زیادتی کی لپیٹ میں آ گئے یہ کوئی بڑی کمزوری نہیں،امر فطری میں گنے جائینگے۔ایک بات اور مورنی نہیں ناچتی۔مور ناچتا ہے۔مورنی کے پر حسین نہیں ہوتے مور کے ہوتے ہیں۔لکڑ بھگوں کی مورنی پر یلغار خلاف وضع فطری ہے۔

ڈاکٹر سید سعید نقوی کے افسانے آج کے اردو افسانوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہیں۔یہ مختصر بھی ہیں اور اپنے کو پڑھوانے کی صلاحیت (READABILITY) کے حامل ہیں۔پڑھنے والے کے ذہن و دل میں جگہ بنا کر مدتوں اس کی سوچ کا مرکز بنے رہنے کی صفت سے بھی متصف ہیں۔ان افسانوں کا آغاز سادگی کے ساتھ اور انجام کسی ایسے فقرے پر ہوتا ہے جو ذہن میں چبھ جاتا ہے ایک ادیب اور قلم کار کے طور پر ڈاکٹر سید سعید نقوی ایک حقیقت نگار ہیں۔رومانس ان کا میدان نہیں۔پریم چند اور ٹالسٹائی کی پرچھائیاں ان پر پڑتی نظر آ سکتی ہیں۔ان کے افسانوں کا محور اخلاقیات ہے۔ایک تو وہ ڈاکٹر ہیں''میڈیکل اِنتھکس'' ضرور پڑھی ہو گی دوسرے یہ کہ یہ اخلاقیاتی فکر کے پرچار اور پھیلاؤ کا دور ہے۔انسانی معاشرے پر سے مذاہب اور ادیان کی گرفت کمزور پڑتی جا رہی ہے اور آدمی اخلاقیاتی فکر میں اپنی فلاح دیکھنے لگا ہے۔

''مدد چاہتی ہے حوّا کی بیٹی''

رینو بہل

(چندی گڑھ، بھارت)

جب سے اُسے پتا چلا تھا کہ اُس کے گاؤں کا پتہ چل گیا ہے اور بہت جلد یہ لوگ اُس کے ماں بابا کو ڈھونڈ نکالیں گے اُس کی مایوسی بجھی ہوئی آنکھوں میں اُمید کی چمک نظر آنے لگی تھی سانولے سلونے چہرے پر بڑی بڑی کالی آنکھیں اور دلکش ہوگئی تھیں۔ اُس کی خاموش آنکھیں بولنے لگی تھیں۔ زبان کی شوخی کا رس ٹپکنے لگا تھا۔ جو لوگ پچھلے پانچ سالوں میں اُس کی آواز سے نا آشنا تھے وہ اب اُس کی خوش گفتاری سے حیران زدہ تھے۔ پانچ سال پہلے جب وہ دس سال کی تھی اس آشرم میں چالیس بچوں کے ساتھ رہنے آئی تھی۔ اس وقت وہ سب سے بالکل الگ تھلگ رہتی خاموش خود میں سمٹی، تنہا گوشہ تلاش کرتی۔ دھیرے دھیرے شکنتلا دیوی، جو اس آشرم کو چلا رہی تھی اور جسے سبھی چھوٹے بڑے پیار سے نانی کہتے تھے اُن کی مسلسل کوشش اور دوسرے بچوں کے بار بار اصرار کرنے پر وہ سب کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے لگی تھی مگر نہ کسی سے بات کرنا نہ کسی کے جھگڑے کا جواب دینا اور نہ ہی کبھی کسی کی شکایت کرنا اُس کی عادت میں شامل تھا۔ تھی تو وہ دس سال کی مگر اُس کی سنجیدگی اور ٹھہراؤ ایسا کہ وہ عمر سے کہیں بڑی لگتی تھی جیسے اُس نے زندگی کے نہ جانے کتنے موسم دیکھ لئے ہوں نہ جانے کتنی صدیوں سے وہ تنہا بھٹک رہی ہو۔ بھٹک تو وہ رہی تھی اپنوں کو بتانے کے لئے، ترس تو وہ رہی تھی ماں کے ممتا بھرے آنچل میں سمٹنے کے لئے، تڑپ تو وہ رہی تھی باپ کی شفقت بھرے سائے کی ٹھنڈک کے لئے۔ دس سال تک اُس کی زندگی میں سب کچھ تھا۔ گاؤں میں ایک چھوٹا سا گھر جس کے آنگن میں تلسی سجی رہتی تھی جس کی پوجا اُس کی ماں ہر صبح کیا کرتی تھی۔ اُس کے بابا رام دُلار جو حصے میں ملی تھوڑی سی زمین پر دن رات محنت کرتے۔ غریب ماں باپ کی اکلوتی بیٹی مہواتتلیوں کی طرح سارا دن کُودتی پھدکتی رہتی۔ سارا دن بچوں کے ساتھ مستی کرتی۔ ماں تالاب پر جانے کو منع کرتی مگر چنچل ہرنی روکے کہاں رُکتی۔ اکثر وہ ماں کی نظریں بچا کر منّی، بلبل، راجو اور پریم کے ساتھ تالاب پر کھیلنے جاتی۔ گھر لوٹتی تو ماں خوب ڈانٹتی۔ اُسے ڈانٹتا دیکھ کر بابا ماں سے اُلجھ جاتے:

''میری بچی کو کچھ مت کہا کرو۔''

''کیوں نہ کہوں؟ معلوم نہیں کتنی شرارتی ہے، پانی میں شرارتیں کرے گی تو کون روکے گا اسے؟ ویسے اب یہ بڑی ہو رہی ہے گھر کے کام کاج میں اسے میرا ہاتھ بٹانا چاہیے سارا دن مستی، سارا دن گھومنا، یہ اچھی لڑکیوں کے لچھن نہیں ہیں۔''

''کیوں غصّہ کرتی ہو۔ ابھی بچی ہے کھیلنے دو پھر زندگی بھر چولہا چوکا ہی تو کرنا ہے''۔

کبھی وہ اپنے ٹولے کے ساتھ امرود، آم اور جامن کے باغ کی طرف نکل جاتی۔ مالی سے نظریں بچا کر چھپ چھپ کر سبھی درختوں پر چڑھ جاتے اور مزے لے لے کر پھل توڑ کر کھاتے۔ اگر مالی کی نظر اُن پر پڑ جاتی تو وہ ڈنڈا لے کر گالیاں بکتا اُن کے پیچھے بھاگتا اور شام تک سب بچوں کے گھر شکایت پہنچ جاتی۔ ماں سُنتی تو سر پیٹ کر رہ جاتی۔ اُس وقت بھی بابا بیچ میں آ کر اُسے بچا لیتے۔ دونوں کے بیچ بحث شروع ہو جاتی۔ وہ اطمینان سے اپنے بابا کے ساتھ ایسے چپک کر بیٹھ جاتی جیسے آندھی طوفان سے بچنے کے لیے کوئی مضبوط دیوار کے سائے میں چھپا ہو۔

رات کے سنّاٹے میں اکثر گاؤں کے گھر کی دھُندلی دُھندلی یادیں اُسے اپنے حصار میں جکڑ لیتیں اور جب آنکھیں اُن تصویروں کے کھیل سے بوجھل ہو جاتیں تو نیند چپ چاپ اُسے اپنی آغوش میں لے لیتی۔ مُہوا کو وہ سب اچھی طرح یاد ہے جب وہ ماں بابا کے ساتھ گاؤں کے پاس ہی ندی پار کر کے شہر ساون کا میلا دیکھنے گئی تھی۔ آم کے باغوں میں عورتیں، لڑکیاں، بچیاں رنگ برنگے کپڑے پہن کر ہلکی ہلکی بُوچھار میں بھی پینگے جُھول رہی تھیں۔ ماں نے اُسے بھی جب پینگ پر بٹھا کر پیچھے سے جھولے کو دھکا دیا تو اُس نے دونوں ہاتھوں سے رسّی کس کر تھام لی، پیٹ میں ہلکی ہلکی لہر اُٹھی اور وہ ہوا میں جھولتے اور گدگدی کو محسوس کر کے کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔ اُس کی کھلکھلاہٹ سن کر اُس کے کھلے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ماں بابا نہال ہو جاتے۔ میلے میں کبھی وہ بابا کے کاندھے پر بیٹھ کر گھومتی تو کبھی ماں کا آنچل پکڑے رنگ برنگی کانچ کی چوڑیاں دیکھ کر مچل اُٹھتی۔ دونوں کلائیوں میں چوڑیاں ڈلوا کر انھیں اوپر اٹھا کر چھن چھناتی۔ ایسے خوشی میں جھوم اُٹھتی جیسے بادلوں کو دیکھ کر مور ناچ اُٹھتا ہے۔ ماں بابا کی آنکھوں کا تارا اُن کے جینے کا سہارا۔ اُسے دیکھ دیکھ جیتے تھے۔ وہ خود ایسے محسوس کرتی تھی کہ جیسے وہ کسی ریاست کی شہزادی ہو۔

پھر ایک روز کچھ ایسی ہوا چلی کہ سب خوشیاں اپنے ساتھ اُڑا لے گئی۔ آنکھوں کا تارا ٹوٹ کر زمین پر اوندھے منہ گرا۔ ماں کا آنچل ہاتھوں سے پھسل گیا۔ بابا کی انگلی چھوٹ گئی۔ وہ ہاتھ کیا چھوٹا، اس کا گھر، اُس کا گاؤں یہاں تک کہ قصبہ ہی چھوٹ گیا۔ ایک شام تالاب پر کھیلتے کھیلتے راجو اور بلبل کے ساتھ اُس کا جھگڑا ہو گیا۔ روتے روتے وہ گھر کی طرف اکیلی ہی چل پڑی۔ اُسے روتا دیکھ کر مُرلی چاچا نے پیار سے پچکارا، چُپ کرانے کے لیے تھیلے میں سے دو امرود کیا دیئے وہ اُن کی انگلی پکڑ راجو اور بلبل کی شکائتیں لگاتی اُن کے ساتھ گھر کی طرف بڑھ گئی۔ شام کا سورج ڈھل رہا تھا اور اندھیرا روشنی نگلنے کو بے

تاب تھا۔ مُرلی چاچا کی انگلی پکڑے باتیں کرتے کرتے گاؤں کی سرحد پیچھے چھوٹ گئی۔ پہلی بار اتنی بڑی ریل گاڑی دیکھی اور خوشی خوشی اُس میں سوار ہوگئی۔ ایک دو بار ماں بابا کے بارے پوچھا تو مُرلی چاچا نے یہ کہہ کر بہلا دیا کہ ''تمہارے بابا کو بتا کر آیا ہوں کہ ہم ریل گاڑی کی سیر کرنے جا رہے ہیں۔ صبح لوٹ آئیں گے''۔ گاڑی میں ہی کھا پی کر جب وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی تو ہوا کے جھونکے اور سارا دن کی اُچھل کُود نے جلد ہی اُس کی آنکھیں بوجھل کر دیں اور وہ مُرلی چاچا کی گود میں سر رکھ کر سو گئی۔

صبح کی دھوپ جب آنکھوں پر پڑی تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ سٹیشن کے ایک کونے والے بینچ پر وہ لیٹی ہوئی تھی اور لوگوں کا سیلاب اِدھر اُدھر جا رہا تھا۔ مُرلی چاچا پاس ہی کسی آدمی سے بحث کر رہے تھے وہ آدمی کہہ رہا تھا۔

''یہ بہت چھوٹی ہے۔ بچی ہے ابھی اس کی اتنی قیمت نہیں دوں گا''۔

''لڑکیوں کو جوان ہوتے دیر لگتی ہے کیا۔ کام تو یہ اب بھی آ سکتی ہے۔ پہلے اُوپر کے کام کروالینا بعد میں تو یہ تمہیں کما کر ہی دے گی''۔

''دو ہزار سے زیادہ نہیں دوں گا''۔

''تین ہزار کا قرض لیا تھا اس کے باپ نے اُس کی وصولی کرنی ہے۔ پانچ دیتے ہو تو ٹھیک ورنہ میں چلا اگلی دُکان پر''۔ یہ کہہ کر اُس نے مُہوا کا بازو پکڑا اور اُسے گھسیٹتے ہوئے چلنے لگا۔ اتنے میں اُس آدمی نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر روک لیا۔

''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی؟''

''بے فکر رہو وہ اتنی دُور کبھی نہیں آ سکتا۔ کُنویں کا مینڈک کنویں میں ہی رہے گا''۔

اُس آدمی نے جیب میں سے روپے نکالے۔ مرلی چاچا نے گن کر اپنی جیب میں ڈالے اور مُہوا کو اُس کے حوالے کر گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ''چاچا'' ''چاچا'' پُکارتی رہی مگر اُس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا اور بھیڑ میں گم ہوگیا۔ وہ چیختی چلاتی رہی روتی گڑگڑاتی رہی مگر اُس کی آواز دنیا کے شور میں دب کر رہ گئی۔ چند سکوں کی خاطر اُس کا بچپن، اُس کی معصومیت اور اُس کی عصمت بازار میں نیلام ہوگئی۔ اُس کلی کو پھول بننے سے پہلے ہی نوچ ڈالا۔ اُس کا جسم ہی نہیں اُس کی رُوح تک چھلنی ہوگئی۔ ماں کا آنچل اُسے پُکارتا رہا اور وہ بابا کے سائے کے لئے تڑپتی رہی۔ پنجرے میں قید بُلبل کی طرح آزادی کے لئے کسمساتی رہی پھڑپھڑاتی رہی۔ چند مہینے اُس دوزخ میں جلنے کے بعد ایک روز وہ اُس پنجرے کو توڑ کر بھاگنے میں کامیاب ہوگئی۔ اور ٹھوکریں کھاتے کھاتے وہ آخر کار آشرم کی محفوظ پناہ میں پہنچا دی گئی۔ بھلا ہو اُس کی بدحالی دیکھ کر اُسے صحیح ٹھکانے پر پہنچانے والے کا۔

نانی کا گھر یہ آشرم ہی تھا اور ان بچوں کے سوا دُنیا میں ان کا بھی کوئی نہیں تھا۔ بچے نہ صرف اُن کی عزت کرتے تھے بلکہ اُن سے محبت اور دُلار بٹورتے اور اُنھیں پیار دیتے۔ نانی کو سبھی بچوں کے دُکھ تکلیف کی خبر ہوتی اور فکر بھی۔ اُن کی کوشش ہوتی کہ جو بچے اپنے ماں باپ سے بچھڑ چکے ہیں اُنہیں N.G.O کی مدد سے اُن کے ماں باپ سے ملایا جائے اور یہ ہی کوشش وہ مہوا کے لئے بھی کر رہی تھی۔ جب مہوا آشرم میں آئی تھی تو نانی کے پیار سے دُلار سے پُچکار کر سب کچھ اُگلوا لیا تھا اور اُس کا درد اپنے سینے میں چھپا لیا تھا۔ اُسے دوسرے بچوں کے ساتھ پڑھنے کے لئے بھیجنا شروع کر دیا اور دھیرے دھیرے کتابوں سے اُس کی دوستی کروا دی تھی۔

شام کے وقت وہ اپنی ہم عمر سہیلیوں کے ساتھ آشرم کے لان میں بیٹھی باتیں کر رہی تھی کہ دفتر کی کھڑکی سے نانی نے جھانک کر دیکھا اور اُسے آواز دے کر اپنے کمرے میں بلایا۔ وہ بھی آواز سنتے ہی اُٹھ کر اُن کے کمرے کی طرف بھاگی۔

''جی نانی۔'' کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے کہا۔

''مُہوا اگر میں یہ کہوں کہ تمہارے بابا ایک دو روز میں تمہیں لینے آ رہے ہیں تو تم کیا کہو گی؟''

''سچ!'' وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ پہلے ہنسی سے کمرا گونج اُٹھا اور پھر آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔

نانی اُٹھ کر اُس کے پاس گئی اُسے سینے سے لگا کر چُپ کرایا۔ ''اگر یہ خوشی کے آنسو ہیں تو انہیں بہہ جانے دو۔ بہت کم بچے اتنے خوش نصیب ہوتے ہیں جن کو کچھ بھی اتا پتا معلوم نہیں ہوتا اور وہ اتنی بڑی دنیا میں اپنے گھر اپنوں، کے بیچ پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تم جانتی ہو یہ کام کس نے اور کیسے کیا ہے؟''

اُس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''جو یوگیش انکل آتے ہیں نہ تم لوگوں سے ملنے اُن کے بہت سے ساتھی ہیں جو اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ کھوئے ہوئے بچوں کو اُن کے گھر پہنچانے میں جی جان ایک کر دیتے ہیں۔ پچھلے چار سال سے اس کام میں لگے تھے اور اب جا کر انہیں کامیابی ملی''۔

''میرا گھر کہاں ہے نانی؟ میرے بابا میری ماں کیسی ہیں؟''

''تم جس ندی کی بات کرتی تھی جو رام جی کے شہر کے پاس ہے، وہ سریوں ندی ہے جو رام جی کے شہر ایودھیا کے پاس بہتی ہے اور آس پاس کے کئی گاؤں پھرنے کے بعد لوگوں سے ملنے کے بعد تمہارے بابا رام دُلار کا پتا چلا۔ چھوٹا سا ایک گاؤں ہے مانڈووہیں پر تمہارا گھر ہے۔ تمہیں تو اپنے بابا کے نام کے علاوہ کچھ معلوم نہیں تھا۔ کیا اپنے ماں بابا کی شکل یاد ہے یا وہ بھی نہیں؟ پہچان لوگی نا اُنھیں؟''

''کیسی بات کرتی ہیں نانی۔ اپنے ماں بابا کی شکل میں کیسے بھول

سکتی ہوں۔اُن کو تو میں لاکھوں میں بھی پہچان لوں''۔

''تو بس اب تم تیاری کرلو اپنے گھر جانے کی۔ ہوسکتا ہے وہاں جا کر تمہیں لوگوں کی باتیں سننی پڑیں مگر تُم چُپ چاپ سب سُن لینا کسی کو کچھ مت کہنا اور نہ ہی اُن صفحوں کا ذکر کسی سے کرنا جنہیں تم پھاڑ کر کہیں دُور پھینک آئی ہو۔ ہم سب تمہارے اپنے ہیں۔ یہ گھر بھی تمہارا ہے جب دل اُداس ہو فون پر بات کر لینا یا خط لکھ دینا کوئی مشکل آن پڑے تو یاد رکھنا تمہاری نانی ابھی زندہ ہے۔ جاؤ جا کر تیاری کرو اپنے اچھے مستقبل کے لئے''۔

مُہوا کے چہرے کی خوشی اور اُس کی آنکھوں سے جھلکتا پیار اور عقیدت کے جذبات نے نانی کی روح کو خوشی سے شرابور کر دیا۔

دو دن بعد ہی رام دُلار اپنی بیٹی کو لینے آشرم پہنچ گیا۔ باپ بیٹی اس طرح ملے کہ آشرم کا کوئی بھی باشندہ آنکھیں نم کئے بنا نہ رہ سکا۔ سبھی اُس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے اور اُسی شام سب کو الوداع کہہ اور یوگیش انکل کو تہہِ دل سے شکریہ ادا کر نانی کو خط لکھنے کا وعدہ کر وہ بابا کے سنگ سٹیشن کی طرف روانہ ہوگئی۔

پندرہ گھنٹے کے سفر میں مُہوا نے پورے پانچ سال کے درد اور تکلیف کا حساب اپنے بابا کو دے دیا۔ شروع کے چند مہینوں کا عذاب وہ بیان نہ کر سکی اس فکر میں کہ کہیں وہ سب سُن کر دل پر بوجھ نہ پڑ جائے۔ اُس نے محسوس کیا کہ بابا پہلے سے کہیں زیادہ کمزور ہو گئے ہیں۔ اُن کے چہرے پر رونق کی بجائے لاچاری، مجبوری اور بے کسی صاف دکھائی دے رہی ہے۔ اُس کا درد سینے میں ضبط کرنے کے بعد جب اُنھوں نے اپنے سینے کے داغ اُسے دکھائے تو وہ تڑپ اٹھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اتنے دنوں سے جو اپنے گھر کے خواب وہ آنکھوں میں سجا کر لوٹ رہی ہے وہ ہمیشہ ادھورے ہی رہیں گے۔ بابا نے اُسے بتایا کہ:

''تمہارے کھو جانے بعد ہم لوگ دیوانوں کی طرح تمہیں ڈھونڈتے رہے۔ جگہ جگہ تلاش کیا۔ کوئی پیر فقیر کوئی پنڈت کچھ بھی نہیں چھوڑا جو جس جگہ کہتا تھا اُسی طرف بھاگتے تھے۔ پھر ایک روز مجھے گاؤں کے کسی آدمی نے بتایا کہ کسی نے تمہیں مُرلی کے ساتھ سٹیشن پر دیکھا تھا اور مجھے یکلخت خیال آیا کہ جب سے تم لاپتہ ہوئی ہو مُرلی میرے پاس تقاضا کرنے نہیں آیا۔ مُرلی کو ڈھونڈا تو پتہ چلا وہ کئی دنوں سے گاؤں میں نہیں ہے اور جب وہ دس پندرہ روز بعد گاؤں لوٹا تو میں نے اُسے گھیر لیا۔ اُس وقت وہ نشے میں چور تھا اور مجھے ہی آنکھیں دکھانے لگا جب میں نے بھی غصّے سے گریبان پکڑ لیا تو چلاّ اٹھا کہ ''میں نے اپنا قرض وصول کر لیا ہے تمہاری بیٹی کو بیچ دیا''۔ یہ سُنتے ہی مجھے غش آ گیا اور میں وہیں گر گیا۔ لوگ مجھے گرتا دیکھ میری طرف لپکے اور وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ جب تمہاری ماں کو سارا قصّہ سُنایا تو وہ غصّے سے پاگل ہو اُٹھی۔ مگر میری بگڑی حالت دیکھ وہ خاموش رہی۔ غصّے کی جوالا اُسے کے سینے میں دہکتی رہی وہ رات قہر بن کر ٹوٹی۔ نہ جانے روتے روتے رات کے کس پہر آنکھ لگ گئی صبح جب اُٹھ کر دیکھا تو تمہاری ماں وہاں نہیں تھی۔ آس پاس کے چند لوگ ساتھ ہو لئے اور اُسے ڈھونڈنے نکل پڑے۔ ابھی اُسے ڈھونڈ ہی رہے تھے کہ کچھ لوگ بھاگے بھاگے آئے اور بتایا کہ کُنویں میں ایک عورت کی لاش تیر رہی ہے۔ جب تک میں وہاں پہنچا لوگ اسے نکال چکے تھے اور جس کا مجھے ڈر تھا وہ ہی ہوا۔ تمہاری ماں یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی اور اُس نے اپنی جان دے دی مگر وہ ایسے ہی نہیں مری۔ کچھ دیر بعد میں پتا چلا کہ مرنے سے پہلے اُس نے مُرلی سے بدلا لے لیا۔

جب میں سور ہا تھا وہ رات کے اندھیرے میں اُٹھی اور میری درانتی لے کر مُرلی کے گھر پہنچ گئی جو شراب کے نشے میں چُور آرام کی نیند سو رہا تھا۔ اُس نے جاتے ہی اُس کا گلا کاٹ دیا۔ درانتی وہیں پھینکی اور کنویں میں چھلانگ لگا دی۔'' رام دُلار کی آواز بولتے بولتے ڈوب گئی اور مُہوا کی رو رو کر ہچکی بندھ گئی یہ خبر اُس پر بجلی کی طرح گری تھی۔ اگلی خبر اُس سے بھی زیادہ خطرناک تھی جب اُسے گھر کے پاس جا کر یہ بتایا گیا کہ اب گھر میں اُس کی نئی ماں انتظار کر رہی ہے۔

پانچ سال میں سب کچھ بدل چکا تھا۔ نہ گھر وہی تھا جس میں ماں کا پیار مہکتا تھا، نہ وہ تُلسی کا آنگن تھا نہ وہ ساتھ نظر آئے۔ لوگ اس سے کتراتے تھے جیسے اُسے چھوت کی بیماری ہو گئی ہو۔ کھوئی ہوئی جنّت کے خواب اور اسے واپس پا لینے کی خوشی وہم سے زیادہ نہ نکلی۔ وہ تو اپنے گھر اپنے گاؤں اپنے لوگوں میں واپس آئی تھی دل میں یہ ارمان لئے کہ سب اُسے دوبارہ پا کر خوش ہونگے اُس کے زخموں پر مرہم رکھیں گے اور وہ دھیرے دھیرے اُس درد کو بُرا خواب سمجھ کر بھول جائے گی۔ گھر سوتیلی ماں اور اُس کے دو سال کے بیٹے کا ہو چکا تھا۔ اُس کے بابا بھی اب اُس کے نہیں رہے۔ پہلے دن ہی اُسے دیکھتے ہی اُس کی ماں کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے اور چار دنوں بعد اُس کی ماں ایسے نشتر چُبھانے لگی تھی کہ سیدھے اُس کے دل پر لگتے۔ بابا سے کچھ کہتی کیسے اُنھوں نے اپنی زبان، آنکھیں اور کان بند کر لئے تھے۔ گھر سے باہر نکلتی تو منچلے، آوارہ لڑکے اُسے دیکھ کر گندے گندے اشارے کرتے اور ایسی پھبتیاں کستے جو گرم شیشے کی طرح اُس کے کانوں میں پگھلتی۔

ایک روز اُسے اچانک بلبل مل گئی جب اُس نے بلانے کی کوشش کی تو اُس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ''ہم تمہیں نہیں جانتے بچپن کی بات اور تھی۔ ہمیں تم سے بات کرنے کو منع کیا ہے۔'' بچپن میں ماں کی سہیلیوں کو جنہیں وہ موسی، چاچی کہا کرتی تھی وہ ہی اُسے بُلا بُلا کر چٹخارے لے لے کر ایسی ایسی باتیں پوچھتی تھیں کہ ''کتنے مردوں کے بستر گرم کر چکی ہو؟ بہت ستاتے تو نہیں تھے تمہیں؟ کتنی کتنی عمر کے مردوں کو خوش کر چکی ہو؟ کیا تجھے گود میں۔۔۔؟'' اور نہ جانے کیا کیا جملے سُن کر اُس کا خون کھول جاتا اور وہ چُپ چاپ روتی روتی نئے زخم لئے گھر لوٹ آتی۔ اُس نے گھر سے باہر نکلنا ہی بند کر دیا تھا۔ بات کرے تو کس سے اپنا دُکھ درد سنائے تو کسے کوئی ہمدرد نہ تھا۔ اُسے آشرم کے ساتھی یاد

باقی صفحہ ۷۳ پر ملاحظہ فرمائیے

''قیامت کی چال''

گلزار جاوید

(راولپنڈی)

''میں نے کہا! ذرا جلدی سے اٹھ کر دیکھو باہر کیسا شور ہے؟''
صوبیدارنی نے روایتی گھبراہٹ میں پریشانی کا عنصر شامل کرتے ہوئے اپنے شوہر صوبیدار اسماعیل کا مونڈھا ہلا کر جگانے کی کوشش کی۔

''اللہ کا واسطہ' کبھی تو میری جان بخش دیا کر' میرا جینا تو پہلے ہی تُو نے دوبھر کر رکھا تھا اب تو سونا بھی حرام کر دیا ہے۔''

''میری بلا سے! چاہے پکے سو جاؤ' مجھے کیا پڑی ہے تم جیسے بے فیض آدمی سے مغزماری کرنے کی' میں تو یہ کہہ رہی تھی باہر گلی میں بہت شور ہو رہا ہے اور ہمسایوں کے اونچا' اونچا بولنے کی آوازیں بھی آ رہی ہیں خدا خیر کرے کسی کی لڑائی تو نہیں ہوگئی۔''

''بندی خدا! ہوتی ہے تو ہونے دے' نہ میں تھانیدار لگا ہوں اور نہ تُو کوتوال'' تہبند کے دونوں سروں کو کھول کر پھر سے کستے ہوئے صوبیدار اسماعیل نے سلیپر میں پیر ڈالے اور کھونٹی پر ٹنگے کُرتے کی جانب اُچک کر ہاتھ بڑھایا۔

''السلام علیکم ڈاکٹر صاحب! خیریت تو ہے' یہ کیا ماجرا ہے۔ ہمارے محلے میں تو کبھی کوئی کسی سے اونچی آواز میں بات نہیں کرتا پھر یہ شور شرابہ کس بات پر ہے؟''

''میں بھی آپ کی طرح لاعلم ہوں۔ ابھی ابھی دفتر کی وین سے اترا ہوں' مجمع دیکھ کر ادھر آ گیا ہوں۔ وہ دیکھئے! سامنے حافظ صاحب کھڑے ہیں' ان کی دائیں جانب ایوب صاحب بھی خاصے مصروف نظر آ رہے ہیں انہی سے مل کر صورتحال معلوم کرتے ہیں۔''

''آیئے' آیئے! میں سوچ رہا تھا کہ اتنے شور شرابے کے باوجود آپ دونوں گھر سے باہر کیوں نہیں نکلے۔'' دائیں ہاتھ سے چہرہ سہلاتے اور بائیں ہاتھ کو کولہے پر جماتے ہوئے حافظ زکریا نے صوبیدار اسماعیل اور ڈاکٹر افضل کو خوش آمدید کہا۔

''جی میں تو ابھی دفتر کی.....''

''قبلہ یہ فرمائیں یہ ہنگامہ ہے کیا؟'' صوبیدار اسماعیل کی دخل درمعقولات پر ڈاکٹر افضل کا جملہ ادھورا رہ گیا۔

''اجی کیا عرض کروں' میں بھی آپ لوگوں کی طرح معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر کامیابی نہیں ہوئی۔''

''کیسی انہونی بات کر رہے ہو برخوردار! یہی شکایت تمہاری جگہ اس بچی نے کی ہوتی تو بات سمجھ میں آنے والی تھی؟ تمہاری جانب سے اس قسم کا الزام' میری سمجھ سے باہر ہے۔'' ٹھیکیدار عجائب خان نے قراقلی ٹوپی کو سر سے اتار کر دائیں ہاتھ میں تھام لیا اور بائیں ہاتھ کو فارغ البال سر پر پھیرتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا۔

''میں' میں تو چاچا جی کبھی چھوٹوں سے بدتمیزی نہیں کرتی' بھلا! عزیز کو گالی کیوں دوں گی یہ تو عمر میں مجھ سے پورا ڈیڑھ سال بڑا ہے۔'' لڑکی' جو ٹھیکیدار عجائب کے استفسار پر گھبراہٹ اور لکنت کا شکار تھی کسی قدر سنبھل' سنبھل کر اور اعتماد سے اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب اس کی آواز گلے میں رندھنے کے بجائے لوگوں کو سنائی بھی دے رہی تھی۔

''یار! یہ لونڈا جب سے چار جماعتیں کیا پڑھا ہے اس نے محلے والوں کو کمی کمین بنا کر رکھ دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ چاہتا کیا ہے؟'' ماسٹر ذوالفقار علی نے بیزاری سے مجمع کے پیچھے منہ کر کے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

''کاکا! ایک بار پھر سوچ لے! تیری بات سچی نہ ہوئی تو..... پھر تو میرا نام جانتا ہے۔'' پہلوان آزاد نے تلوار کٹ مونچھوں کو مروڑتے ہوئے عزیز کو دھمکایا اور گلے میں پڑے ہوئے پھولدار مفلر کو زور سے جھٹک کر کندھے پر ڈالا اور داد طلب نظروں سے مسکرا کر لوگوں کی جانب دیکھنے لگا۔ جس سے اس کا پیتل کا مصنوعی دانت اور نمایاں ہوگیا جسے وہ سونے کا کہہ کر لوگوں کو مرعوب کیا کرتا تھا۔

''آرام سے بھئی آرام سے' دونوں اپنے بچے ہیں اور ہمارے ہاتھوں میں کھیل کود کر بڑے ہوئے ہیں۔ یقیناً کوئی نہ کوئی غلط فہمی ہوئی ہے ورنہ کل تک تو یہ خود آپس میں کھیلتے تھے۔'' لمبے قد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ولایت حسین عرف شاہ جی دوکاندار نے ہاتھ میں پکڑے دودھ کے ڈبّے کو نچاتے ہوئے مجمع کے بیچ و بیچ کھڑے' پستہ قد قاضی دلاور حسین کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی جن کی آواز اُن کے قد سے زیادہ اونچی ہو رہی تھی۔

''حیرت ہے بھئی! جہاں اتنے معاملہ فہم بزرگ موجود ہوں وہاں چھوٹی سی بات بتنگڑ بن جائے؟ چلو بھئی بچو! آپ لوگ اپنے گھروں کو جاؤ اور نوجوانوں کا بھی یہاں کوئی کام نہیں یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ اسے تماشا بنایا جائے۔ حافظ صاحب' قاضی صاحب' ٹھیکیدار صاحب' صوبیدار صاحب اور شاہ صاحب' آپ لوگ یہاں ٹھہریں باقی سب حضرات تشریف لے

جائیں۔''

ڈاکٹر افضل نے اپنے علم، تجربے اور تحمل مزاجی کو بروئے کار لاتے ہوئے مسئلے کو پیچیدہ ہونے سے بچایا۔

''میرا خیال ہے! گفتگو کے لئے یہ جگہ نامناسب ہے اگر آپ لوگ پسند کریں تو میرے غریب خانے پر تشریف لے چلیں وہاں آرام سے بیٹھ کر بچوں کا مؤقف سنیں گے یقیناً کوئی بہتر حل نکل آئے گا اور اسی بہانے چائے کا ایک کپ بھی نوش فرمالیجئے گا۔''

''اوہ نہیں جی حافظ صاحب! اس طرح تو مسئلہ اور طول پکڑ جائے گا۔'' قاضی دلاور حسین نے حافظ زکریا سے اپنے روایتی اختلاف کا فائدہ اٹھا کر طنز کا تیر چلایا۔ ''آپ کی طرح تمام لوگ فارغ البال نہیں ہیں سبھی کو کوئی نا کوئی کام کرنا ہے جو کچھ فیصلہ کرنا ہے جلدی کریں اور یہیں پر کریں یہ بھی تو اپنا ہی محلّہ ہے۔''

''ہاں تو بیٹا! ڈرنے اور خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، سچ سچ بتاؤ بات کیا ہے؟'' ڈاکٹر افضل نے عینی کو براہِ راست مخاطب کیا جس کا پورا نام قرۃ العین تھا گھر والے پیار سے عینی کہا کرتے تھے۔ عینی کے والد روزگار کے سلسلے میں بیرون ملک گئے ہوئے تھے جبکہ عینی کی والدہ بطور اسکول ٹیچر ملازمت کیا کرتی تھیں۔ عینی کل پانچ بہن بھائی تھے جن میں عینی سب سے بڑی تھی اور اسی سال میٹرک کرنے کے بعد کالج میں داخل ہوئی تھی۔

''میں خدا پاک کی قسم کھا کر کہتی ہوں انکل! میں نے کوئی بات نہیں کی۔''

ڈاکٹر افضل کے استفسار پر لڑکی پھر سے گھبراہٹ کا شکار ہوگئی اور اس نے جلدی، جلدی اپنے جملے اس طرح ادا کئے جیسے کلاس میں بچہ سبق یاد نہ ہونے کے باعث غیر یقینی انداز میں استاد کے حکم پر سبق سنانے لگے۔

''بیٹا جی! یہ کس طرح ہوسکتا ہے؟ آپ کہتی ہو، کوئی بات نہیں ہوئی اور برخوردار کہتا ہے کہ آپ نے اسے گالی دی ہے۔''

''جی بالکل! میں صحیح کہہ رہا ہوں۔'' حافظ زکریا کی مداخلت پر لڑکے نے درمداخلت کی۔

''تم چپ کرو میاں! تمہاری باری جب آئے تب بولنا۔'' ماسٹر ذوالفقار کے تحکمانہ لہجے نے عزیز کو خاموش کرادیا۔

''انکل جی! میں ہر طرح کی قسم اٹھانے کو تیار ہوں۔ میں نے عزیز سے ایک لفظ تک نہیں کہا۔'' لڑکی کے لہجے میں روہانسی اور التجا نمایاں ہو گئے تھے۔

''یار عزیز! یہ کیا ماجرا ہے؟ بات صاف، صاف کیوں نہیں کرتے۔ عینی کہتی ہے کہ اس نے ایک لفظ تک نہیں بولا اور تم کہتے ہو کہ اس نے تمہیں گالی دی ہے۔''

''جی! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، آپ میرا یقین کریں۔'' عزیز کا جواب سن کر ڈاکٹر افضل جیسے تحمل مزاج شخص کے چہرے پر بھی تشویش کی لہر نمایاں ہوگئی اور وہ بے بسی سے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھنے لگے۔

''تم اسے چھوڑو بیٹا! مجھے بتاؤ کہ قصہ شروع کیسے ہوا؟'' ولایت حسین عرف شاہ جی دوکاندار نے عینی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دریافت کیا۔

''انکل جی! آپ میرا یقین کریں، میں نے.....'' ''بیٹا، بیٹا! ہمیں تمہاری بات کا پورا یقین ہے تم صرف یہ بتاؤ کہ بات شروع کیسے ہوئی؟'' صوبیدار اسماعیل نے عینی کو درمیان میں ٹوک کر دریافت کیا۔

''آج میرا کالج میں پہلا دن تھا۔ میں چھٹی کر کے گھر واپس آ رہی تھی کہ راستے میں عزیز مل گیا اور بولا'' ''یعنی آپ نے کوئی بات نہیں کی سلسلہ کلام عزیز نے شروع کیا۔''

''جی.....جی ہاں!'' ڈاکٹر افضل کے سوال پر عینی نے اعتماد سے جواب دیا۔

''بیبیو! آپ لوگ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہی ہیں، کچھ تو عقل سے کام لو، یہاں کام کی باتیں ہو رہی ہیں کوئی کھیل تماشا تھوڑی ہو رہا ہے، جاؤ اپنا اپنا چولہا ہانڈی کرو۔'' سگریٹ کا گل جھاڑ کر چھتوں اور دیواروں سے نظارہ کرنے والی خواتین کو مخاطب ہو کر پہلوان آزاد نے رُعب جمایا تو تمام خواتین سروں پر دوپٹہ لیتے ہوئے اپنی چوری پکڑے جانے پر شرمندہ ہوگئیں اور چھتوں، دیواروں سے نیچے اُتر کر جھروکوں اور سوراخوں سے نظارہ کرنے لگیں۔

''لو میاں عزیز! نماز کا وقت ہو رہا ہے جلدی سے بتاؤ سچ کیا ہے۔'' ایوب صاحب نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے عزیز کو وارننگ دی۔

''انکل آپ مجھے کب سے جانتے ہیں؟'' ''ابے جب سے تو پیدا ہوا ہے تب سے اور کب سے؟'' ٹھیکیدار عجائب نے عزیز کے سر پر چپت رسید کرتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

''اوہ میں تو اس کے باپ کی شادی سے پہلے کا واقف ہوں اس کے خاندان کا! اللہ بخشے بڑا ہی نیک انسان تھا۔''

''مسئلہ اس کا ہے اس کے باپ کا ذکر کہاں سے آ گیا۔ بس کرو بھئی عزیز بس کرو بات سیدھی اور دوٹوک ہونا چاہئے۔ قاضی دلاور حسین نے فیصلہ کن انداز میں اپنے غصے کا اظہار کیا۔

''میں اور عینی بچپن سے اب تک ایک ساتھ کھیل کود کر بڑے

ہوئے ہیں۔ابھی ابھی اسماعیل انکل نے میرے خاندان کی شرافت کا ذکر کیا ہے۔''

''ہاں باباہاں!اسٹامپ لکھوالے تو شریف' تیرا باپ شریف' تیرا دادا.....'' پہلوان آزاد نے گفتگو کی طوالت پر ناراضگی کا اظہار کیا۔

''آزاد صاحب ! آرام سے' آرام سے' اس طرح بچے ڈر جائیں گے اور ہم معاملے کی تہہ تک نہیں پہنچ پائیں گے۔جی تو بیٹا! جلدی سے آپ اپنی بات مکمل کیجئے تا کہ کوئی نتیجہ برآمد ہو سکے۔''

''میں سمجھتا ہوں بلکہ حیران بھی ہوتا ہوں۔مجھ سے پہلے یہ بات آپ کے ذہن میں کیوں نہ آئی۔(ڈاکٹر افضل کو مخاطب کرتے ہوئے عزیز نے اپنی بات جاری رکھی) اور آپ ہی پر کیا موقوف ہمارے دیگر پڑھے لکھے اور روشن فکر بزرگوں کو یہ خیال کیوں نہ آیا۔جسے سوچ اور محسوس کر کے میں خود اپنی نظروں میں انتہائی درجے کا مجرم بن چکا ہوں۔میرے احساسِ جرم میں میرے ساتھ نہ صرف آپ تمام حضرات بلکہ دنیا کے وہ تمام مرد شامل اور سخت تعزیر کے مستحق ہیں جن کی شہیانہ مزاجی کے زیرِ اثر آج کے ماڈرن' مہذب' کلچرڈ اور ترقی یافتہ دور کی عورت عدم تحفظ کا شکار ہو کر ہماری ہوس ناکی سے بچنے کے لئے نقاب لینے پر مجبور ہے.....!

عزیز نے بظاہر سانس لینے کا وقفہ کیا مگر وہ اس بہانے دائیں' بائیں نظریں گھما کر اپنے بزرگوں کا ردِعمل جانچنا چاہتا تھا۔

میرے بچپن کی ساتھی' قرۃ العین نے نقاب لے کر مجھے ایسی گالی دی ہے جس سے میں اور میرا ضمیر ندامت کی انتہاؤں پر پہنچ گئے ہیں۔یہ گالی میری اکیلی ذات پر منطبق نہیں ہوتی۔یہ ہم سب مردوں کی ذات کے لئے شرمناک چیلنج ہے۔یہ ہمیں اس وقت تک ذلت کی پستی سے سر ابھارنے نہیں دے گی جب تک ہم اپنی نصف بہتر کو اپنے مہذب ہونے کا ثبوت اس طرح فراہم کر سکیں کہ اس کے دل' دماغ شعور اور لاشعور سے عدم تحفظ کا احساس ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے.....اور.....وہ ہماری طرح آزاد و خود مختار زندگی بسر کر سکے۔

عزیز کے بیان کے بعد کچھ دیر کے لیے اس مختصر مجمعے پر خاموشی چھائی رہی۔کچھ چہروں پر ذرہ دیر کے لیے حیرانی، کچھ پر پشیمانی اور کچھ پر ندامت کی لہر نمودار ہو کر ہوا میں تحلیل ہو گئی۔کسی نے ہنسی، کسی نے غصّے اور کسی نے شفقت سے عزیز کے سر اور کمر پر دھپ رسید کرتے ہوئے تاکید، تنبیہہ اور نصیحت کا درس دے کر عینی کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔

عزیز مگر اپنی جگہ آج بھی حیران و پریشان کھڑا اپنے سوال کے جواب کا منتظر ہے۔۔۔ایک اکیلے۔۔۔عزیز پر کیا موقوف۔۔۔نجانے کتنے نوجوان اور نوعمر عزیز۔۔۔اپنے سوالوں کے جوابات کے منتظر ہیں۔۔۔وقت جس تیزی سے گزرتا جا رہا ہے۔۔۔سوالات اُس سے بھی زیادہ برق رفتاری سے بڑھتے جا رہے ہیں۔۔۔اور۔۔۔اُن سوالوں کے پیچھے چھپا گھور اندھیرا ۔۔۔قیامت کی چال چل رہا ہے۔۔۔!!!

بقیہ: قصور کس کا

کر دیں۔مجبوری تھی جی'' مگر اس بار ماروکی آواز کے ساتھ ہی گولی چل گئی۔پہلی گولی اس کے دائیں بازو میں لگی۔زوردار چیخ کے ساتھ وہ بازو پکڑ کر دہرا ہو گیا۔دوسری دوسرے بازو میں۔خوف اور تکلیف کی شدت۔چیخ چیخ کر روتے ہوئے اس نے اپنے دونوں بازوؤں کو پکڑ لیا۔

گولیاں اب بھی چل رہی تھیں۔تیسری گولی دائیں اور چوتھی گولی بائیں ٹانگ میں اتر گئی۔وہ گھٹنوں کے بل وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔آس پاس کافی لوگ تھے کوئی کچھ نہیں بول رہا تھا کچھ ڈرے ہوئے تھے۔کچھ سوچ رہے تھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے صحیح ہو رہا ہے ایسا ہی ہونا چاہئے۔ان لوگوں کی وجہ سے زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔خون کے فوّارے اس کے جسم سے ابل رہے تھے۔شدید کمزوری میں وہ لمبا لمبا لیٹ گیا۔چند ہی لمحوں میں وہاں ایک تیس سال کے جوان آدمی کا مردہ جسم پڑا رہ گیا جسے کچھ لوگ نفرت اور کچھ سہمی ہوئی ترس کھانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

آدھے گھنٹے کے بعد میڈیا سے خبر نشر ہونے لگی ہر چینل بازی لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔سنسنی خیز انداز اور طریقوں سے اس خبر کو نشر کیا جا رہا تھا۔خبروں کے لحاظ سے آج کا دن اچھا تھا ایک بڑے چینل کے مذہبی پروگرام کے میزبان کہہ رہے تھے مجھے نہ تو رینجر سے شکایت ہے نہ اس شخص سے ہمدردی کیوں کہ اس نے جرم کیا تھا مگر افسوس اس ملک میں کوئی قانون نہیں رہا نہتے انسان کا دن دہاڑے قتل انتہائی افسوسناک ہے۔بااختیار لوگوں کو اس پر فوری ایکشن لینا چاہئے۔

کچھ حساس خواتین خبر کے وڈیو کو دیکھ کر رو رہی تھیں جو کہ ہر چینل سے باقاعدہ تواتر کے ساتھ دکھائی جا رہی تھی۔کچھ لوگوں نے آج رات کا کھانا چھوڑ دیا تھا اور کچھ کمزور دل کے لوگ ہاسپٹل پہنچ گئے تھے۔

فضا سوگوار تھی۔طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔میں سوچ رہی تھی۔اس واقعہ کا ذمہ دار کون تھا۔حکومت، رینجرز، خود مجرم۔۔یا حالات؟؟،،قصور کس کا؟؟

''حیرت سرائے''

شہریار (علی گڑھ، بھارت)

ہمارے عصر کے نہایت محترم ومعتبر شاعر جناب شہریار کچھ دنوں سے صاحب فراش ہیں۔ پہلے آپ دبئی میں بڑے صاحبزادے ازاں بعد ممبئی میں چھوٹے صاحبزادے کے پاس زیرِ علاج رہنے کے بعد آج کل اپنی رہائش گاہ 101، سفینہ کمپلیکس، میڈیکل روڈ، علی گڑھ میں مقیم ہیں۔ ادارہ چہارسُو شہریار صاحب کے مداحین اور قارئین سے شہریار صاحب کی صحت یابی کی دعا کا ملتجی ہے۔ احباب کی سہولت کے لئے شہریار صاحب کا موبائل نمبر درج کیا جاتا ہے۔

0091-9837061628

آسماں کچھ بھی نہیں اب تیرے کرنے کے لئے
میں نے سب تیاریاں کرلی ہیں مرنے کے لئے

اس بلندی خوف سے آزاد ہو اُس نے کہا
چاند سے جب بھی کہا نیچے اترنے کے لئے

اے زمیں کیوں تیرے نقشے سے نہیں ہٹتی نظر
رنگ کیا کوئی بچا ہے اس میں بھرنے کے لئے

یہ زمیں حیرت سرائے ہے کہاں تھی یہ خبر
یوں ہی آ نکلا تھا میں تو سیر کرنے کے لئے

کتنا آساں لگ رہا ہے مجھ کو آگے کا سفر
چھوڑ آیا پیچھے پرچھائیں کو ڈرنے کے لئے

○

وقت تیری یہ ادا میں آج تک سمجھا نہیں
میری دنیا کیوں بدل دی مجھ کو کیوں بدلا نہیں

اس نتیجے پر پہونچنے میں بڑی مدت لگی
تجھ سے اچھے تو بہت ہیں پر کوئی تجھ سا نہیں

دور جاتی ایک پرچھائیں ہوا میں ہلتا ہاتھ
میں جدائی کا وہ منظر آج تک بھولا نہیں

پھر مجھے کیوں لگ رہا ہے یہ کہ منزل دور ہے
اس سفر میں سچ یہی ہے میں کہیں ٹھہرا نہیں

اک نئے انداز سے ہوگی بسر اب زندگی
میرے حصّے کی زمیں پر آسماں سایا نہیں

○

امین راحت چغتائی

(راولپنڈی)

زندگی کرنے کا بھی کوئی بہانہ چاہیے
اب صلیبِ دار کو بھی آزمانا چاہیے

کسی نے روکا روشنی کو پردۂ ظلمات سے
رازِ سربستہ سے اب پردہ اُٹھانا چاہیے

جس نے زندان وسلاسل کی روایت عام کی
پابجولاں اُس کو بھی اِک روز لانا چاہیے

بیٹھ کر مسند پہ جو کرتا ہے تلقینِ وفا
آئینے کے روبرو اُس کو بھی لانا چاہیے

دیکھنا پل چھن میں یہ بھی فیصلہ ہو جائے گا
کس کو آنا چاہیے اور کس کو جانا چاہیے

احتجاجِ خاک وخوں کا جس کو اندازہ نہیں
خاک وخوں میں اُس کو بھی اِک دن رلانا چاہیے

تختِ دارا پر نظر آئے گدائے بے گلیم
کوئی تو لمحہ کبھی ایسا بھی آنا چاہیے

بستیاں بھی شوق سے آباد کرتے جایئے
یوں کسی کے دل میں بھی اِک گھر بنانا چاہیے

شاید اُن کو بھی ہو کچھ احساس ڈھلتی شام کا
روٹھنے والوں کو پھر چل کر منانا چاہیے

ہم سناتے جائیں، وہ احوالِ دل سنتے رہیں
کوئی شب اِک خواب ایسا بھی تو آنا چاہیے

چھین کر جو لے گیا راحتؔ سکونِ شہر کو
کوچہ و بازار میں اُس کو بھی لانا چاہیے

○

منظر ایوبی

(کراچی)

حال ہے کیوں ترے شہر کا ابتر پوچھو ناں
کہاں گئے سب مست قلندر پوچھو ناں

عشق میں کیا گزری اس دل پہ پوچھو ناں
کھائے ہیں کتنے کنکر پتھر پوچھو ناں

کس نے اتارا دل والوں کے سینے میں
زہریلی باتوں کا خنجر پوچھو ناں

بستی کے سب لوگ ہیں آسودہ تو پھر
ڈاکے کیوں پڑتے ہیں گھر گھر پوچھو ناں

گھر کی بربادی میں کس کا ہاتھ نہیں
ایک سے ایک ہے ہم میں بڑھ کر پوچھو ناں

بستی میں کیا جاننے والا کوئی نہیں
کس جانب سے آئے ہیں پتھر پوچھو ناں

جس کی خاطر جوگی بن کر نکلا تھا
کیوں نہیں آیا لوٹ کر وہ گھر پوچھو ناں

کون ہے جو راتوں کو نہیں سونے دیتا
ہمّت ہے تو چھت پہ جا کر پوچھو ناں

○

سعید قیس
(بحرین)

پھر وہی سوچ کہ اب کیا ہو گا
تجھ سے ملنے کا سبب کیا ہو گا

ہم تجھے خود ہی بھُلا بیٹھے ہیں
ہم پہ اب اور غضب کیا ہو گا

اب نہ دل ہے نہ تمنّا دل کی
اب ہمیں رنجِ طلب کیا ہو گا

تم سے مل کر بھی ہمیں چین کہاں
آدمی ہم سا عجب کیا ہو گا

ہم کہ بے نام و نشاں زندہ ہیں
ہم غریبوں کا لقب کیا ہو گا

قیسؔ تنہا ہوں تو اب سوچتا ہوں
آج ہنگامۂ شب کیا ہو گا

○

سرور انبالوی
(راولپنڈی)

کِس دیس جا بسے مرے پیاروں کو کیا ہوا
آنسو بہاتی آئیں بہاروں کو کیا ہوا

صحنِ چمن کی زینتیں بھی ساتھ لے گئے
پنچھی اُداس اُداس نظاروں کو کیا ہوا

کیوں ننھے بچے سہمے سے رہتے ہیں اِن دنوں
کیوں چپ لگی ہے ان کے غباروں کو کیا ہوا

بنجارے لے کے خیمے بھی معدوم ہوگئے
بتلائے کون عشق کے ماروں کو کیا ہوا

کُونجوں کی ڈاریں رہتی ہیں جھیلوں سے دُور دُور
مانجھی کدھر گئے ہیں شِکاروں کو کیا ہوا

مٹی پہ اب دیا بھی جلاتا نہیں کوئی
لوٹے نہیں ہیں وقت کے دھاروں کو کیا ہوا

تِتلی کے رنگ اُڑ گئے جگنو بُجھے بُجھے
''جانے یہ میرے دل کے شراروں کو کیا ہوا

میں نے تو اُس کے درد کو دل میں بسا لیا
اُس نے نہ پوچھا درد کے ماروں کو کیا ہوا

اُس نے سُرور انبالوی اُلٹی نقابِ رخ
پھیکا پڑا ہے چاند ستاروں کو کیا ہوا

○

پروفیسر خیال آفاقی
(کراچی)

تم کتنے نیک دل ہو، میں کتنا با خدا ہوں،
یہ تم بھی جانتے ہو، یہ میں بھی جانتا ہوں
تم کتنے متقی ہو، میں کتنا پارسا ہوں،
یہ تم بھی جانتے ہو، یہ میں بھی جانتا ہوں

ہونٹوں پہ جو ہے سو ہے، دل میں بتاؤ کیا ہے،
ان مسکراہٹوں میں کیا کیا چھپا ہوا ہے
جو تم چھپا رہے ہو، جو میں چھپا رہا ہوں،
یہ تم بھی جانتے ہو، یہ میں بھی جانتا ہوں

میں تنگ اپنے دل سے، تم بھی ہو تنگ دل سے،
میں بھی خجل خجل سا، تم بھی خجل خجل سے
تم چھپ کے کیوں ہنسے ہو، میں کھل کے کیوں ہنسا ہوں،
یہ تم بھی جانتے ہو، یہ میں بھی جانتا ہوں

مجھ سے جفا نہ ہوگی، تم سے خفا نہ ہو گی،
جو طرز ہے تمہاری، مجھ سے ادا نہ ہوگی
اس طرح کی میں کوشش سو بار کر چکا ہوں،
یہ تم بھی جانتے ہو، یہ میں بھی جانتا ہوں

پھر کس لئے ہیں ہم کو ایثار کے یہ دعوے۔
سچ پوچھئے تو ہیں سب بے کار کے یہ دعوے
تم اپنی سوچتے ہو ، میں اپنی سوچتا ہوں،
یہ تم بھی جانتے ہو، یہ میں بھی جانتا ہوں

کچھ میں بھی کم نہیں ہوں، کچھ تم بھی کم نہیں ہو،
پھر کس لئے ہے شکوہ اک دوسرے سے ہم کو
تم بھی عجیب سے ہو، میں بھی عجیب سا ہوں،
یہ تم بھی جانتے ہو، یہ میں بھی جانتا ہوں

ہم ایک ساتھ رہ کر اک ساتھ کیوں نہیں ہیں۔
دونوں کے ایک جیسے حالات کیوں نہیں ہیں
تم کب یہ سوچتے ہو، میں کب یہ سوچتا ہوں۔
یہ تم بھی جانتے ہو، یہ میں بھی جانتا ہوں

اے شہر کے عزیزو، اے بزم کے رفیقو !
ایسا نہیں ہوں جیسا تم مجھ کو جانتے ہو
تم کیا سمجھ رہے ہو، میں کیا سمجھ رہا ہوں،
یہ تم بھی جانتے ہو، یہ میں بھی جانتا ہوں

میں اور کیا کہوں گا ، تم اور کیا سنو گے،
جو میں سنا چکا ہوں ، تم بھی وہی کہو گے
تم کیا سنا چکے ہو، میں کیا سنا چکا ہوں،
یہ تم بھی جانتے ہو، یہ میں بھی جانتا ہوں

اچھا ہے کچھ نہ سوچیں، اچھا ہے کچھ نہ بولیں،
جو کہنا چاہتے ہیں ساری کی ساری باتیں
تم بھی سمجھ رہے ہو، میں بھی سمجھ رہا ہوں،
یہ تم بھی جانتے ہو، یہ میں بھی جانتا ہوں

یہ شاعری بھی کیا ہے ، اس میں نہ کچھ مزا ہے،
بولو خیالؔ آخر کیا تم کو ہو گیا ہے
ہر بات میں یہ کہنا، میں کون ہوں،
میں کیا ہوں، یہ تم بھی جانتے ہو، یہ میں بھی جانتا ہوں

بی۔ایس۔جین جوہر

(میرٹھ،بھارت)

اے روپ کی رانی روپ ترا میں اک پل دو پل دیکھ تو لوں
لہراتی ہوئیں رُخ پر زلفیں ، اڑتا ہوا آنچل دیکھ تو لوں

مانا کہ مجھے پرہیز رہا ہے نغمہ ورقص کی محفل سے
صندلیں پاؤں میں لگتی ہے کیسی تری پائل دیکھ تو لوں

کہتے ہیں کہ حسن کو چھونے سے تن من میلا ہو جاتا ہے
دیکھے سے ترا کیا جاتا ہے، اے حُور شمائل دیکھ تو لوں

اس سے پہلے کہ نقاہت سے آنکھوں میں اندھیرا چھا جائے
ماتھے پر سہاگن کے بندی اور آنکھ میں کاجل دیکھ تو لوں

آنچل پھیلائے مانگ رہی ہیں کب سے دعائیں، بلائیں
کیسے جاتا ہے بستی سے بن برسے بادل دیکھ تو لوں

دیکھا تھا لڑکپن میں جس کو، ہے آج جواں سال اور حسیں
سینے کا فراز ومدوجزر ، جذبات کی ہل چل دیکھ تو لوں

اپنے سکھ دکھ میں مست ہیں اپنی ہی پھٹی سب سیتے ہیں
جو کھُل کے پرائی پیر ہرے، ایسا کوئی پاگل دیکھ تو لوں

تجھ کو ہے بہت ہی ناز اپنے انداز واداۓ دل کش پر
کیسے ہوگا بھولا بھالا ترے روپ سے گھائل دیکھ تو لوں

○

آصف ثاقب

(بوئی ہزارہ)

نہیں کہ آنکھ میں موجِ غمیں زیادہ ہے
یہ میرا دل ہے جو اندوہ گیں زیادہ ہے

اسے منانے کی ہمت کہاں ہے لفظوں میں
ہمارا یار خفا کم نہیں ، زیادہ ہے

کمی کا ایسا تعلق رہا ہے بیشی سے
ہوا ہے درد جہاں کم وہیں زیادہ ہے

وہ کون ہے جو گلابوں میں سب سے ہے بڑھ کر
وہ کون ہے جو چمن میں حسیں زیادہ ہے

جو تم نے زخم دیا ہے غمِ جدائی کا
وہ دل فِگار سہی، دل نشیں زیادہ ہے

اسی سے رنگ نمایاں ہے اشک وشبنم کا
نگارِ بزم یہ قلبِ حزیں زیادہ ہے

تمہارے حسن کا ڈنکا بجا ہے چاروں طرف
ہماری عشق میں شہرت کہیں زیادہ ہے

وطن سے دور کہاں جائیں ٹھوکریں کھانے
ہمارا رزق تو ثاقب یہیں زیادہ ہے

○

ڈاکٹر شباب للت

(شملۂ بھارت)

ملی نہ ہم کو اِسی لئے اہمیت دنیا میں
نیکی کر کے ڈال دیا کرتے ہیں دریا میں

بھرے پُرے گلشن کو تم نے صحرا بنا دیا
رنگ برنگے پھول کھلائے ہم نے صحرا میں

راشن ڈپو پہ ابّا جی کی جیب ہوئی خالی
من اٹکا تھا بچّے کا شوکیس کی گُڑیا میں

وہ بھی دن تھے کبھی کہ ہم ہر روز نہاتے تھے
تیری مسکانوں کی شیتل رِم جھم برکھا میں

یورپ دیش گیا پردیسی لوٹا نہیں ابھی
یوں لگتا ہے آنچ بھری ہے جیسے پُروا میں

میں ساگر سے ملن کی پیاسی چت چنچل ندیا
آہ بٹ گئی قطرہ قطرہ پتھ کی صحرا میں

عقل کنارے کھڑی سوچتی تھی انجام ابھی
عشق چل دیا کچے گھڑے پہ تیرنے دریا میں

روپ چاندنی سا اور آنکھیں ساگر سی گمبھیر
خوشبو کستوری سی پائی ترے سراپا میں

تیرتھ پر برتاؤ دھرم کے ٹھیکیداروں کا
دیکھ دیکھ کر پڑ گئے چھالے مری آستھا میں

بہت ڈھنڈورا پیٹا جس نے اپنی دیانت کا
ہاتھ اُسے بھی دھوتے دیکھا بہتی گنگا میں

آ گیا کاری پر جا بغاوت پر تُل جاتی کیوں
راج نیتی کی سُوجھ بوجھ گر ہوتی راجا میں

دُکھ سہہ کر بھی سدا رکھی رشتوں کی لاج شبابؔ
فرق نہ آنے دیا بزرگوں کی مریادا میں

○

حسن عسکری کاظمی

(لاہور)

داغِ فراق ، ذوق شناسائی دے گیا
طرفہ مزاج مجھ کو بھی رسوائی دے گیا

اتنی خبر ہے خامۂ مژگاں ہوا تھا نم
اس کا خیال شعر کو رعنائی دے گیا

درویش باصفا کہ وہ آیا تھا خواب میں
مجھ کم سخن کو لفظ کی سچائی دے گیا

کچھ بھی کہا نہ اس نے بصیرت کے باب میں
دیکھا مجھے پلٹ کے تو بینائی دے گیا

فکرِ سخن کا یہ بھی اعجاز سر بسر
حرفِ ہنر کو اور بھی گہرائی دے گیا

جینے بھی اب نہ دے گا جدائی کا غم مجھے
تنہا وہ خود ہوا مجھے تنہائی دے گیا

آغازِ عشق میں ہوئیں نادانیاں حسنؔ
طرزِ تپاکِ حُسن بھی دانائی دے گیا

○

مہندر پرتاپ چاند
(انبالہ بھارت)

ہمارے شہرِ اَدب میں چلی ہوا کیا ہے!
یہ کیسا دَور ہے یارَب! ہمیں ہُوا کیا ہے؟

اُسی نے آگ لگائی ہے ساری بستی میں
وہی یہ پُوچھ رہا ہے کہ ماجرا کیا ہے؟

یہ تیرا ظرف کہ تُو پھر بھی بدگماں نہ ہوا
سوائے درد کے مَیں نے تجھے دِیا کیا ہے!

عَجیب شخص ہے۔ کِردار مانگتا ہے مِرا!
سِوائے اس کے میرے پاس اب بچا کیا ہے؟

لپک کے چھین لے حق اپنا کم سوادوں سے
بڑھا کے ہاتھ اُٹھا جام، دیکھتا کیا ہے؟

بھُلا دیا ہے جو تُم نے تو کوئی بات نہیں
میں اِتنا جانتا ! آخر مِری خطا کیا ہے؟

کُرید کر مِرے زخموں کو یُوں سوال نہ کر
مجھے خبر ہے تو پھر مجھ سے پُوچھتا کیا ہے!

متاعِ درد کو دل میں چھپا کے رکھ ناداں!
تو اِس خزانے کو اَوروں میں بانٹتا کیا ہے!

ہزار نعمتیں اُس نے تجھے عطا کی ہیں
اَب اور چاند! تو اُس دَر سے مانگتا کیا ہے!

○

قیصر نجفی
(کراچی)

جینا ہے یا مرنا ہے
سوچ لو تم کیا کرنا ہے

اور کسی سے ڈرو نہ ڈرو
خود سے مگر تمہیں ڈرنا ہے

کیا پھر روٹھنا جب ہم کو
ساتھ ہی جینا مرنا ہے

وہ نہیں ڈرتے پانی سے
جن کو پار اترنا ہے

خود کو سپرد خدا کردو
کچھ نہیں پھر تمہیں کرنا ہے

دل ہی نہیں کسی پہلو میں
اور مجھے گھر کرنا ہے

مرنا تو ہے لیکن قیصؔر
موت کو مار کے مرنا ہے

○

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

(بہار، بھارت)

بلندی آسماں کی زیرپا ہے
مگر پستی سے رشتہ کیوں مرا ہے

سمائے کس طرح سے عکس پورا
قد اس کا آئینے سے بھی بڑا ہے

کچھ اس انداز ہی سے تھا مخاطب
کہ وہ انساں نہیں جیسے خدا ہے

اسے کمزوری اس کی مت سمجھ تو
اگر تجھ سے کوئی جھک کر ملا ہے

اسی سے مات بھی کچھ کھائی میں نے
وہ دشمن دوست جو میرا رہاہے

کوئی پھر آج بھی سچ بول بیٹھا
کہ مجرم آج پھر سولی چڑھا ہے

ترا جوش جنوں ہے کیا مناظر
کہ اہل ہوش میں محشر بپا ہے

○

سجاد مرزا

(گوجرنوالہ)

صیغۂ راز میں حالات کہاں تک رکھوں
لوگ کہتے ہیں صدا بند زباں تک رکھوں

مسندِ شاہ سے یہ حکم ملا ہے مجھ کو
اپنی محدود نظر کارِزیاں تک رکھوں

کیا عجب ضد ہے تیری اور نرالی منطق
ہر یقیں اپنا ترے وہم وگماں تک رکھوں

ایسا لگتا ہے کہ میں وادیٔ کشمیر میں ہوں!
اپنے ہونٹوں ہی میں محدود اذاں تک رکھوں

وہ تو کہتے ہیں کوئی بھید نہ کھلنے پائے
اپنی فریاد فقط عجزِ بیاں تک رکھوں

رنگ پھیلیں گے تو احساس میں تلپٹ ہوگی
منظرِ زیست کو اک عکسِ نہاں تک رکھوں

میرے افکار کی دولت کو ہے لٹنا اک دن
اس کو محفوظ میں سجّاد کہاں تک رکھوں

○

''یاد کرتا ہے زمانہ''

نند کشور وکرم
(راولپنڈی)

''مَیں قلم کو ہمیشہ ضمیر کی آواز پر اُٹھاتا ہوں۔ لہٰذا کسی لفظ پر اس لحاظ سے ندامت نہیں ہوتی کہ اس میں کوئی مخفی اشارہ ہے۔ کسی ماں نے آج تک وہ بچہ ہی نہیں جنا جو میرے قلم وزبان کو خرید سکے۔ میرے نزدیک قلم فروشی عصمت فروشی سے کم نہیں بلکہ اس سے بھی قبیح ومکروہ ہے۔ قدرت نے قلم اس لئے نہیں دیا کہ بیچا جائے۔ اس سے بہتر ہے کہ ہاتھ شل ہو جائیں۔ زبان اس لئے نہیں بخشی کہ مرہونِ غیر ہو، ایسی زبان پر فالج گر جائے تو خدا کا احسان ہے۔''

مذکورہ بالا الفاظ برِصغیر کے بیباک صحافی وشاعر، شعلہ بیاں خطیب، تحریکِ آزادی کے مجاہد اور ہفت روزہ ''چٹان'' کے مدیر شورش کاشمیری کے ہیں جو انہوں نے جنرل ایوب خان کے دورِ حکومت میں اسیری کے بعد رہا ہونے پر اپنے ہفت روزہ ''چٹان'' کے اداریے میں تحریر کئے تھے۔

شورش کاشمیری کا اصلی نام آغا عبدالکریم تھا لیکن اُن کا قلمی نام شورش کاشمیری اتنا مشہور ہوا کہ لوگ اُن کا اصلی نام ہی بھول گئے۔ اور وہ آسمانِ سیاست وادب پر لگ بھگ نصف صدی تک شہابِ ثاقب کی طرح اپنی روشنی پھیلا کر آخر اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

شورش کی پیدائش ۴/اگست ۱۹۱۷ء کو بمقام امرتسر ہوئی تھی جہاں تقسیم سے پیشتر کاشمیریوں کی ایک بہت بڑی آبادی مقیم تھی۔ آغا حشر کاشمیری اور سعادت حسن منٹو کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔ لیکن شورش کی زندگی کا بیشتر حصہ لاہور ہی میں گزرا اور یہیں سے انہوں نے اپنی سیاسی اور ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ برطانوی عہدِ حکومت میں انہوں نے تحریک آزادی میں حصہ لینا شروع کیا۔ اور پنجاب میں جگہ جگہ جا کر انہوں نے عطاءاللہ شاہ بخاری کی طرح عوام کو انگریزی سامراج کے خلاف آواز بلند کرنے کے لئے تحریک وترغیب دی۔

قیام پاکستان کے چند مہینے بعد یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو انہوں نے پاکستان کا تاریخ ساز ہفت روزہ ''چٹان'' لاہور سے جاری کیا جو بہت جلد پاکستان کے عام وخاص طبقے میں اتنا مقبول ہو گیا کہ شورش سے اختلاف رکھنے والے بھی اسے بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے تھے۔ یہ پاکستان کا واحد ہفت روزہ تھا جس کا نصب العین یہ تھا کہ جس بات کو سچ سمجھو اسے بلا جھجک کہہ ڈالو۔ اور اس نصب العین کے حصول کے لئے انہوں بے شمار صعوبتیں برداشت کیں اور اپنی بات کہنے سے کبھی نہیں ہچکچائے۔ بقول شورش ''چٹان ایک آزاد خیال ہفتہ وار ہے جس کا دل لوگوں کی اجتماعی دھڑکنوں کے ساتھ دھڑکتا ہے۔ اس کا ہمیشہ ہی یہ شعار رہا ہے کہ سیاسی مجاوروں ادبی نٹ کھٹوں، شرعی جیب تراشوں، مجلسی مجاوروں کا پردہ چاک کیا جائے۔ قیمت اس کی خواہ کچھ ہی ادا کرنی پڑے۔ جب تک ان لوگوں کا وجود باقی ہے اور چٹان بفضل تعالیٰ زندہ ہے، سیاسی عجائب گھروں کی مورتیوں، ادبی بتکدوں کے کھلونوں اور منبر ومحراب کے آوارہ مصرعوں اور مجلسی روز بازار کے مہنتوں کی بازپرس جاری رہے گی۔'' اور بلاشبہ شورش نے زندگی بھر اپنے اس عہد کو نبھایا اور ہزار دقتوں اور پریشانیوں کے باوجود انہوں نے چٹان کو جاری وساری رکھا اور کوئی بھی شخص ان کے قلم کو اُونچی سے اُونچی قیمت پر بھی نہ خرید سکا۔

شورش کاشمیری کی تحریر وتقریر میں پائی جانے والی شدت اور انتہا پسندی زبان زد خاص وعام تھی۔ اُن کی خطابت سے لوگ اتنے متاثر تھے کہ کسی بھی شہر میں یہ اعلان ہونے پر کہ آج شورش کاشمیری عوام کو خطاب کریں گے لوگ ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو جاتے تھے۔ انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریریں اور تقریریں پڑھیں اور اُن کے اثرات کو اپنے اندر سمو لیا اور اُن کی پیروی وتقلید کرنے لگے۔ انہیں مولانا آزاد سے اتنی عقیدت تھی کے وہ اُن کے ممدوح ہی نہیں بلکہ اُن کے ''آئیڈیل'' بھی تھے۔ اور یہ شرف بھی اُنہیں ہی حاصل ہے کہ جب پاکستان میں مولانا آزاد کا نام لینے کی بھی لوگ جرات نہیں کر پاتے تھے انہوں نے لاہور سے ''چٹان'' کا خصوصی شمارہ شائع کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ انہوں نے اپنے قلم وزبان کے سیاسی سفر میں جو کچھ بھی حاصل کیا ہے وہ 'ابوالکلام آزاد اور اُن کی تصنیف ''ترجمان القرآن'' کی دین ہے۔

مولانا آزاد سے انتہائی متاثر شورش بھی اُن کی طرح تقریر وتحریر کی ایک غیر معمولی طاقت وصلاحیت رکھتے تھے اور وہ نوجوانی ہی میں میدان سیاست میں کود پڑے تھے اور مسلم قوم پرستوں کی سیاسی جماعت احرار سے منسلک ہو کر انہوں نے اپنی تقاریر سے پنجاب کے گوشے گوشے میں اپنی جادو بیانی کے جوہر دکھائے اور عوام کو انگریز سامراج کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی ترغیب دی۔۔ قیام پاکستان کے بعد نئے ملک میں بساطِ سیاست ہی بدل گئی اور وہ جنرل ایوب خان کے فوجی راج میں پاکستان میں ہونے والی زیادتیوں کے خلاف آواز اُٹھانے والوں میں پیش پیش رہے۔

جنرل ایوب خان کے برسرِ اقتدار آتے ہی پاکستانی عوام کے جمہوریت کے خواب چکنا چور ہو گئے۔ ملک میں فوجی راج قائم ہو جانے سے عوام کی آواز بالکل دب کر رہ گئی۔ اُس دور میں ۲۲/جنوری ۱۹۶۸ء کے شمارے میں شورش نے ایوب کے چغہ برداروں اور خوشامدیوں کے بارے میں اپنے اداریے میں لکھا تھا کہ ''اپوزیشن کی بدولت سرکار کے سیاسی لنگر میں ان لوگوں کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے ورنہ ان کا وجود ہی خطرناک ہے یہ لوگ سرکار کے دروازہ پر مچھندروں کی طرح صدا دیتے اور اپوزیشن کے فرضی خطرے پر سانڈوں کی طرح پلتے ہیں''۔

اور یہ حقیقت بھی تھی کہ جنرل ایوب کے عہد حکومت میں اس قسم کے لوگ اُن کے اردگرد جمع ہو گئے تھے جن کا پاکستان کی تحریک کے دنوں میں کوئی خاص رول نہیں تھا، جن کا کوئی قومی کردار نہیں تھا اور نہ ہی کوئی سیاسی بیک گراؤنڈ وہ تو صرف چڑھتے سورج کے پجاری تھے۔ وہ لوگ خوشامد کی اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ خوشامد بھی اُن سے شرماتی تھی۔ بنیادی جمہوریت کا نظام اکثر و بیشتر ایسے خودغرض افراد کے ہاتھوں میں تھا جو اپنے معمولی سے فائدے کے لئے ہر قومی مفاد کا سودا کر سکتے تھے۔ کلام اللہ کی جھوٹی قسمیں کھانا اُن کا شعار ہو گیا تھا۔ ان کی ایسی کرتوتوں کو دیکھتے ہوئے اس دور میں شورش نے اپنے ایک اداریے میں لکھا تھا۔ ''''قرآن سستا اور مرغ مہنگا ہو گیا ہے'' ان ہی خوشامدی اور چاپلوس حواریوں کی وجہ ہی سے ایوب نے اپنے آپ کو ایک ایسی قوت سمجھ لیا جو اپنی فراست کے بجائے اپنی ذات پر بھروسہ کرتی تھی۔

صدر ایوب بھی شورش کی تقریر و تحریر سے بے حد خائف تھے اور انہوں نے انہیں اپنے خیمے میں شامل کرنے کے لئے کئی لالچ دئے اور دھمکیاں بھی لیکن اُن پر اس کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ حتیٰ کہ انہیں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ مگر پھر بھی وہ نہ ٹوٹے یہاں تک کہ اپنی رہائی کے بعد بھی اپنے اداریے میں انہوں نے لکھا۔ ''مَیں نے جو کچھ لکھا وہی لکھا جو خود محسوس کیا۔ مَیں زبان و بیان میں ٹھوکر کھا سکتا ہوں لیکن ضمیر مطمئن رہتا ہے کہ آواز اُس کی اپنی ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو قلم کا کاروبار کرتے ہیں مَیں انہیں ''شرالدّواب عنداللہ'' سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک وہ تمام ادیب، شاعر، صحافی، واعظ، مقرر اور خطیب بالاخانوں کی مخلوق ہیں جنہوں نے جوہرِ قلم اور جوہرِ زبان کو بازار کی جنس بنا دیا ہے۔'' بعد ازاں شورش اور ایوب راج کے مخالفین نے ذوالفقار علی بھٹو کا ساتھ دیا اور یوم حمید نظامی پر بھٹو کو پلیٹ فارم مہیا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ لاہور میں منعقد اس جلسے میں لوگوں کی بے پناہ بھیڑ حکومت کی پریشانی کا باعث بنی لیکن حکومت کے خوف سے اخباروں نے اسے کورج (Coverage) دینے سے اجتناب کیا لیکن ''چٹان'' کے آرٹ پیپر کے سرورق پر بھٹو کے استقبال کو اس طرح پیش کیا گیا کہ مذکورہ شمارے کی متعدد کاپیاں خرید کر بھٹو نے بعض امریکی وقائع نگاروں کی نذر کیں۔ حتیٰ کہ اس کی کاپیاں کئی غیر ممالک میں بھی بھیجی گئیں۔

افسوس کہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کو صرف ۵۸ سال کی عمر میں ہی یہ نڈر اور بیباک خطیب اور ہر قیمت پر صحافت کی عزت و آبرو قائم رکھنے والا صحافی، جس کے قلم کو نہ تو حکومت کا جبر خرید سکا اور نہ ہی دولت، ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا اور آج بھی میانی صاحب لاہور میں وہ ہزاروں من مٹی کے نیچے سویا ہوا ہے جس کے بارے میں شاعر نے کہا تھا کہ:

یاد کرتا ہے زمانہ ان ہی انسانوں کو
روک دیتے ہیں جو بڑھتے ہوئے طوفانوں کو

☆

۔ خواب سمندر ۔

عزیز کا پہلا مجموعہ کلام شائع ہو رہا ہے، نام ہے ''خواب سمندر''۔ مجھے بالکل تعجب نہیں ہوا کیونکہ یہ نام بعینہٖ ان خوابوں، خواہشوں اور خیالات و عزائم کا عکاس ہے جو قطار باندھے اس کے ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ حیرت ہوئی تو بس اتنی کہ خود مجھے دنیا کے بازار میں اپنی اہمیت منوانے کی نصیحت کرنے والے عزیز نے خود اپنے کلام سے دنیا کو متعارف کرانے میں اتنی دیر کیوں کر دی۔ وہ ہوشیار ہے مگر سوداگروں جتنا نہیں۔ میں نے بہت چاہا، اس سے حسد کروں، کر نہ سکا۔ کر پایا تو بس اتنا کہ اس کی ہر کامیابی پر بغلیں بجائیں اور تمت بالخیر کہا۔

وقت کے جبر سے مجبور ہوئے جاتے ہیں
خواب آنکھوں سے بہت دور ہوئے جاتے ہیں

ہم نے جن لفظوں کو اشعار کی خلعت بخشی
کیا قیامت ہے کہ مغرور ہوئے جاتے ہیں

اور پھر مملکتِ عشق نے یہ بھی دیکھا
درد کے سلسلے دستور ہوئے جاتے ہیں

کھینچ کر پھر ہمیں لے آئے گی اپنوں کی کشش
یہ الگ بات ابھی دور ہوئے جاتے ہیں

ہائے وہ لوگ جو پندار کے مارے ہوئے لوگ
اپنی ہی ذات میں محصور ہوئے جاتے ہیں

○

عزیز نبیل
(دوحہ، قطر)

''پتھریلی زمیں''

پروازانبالوی

(انبالہ بھارت)

پتھریلی ہے زمیں تو ہوا میں اُڑا کرو
مہنگی ہیں گر کتابیں تو چہرے پڑھا کرو

مَیں مبتلائے ہوش ہُوں مدّت گزر گئی
میرے لئے جنوں کی بھی کوئی دُعا کرو

خاموشیاں سُناتی ہیں لاکھوں سُریلے راگ
جو ہو سکے تو شب میں اکیلے سُنا کرو

چیخیں سی اُٹھ رہی ہیں کہیں مرگھٹوں کے پاس
شاید میں مرچکا ہوں مرا کُچھ پتا کرو

پاگل ہَوا ہے اُس کا ٹھکانہ نہیں کوئی
یوں ہی نہ شوقِ دید میں راتوں پھرا کرو

بن جاؤں رفتہ رفتہ کبھی مَیں بھی ہوش مند
دیوانو میرے حق میں کچھ ایسی دُعا کرو

جس کے کواڑ کھُلتے ہیں اپنی ہی ذات میں
پرواز اُس مکاں پہ بھی دستک دِیا کرو

خورشیدانورزرضوی

(اسلام آباد)

جب بھی کوئی کہانی لکھی
اُس کی شوخ جوانی لکھی

اُس کا نام نہ آیا لب پر
اُس کی کوئی نشانی لکھی

اُس کا ساز و ساماں لکھا
اپنی بے سامانی لکھی

مردوں کی خودغرضی مانی
عورت کی قربانی لکھی

باعث اپنی ناکامی کا
اپنی تن آسانی لکھی

عارف شفیق

(کراچی)

لہو میں ڈوبا ہر اک منظر روتا ہے
جلتا ہے جب شہر سمندر روتا ہے

عبد اللہ شہہ غازی تیری نگری میں
ایسا قتلِ عام ہے خنجر روتا ہے

ایک ہی گھر سے کتنے جنازے اٹھتے ہیں
شہر ہمارا سارا مل کر روتا ہے

سندھی بلوچ پٹھان مہاجر پنجابی
جس کو دیکھو اندر اندر روتا ہے

سارے پرندے ہجرت کرنے لگتے ہیں
میری چھت پر ایک کبوتر روتا ہے

کس گولی پر کس کا نام لکھا ہوگا
سب کے دلوں میں انجانا ڈر روتا ہے

آیا ہے لاہور سے اک مہمان مرا
وہ بھی یہاں کی خبریں سن کر روتا ہے

اس دھرتی پر نفرت بونے والے دیکھ
سیہون کا شہباز قلندر روتا ہے

شہر کراچی کی حالت پر راتوں کو
اکثر عارف سب سے چھپ کر روتا ہے

○

پروفیسر زہیر کنجاہی

(راولپنڈی)

کبھی کر قبول مِرا سلام — مِری عاشقی کو ملے دوام
تجھے واسطہ ہے رسولؐ کا — وہاں لے کے جا مِرا تو سلام
ہمی پھر ہیں جو وطن سے دُور — کبھی تو بتا یہ ہے کیوں مدام
ہوں میں گھر سے اپنے بہت ہی دُور — یہاں پنڈی میں ہے مِرا قیام
ملے ہر خوشی سرِ ہر مقام — نہ وطن میں ہو کبھی غم کی شام
ہو کے مَیں مدینہ سے آ گیا — وہاں کعبہ تھا ارے دو ہی گام
جو بھی نیک ہو مِرے دیس میں — دل و جاں سے اُس کو کروں سلام
میں زہیر چل کے کُنجاہ کو — کروں اَب تو گھر میں سدا قیام

''مری عاشقی کو ملے دوام'' مصرع پروفیسر آصف ثاقب''

ندیم ہاشمی

(کراچی)

رات اشکوں میں ڈھل گئی کیسے — درد کی لَے مچل گئی کیسے
اے قرارِ نظر بتا تو سہی — پھر طبیعت سنبھل گئی کیسے
جو ہوائے سُخن مَیسر تھی — راز داروں کے گھر گئی کیسے
کیسے بتلائیں دل پریشاں ہے — یاد دل سے اُتر گئی کیسے
سوچتا ہوں ہوائے رسوائی — مجھ پہ الزام دھر گئی کیسے
ہجر کی ساعت نہیں آئی — غم کی صورت نِکھر گئی کیسے
وہ جو تھی اِک صدا ندیمؔ کوئی — جانے اُس کے گھر گئی کیسے

سیفی سرونجی

(سرونج، بھارت)

کسی سے جب بھی انتقام لینا — ذرا مروّت سے کام لینا
یونہی نہ پھرنا جہاں میں تنہا — کسی کا دامن بھی تھام لینا
جہاں چلے ذکر روشنی کا — تو پھر اندھیروں کا نام لینا
نشہ محبت کا چھائے دل پر — شراب پینا نہ جام لینا
خلوص دل کا نہ ہو اجاگر — میاں اشاروں سے کام لینا

○

ابراہیم اشکؔ

(ممبئی، بھارت)

جسے ادا نہ کیا، وہ بیاں سے آگے ہے
مری خموشی کا عالم زباں سے آگے ہے

تم اپنے گزرے زمانوں کی بات کرتے ہو
مری کہانی تو اس داستاں سے آگے ہے

نئے چراغ جلانے لگی ہے فکر مری
خیال میرا اچھوتا، جہاں سے آگے ہے

میں اپنی دھن میں اکیلا حدوں سے گزرا ہوں
غبارِ راہ مرا، کارواں سے آگے ہے

چلا ہوں اُڑتا ہوا میں بدوشِ موجِ ہوا
ٹھکانہ میرا زمان و مکاں سے آگے ہے

چلا تو سارے ہی ہم عصر رہ گئے پیچھے
مرا سفر مری عمرِ رواں سے آگے ہے

جہاں ترقی پسند و جدید ٹھہر گئے
کہ اشکؔ ''آ گہی'' اپنی وہاں سے آگے ہے

نوید سروش

(میرپور خاص، سندھ)

اپنے دیہات سے نکلے تھے جو جذبات کے ساتھ
خواب ادھورے ہی رہے شہر کے حالات کے ساتھ

اب تو وہ ختم ہوئے جاتی ہے دھیرے دھیرے
نسل جو آئی تھی محفوظ فسادات کے ساتھ

خشک کیوں ہو گئیں دریا تیری آنکھیں آخر
تجھ پہ بادل نہیں گزرا کوئی برسات کے ساتھ

ڈھیر پر بیٹھے ہوئے لوگ نہ یہ جان سکے
ہو گئے دفن مکیں اپنے مکانات کے ساتھ

اہلِ دانش میں ایک ایسا بھی قبیلہ ہے سروشؔ
بیچ دیتا ہے زبانیں بھی خیالات کے ساتھ

حفیظ انجمؔ کریم نگری

(کریم نگر، بھارت)

ساتھ میں دلبر نئے سے
حُسن کے پیکر نئے سے

ہاتھ میں پتھر نئے سے
سامنے ہیں سر نئے سے

کیا رجھائیں گے مجھے اب
آپکے تیور نئے سے

میرے ہاتھوں میں تھما دو
ہیں کہاں محضر نئے سے

آپ باہر دیکھتے ہیں
ہم تو اندر ہیں نئے سے

ایک سی وحشت کہاں ہے
روز طاری ڈر نئے سے

آپ روان کنس ہوں گے
یا تو پھر ہٹلر نئے سے

ہیں وہی نیزے پُرانے
اور اُنپر سر نئے سے

مت اُڑو اونچی اڑانیں
آپ کے ہیں پر نئے سے

ہجر کا موسم وہی ہے
وصل کے دفتر نئے سے

آپ کے اشعار انجمؔ !!
عشق کے منتر نئے سے

ارشد محمود ناشاد

(اسلام آباد)

ازل سے تیری طلب نے سفر میں رکھّا ہوا
وگرنہ کیا ہے یہاں رہ گزر میں رکھّا ہُوا

جہاں ملے تھے زمانے وصال و ہجراں کے
ابھی تلک ہے وہ منظر، نظر میں رکھّا ہُوا

جسے زوال نہیں ہے بیاضِ امکاں میں
وہ لفظ ہے مرے دستِ ہُنر میں رکھّا ہُوا

کہیں قیام نہیں ہے جہانِ حیرت میں
عجب سفر ہے مرے بال و پر میں رکھّا ہُوا

دیارِ ہجر میں کُچھ بھی نہیں ہے پاس اپنے
مگر وہ عکس کہ ہے چشمِ تر میں رکھّا ہُوا

کرشن گوتم

(چندی گڑھ، بھارت)

آئی مجھے آواز کہیں زیرِ زمیں سے
ٹوٹے گا تعلق نہ کبھی دُنیا و دیں سے

کچھ زہرہ جبیں سے نہ کسی ماہ جبیں سے
اپنا تو تعلق ہے کسی بالا نشیں سے

سب دل ہی سے پاؤ گے نہیں اور کہیں سے
ہر نخلِ تمنّا ہے اُٹھا دل کی زمیں سے

دل ہی تو ہے گہوارہ یہاں شادی و غم کا
کچھ بھی ہو جہاں بھر کا، ملے گا وہ یہیں سے

بچوں کی پرورش میں کمی کوئی نہ رکھنا
خوشبو بھرا گلاب شگفتہ ہے زمیں سے

حسرت رہی جنکو کہ ملے اور زیادہ
روتے ہوئے خالی وہ گئے دنیا و دیں سے

گوتم زیاں ہے منفی نظر سے، مگر نہیں
خارِج کیا ہر شے کو تو پایا وہ ''نہیں'' سے

نعیم الدین نظر

(میر پور خاص، سندھ)

تنکے تنکے میں بلا کا غرور
کون توڑے گا اس ہوا کا غرور

ساز بجنے لگے ہیں مقتل میں
سر اُٹھاتا ہے پھر قضا کا غرور

کتنے لوگوں کو کر گیا گُم صُم
ریگ صحرا پہ نقشِ پا کا غرور

تم کو مال و متاع سے الفت ہے
ہم کو ہے حرمتِ قبا کا غرور

کتنے پیڑوں کی زرد شاخوں کو
غم زدہ کر گیا صبا کا غرور

چاند پر رکھ دیا قدم کسی نے
پارہ پارہ ہوا خلا کا غرور

وار خالی گیا تو خلوت میں
ہاتھ ملتا ہے ناخدا کا غرور

کون اس سمت جائے گا واعظ
بے اثر ہے جہاں دعا کا غرور

دف بجائیں گے برگ و بار نظر
رنگ لائے گا جب حنا کا غرور

پروفیسر ڈاکٹر سید رضی محمد

(میرپورخاص، سندھ)

روشنی چاہیے، کس مول ملے گی صاحب؟ — نقدِ جاں ہے مرے پلو میں، چلے گی صاحب؟
اے طلب گار وفا، یہ ہے اصول بازار — جنس کم ہوگی، تو قیمت تو چڑھے گی صاحب
زندگی بھر کی مشقت کا صلہ، ایک سوال — اب یہ گاڑی کبھی پٹڑی پہ چڑھے گی صاحب؟
دل کے تالاب کے ٹھہرے ہوئے سناٹوں میں — سنگ پھینکو گے تو ہلچل تو مچے گی صاحب
زندگی کیا، کسی مزدور کی بیگار ہوئی — اور اسی طرح سے باقی بھی کٹے گی صاحب
اب فسانے کا یہ انجام نہیں بدلے گا — اب یہی فلم ہر اک بار چلے گی صاحب
تم چلے جاؤ گے تو بھی یہی منظر ہونگے — بس یہ دنیا مری دنیا نہ رہے گی صاحب
مسترد دل کی تلافی نہیں ہوتی کچھ بھی — بن بھی جائے گی تو نہ اب بات بنے گی صاحب
میری خدمت، مری عزت کے مقابل رکھو — پورا تولو گے، تبھی بات بنے گی صاحب
سانپ تو آئیں گے اس گھونسلے کی سمت مگر — چڑیا مر کر بھی نہ انڈوں سے ہٹے گی صاحب
یہ تو معلوم ہے ڈھل جائے گی یہ رات رضؔی — کتنی قربانی مگر لے کے ڈھلے گی صاحب

مراق مرزا

(ممبئی، بھارت)

میں آسماں ہوں وہ مجھکو جلا نہیں سکتا — مرے وجود کو سورج مٹا نہیں سکتا
اسے جہاں میں ستارے کبھی نہیں ملتے — جو جگنوؤں سے گھر اپنا سجا نہیں سکتا
یہ معجزہ ہے کہ دنیا میں ایک بھی سچ کو — ہزار جھوٹ کا لشکر دبا نہیں سکتا
مری نگاہ میں وہ شخص آدمی ہی نہیں — گرے ہوؤں کو جو جھک کر اٹھا نہیں سکتا
یہ ابتدائے جہاں سے نظامِ قدرت ہے — درخت نیم کا انبہ اُگا نہیں سکتا
وہ ہے عقاب، بلندی ہی اس کی منزل ہے — زمانہ اس کو فلک سے گرا نہیں سکتا
اڑان کتنی ہی اونچی ہو آدمی کی مراقؔ — وہ آسماں پہ گھر اپنا بنا نہیں سکتا

زاہدہ عابد حناؔ

(لاہور)

بصارت بک گئی ہے اور سماعت رہن رکھی ہے — ہمارے دور میں اب ہر جسارت رہن رکھی ہے
وصال و ہجر شرمندہ ، ہوا ہر زخم کا سودا — پڑا ہے دل پہ بھی تالا، محبت رہن رکھی ہے
قبا تو مے کدے میں ہے مگر دستار مسجد میں — وہ مجبوری کہ بے چاری نجابت رہن رکھی ہے
گلی کوچوں میں بازاروں میں سر نیلام ہوتے ہیں — ردائیں بکتی جاتی ہیں کہ غیرت رہن رکھی ہے
وحوش بن کر برآئی سگاں کو بھی پذیرائی — خدایا! تیرے انساں نے نیابت رہن رکھی ہے
شعور و آگہی و علم و دانش کی ضرورت ہے — چھڑانے کون جائے گا جو دولت رہن رکھی ہے
حناؔ اب سنگ کھاؤ یا کہ زخمِ دل، دہائی ہے! — چھڑاؤ جان دے کر بھی شہادت رہن رکھی ہے

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا' امریکہ)

قسط.....۸

نئی ابتدا

میں نے ۱۹۵۶ میں چھٹی کا امتحان دیا جس کے بعد میں گرمیوں کی چھٹیاں گذارنے کراچی چلا گیا۔امتحان میں اردو، انگریزی، تاریخ، جغرافیہ، جنرل سائنس اور حساب کے مضامین تھے۔ میں حساب میں تو کچھ کمزور تھا (جو آج بھی ہوں) مگر باقی مضامین میں مجھے بڑی دسترس حاصل تھی۔اسکے باوجود میں اپنے طور پر کسی قسم کے مقابلے کی دوڑ میں شامل نہ تھا اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ کلاس میں کون اوّل آئیگا۔ میں کراچی میں اپنے ہم عمر کزنز میں بہت اچھا وقت گذار رہا تھا کہ ایک شام جب میں واپس گھر پہنچا جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے تو سب لوگ میری امّاں کو مبارکباد دے رہے تھے۔ میرے ماموں نے بڑے پیار سے کہا ''بھئی فیروز تم نے تو پالا مار لیا'' میں ان حالات کی وجہ سے کچھ جھینپ گیا۔ میں نے پوچھا میں نے کیا کیا ہے۔تو سب کے سامنے مجھے سلطان بھائی جان کا خط پڑھ کر سنایا گیا کہ نہ صرف میں اپنی کلاس میں اوّل آیا ہوں بلکہ اسکول میں اس کلاس کے جتنے سیکشن ہیں ان سب میں اوّل آیا ہوں اور یہ کہ جغرافیہ اور جنرل سائنس میں تو میں نے اتنے نمبر حاصل کئے ہیں کہ اب تک کے اسکول کا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ میرے ماموں جو مجھ سے بہت محبت کرتے تھے انہوں نے فوراً عبدالحنان (کہ اس زمانے میں کراچی کا سب سے نامور حلوائی تھا) کے یہاں سے موتی چور کے لڈو منگوائے اور سب نے منہ میٹھا کیا۔لوگوں نے مجھ پر روپوں کی بوچھاڑ کردی۔ میں اپنے طور پر ہر ایک سے شرما رہا تھا۔بہر حال یہ ایک ایسا لمحہ ہے جسے میں فراموش نہیں کرسکتا کیوں کہ اس کے بعد میرا تعلیمی ریکارڈ ایسا تابناک رہا کہ پھر نہ صرف میڈیکل کالج بلکہ اس کے بعد امریکہ کے پوسٹ گریجویٹ امتحانوں تک اللہ تعالی کا احسان ہے کہ میں ایک مثالی طالب علم قرار دیا جاتا رہا۔اس امتحان کے نتیجے نے جو میرے لئے غیر متوقع تھا، کہ میں نے کسی مقابلے یا کسی پوزیشن کے حصول کے لئے امتحان نہیں دیا تھا اسکے باوجود میری اتنی اچھی پوزیشن آئی تھی، میری آنکھیں کھول دیں اور مجھے اپنے متعلق ایک نئی آگہی سے ہمکنار کیا۔ مجھ میں قیامت کی خود اعتمادی آگئی اور مجھے یقین ہوگیا کہ اللہ نے مجھے وہ صلاحیتیں دی ہیں کہ اگر میں اپنی تعلیم میں ذرا سنجیدہ ہوجاؤں تو کامیابی میرے قدم چومے گی۔

میرا پیدائشی خوف

میں واپس میرپور خاص آیا اور اگست ۵۶ء میں نئی کلاس جو تھرڈ اسٹینڈرڈ (ساتویں) کہلاتی تھی شروع کی۔ یہ کلاس اسکول کی اس عمارت میں تھی جو پوسٹ آفس کے سامنے ایک ٹوٹے پھوٹے پرانے قبرستان کے مقابل واقع تھی۔اس کلاس یا یوں کہیں کہ اس عمارت میں میرے لئے دو ایسی مشکلات تھیں جنہوں نے مجھے ادھ موا کردیا۔ایک تو یہ کہ ہماری کلاس میں لاتعداد چھپکلیاں تھیں اور میری چھپکلیوں سے جان جاتی تھی۔اُدھر کلاس کے شریر لڑکے کبھی کبھی زندہ چھپکلیاں میری ڈیسک میں ڈال دیتے تھے اور میرے ڈیسک کھولنے پر جب چھپکلی اچھل کے بھاگتی تو مجھ پر جیسے ہسٹیریا کا دورہ پڑجاتا تھا۔کئی منٹ میرا جسم کانپتا رہتا اور اس کے باوجود کہ چھپکلی بھاگ چکی ہوتی میں دوبارہ کلاس میں نہیں آتا اور برآمدے میں کھڑا رہتا۔ دوسرے اس سے بھی بڑا مسئلہ ایک اور تھا۔ مجھے آج کے میرپور خاص کا تو علم نہیں مگر اس دور میں میرپور خاص میں شدید قسم کے پاگلوں کی بڑی بہتات تھی۔سڑکوں یا بازاروں میں نہایت خوفناک حالت بنائے پاگل گھومتے رہتے تھے۔کئی لباس سے بھی مکمل طور پر آزاد ہوتے تھے۔ کچھ کے منہ سے جھاگ، بالوں میں خاک اور ٹوٹے ہوئے تنکے اور گھاس پھوس کے علاوہ شہر کے آوارہ لڑکوں کے پتھر مارنے کی وجہ سے چہروں پر جما ہوا خون بھی نظر آتا تھا۔ میں پاگلوں سے بھی بہت خوف کھاتا تھا۔ایسا ہی ایک پاگل جو مخبوط الحواس ہونے کے ساتھ انتہائی قوی ہیکل تھا اور اپنے ہاتھ میں ایک موٹا سا لٹھ بھی رکھتا تھا دوڑتا ہوا کسی بھی کلاس میں گھس جاتا تھا اور میز پر ڈنڈا مار مار کر عجیب آوازیں نکالتا تھا۔ پھر تمام ڈیسکوں کی قطاروں میں سے گذرتا ہوا پورے کلاس کا چکر لگاتا تھا اور کلاس کے پچھلے دروازے سے نکل جاتا تھا۔ڈرتے تو شاید سب ہی اس سے تھے مگر اس کے آنے پر استاد سمیت سب ہی دم سادھے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے رہتے تھے مگر اسکے آنے پر میں تو خوف سے نیلا پڑجاتا تھا اور انتہائی اضطراری میں اپنی ڈیسک پر پیر رکھ کر باقی کرسیوں کو پھلانگتا ہوا بھاگ کر اسکول کی عمارت سے نکل کر قبرستان میں پناہ لیتا تھا۔اس پر بعد میں مجھے ڈانٹ اور کبھی کبھی مار بھی پڑتی تھی مگر میں اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ مگر یہاں میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کے جب وہ آتا تھا تو اسکا حلیہ، اسکی حرکتیں ایک ایسا خوفناک ماحول پیدا کردیا کرتے تھے کہ اگر آج بھی ایسا ہو تو بڑوں بڑوں کے دل دہل جائیں۔اپنی اس بزدلی کی وجہ سے میں بڑا بدنام ہوا۔اور لڑکے ہاف ٹائم میں میرا بڑا مزاق اڑاتے تھے مگر میں اپنی فطرت سے مجبور تھا۔

خدا کا کرنا کیا ہوا۔۔۔یا شاید میری خاموش دعاؤں کا نتیجہ کہ ابھی ہم اس کلاس کے اولیں مہینوں ہی میں تھے جب ہمیں یہ خوشخبری ملی کہ ہمارے نئے اسکول کی عمارت تیار ہوگئی ہے اور اب ہم نئی عمارت میں منتقل ہوجائینگے۔ مگر ذرا تھمیں اس سے پہلے۔۔۔

مرزا اشفاق بیگ

میرے سب سے قریبی دوست سے میرے پہلے تعرف کا پس منظر بڑا دلچسپ ہے اور ہم اسے یاد کر کے اب بھی ہنستے ہیں

میں جب ساتویں کلاس شروع کرنے سے پہلے کراچی میں تھا تو ایک شام ہم جہاں ٹھرے ہوئے تھے وہاں تمام بچوں کے بال کٹوانے کے لئے ایک نائی کو گھر پر بلایا گیا اور ہر بچے کو اسکے سامنے بیٹھنا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ نہ صرف بچے بلکہ کچھ بڑے بھی اپنے سر منڈوا رہے ہیں معلوم یہ ہوا کہ اس گھر کے سربراہ کو ابھی حال ہی میں ٹائیفائڈ ہوا تھا جسکی وجہ سے انکے بال تیزی سے گر رہے ہیں اس لئے ڈاکٹروں نے انہیں یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ خود ہی سر پر استرا پھر والیں جس کی وجہ نئے بال بہت اچھے آئینگے۔ یہ صاحب بہت ہینڈسم تھے اور انکو اپنے بالوں کے گرنے کا شدید افسوس تھا اس لئے انکو اخلاقی سہارا دینے کے لئے انکے بھائیوں بھتیجوں نے بھی اپنے بال منڈوا دئے تھے۔ مجھے ہمیشہ سے ذرا لمبے بالوں کا شوق ہے اور ہمارے گھر میں بہت اچھے انگریزی کٹ بالوں کا دستور تھا۔ میری امّاں منڈے سروں کو دیکھ کر کہتی تھیں'' کیسے کم بخت سر۔۔ بالکل کدّو لگ رہے ہیں''میں یہ صورت حال دیکھ کر بہت پریشان ہوا اور بھاگنے کی ٹھانی مگر بھاگ جانے کی کوئی سبیل نہیں تھی۔ میں نے با آواز بلند احتجاج کیا تو اس پر ایک بزرگ نے کہا کہ کوئی بات نہیں تمہارے صرف انگریزی بال کاٹے جائینگے اور نائی نے مجھے دوشالہ اڑھا کر بٹھا دیا۔ مجھے نہیں معلوم کس نے اشارہ کیا دوسرے ہی لمحے مشین میرے سر پر چل گئی اور میرا آدھا سر گنجا ہو گیا اس کے بعد بس میرے آنسو گرتے رہے اور چند ثانیوں میں باقی بال بھی زمین پر میرے قدموں میں پڑے تھے۔ میں تقریباً پوری رات روتا رہا اور دوسرے دن آنسوؤں سے سوجا چہرہ لیکر میر پور خاص پہنچا۔ میری امّاں بھی ناراض ہوئیں کہ میرے بچے کا سر مونڈ دیا مگر اب کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انہی دنوں میری داہنی آنکھ میں ایک گوہائی بھی نکلی ہوئی تھی اور کراچی میں ہاکی کھیلتے ہوئے میرے بائیں انگھوٹے میں چوٹ لگی تھی جس میں پیپ پڑ گئی تھی اس لئے اس پر موٹی سی پٹی تھی اور میں عجیب قسم کی کھلی چپل پہنتا تھا۔

ادھر میری غیر موجودگی میں شہداد پور سے ایک لڑکا مرزا اشفاق بیگ ٹرانسفر ہو کر ہماری کلاس میں داخل ہوا تھا۔ اسکا تعلیمی ریکارڈ بھی بہت ہی بہترین تھا اور اسنے اپنی ہر کلاس میں ٹاپ کیا تھا۔ اسکے ساتھ ایک یہ بھی مثبت پوائنٹ تھا کہ جب کہ میں حساب میں کمزور تھا وہ حساب میں بھی اپنا مقابل نہیں رکھتا تھا۔ ہماری کلاس جوائن کرنے پر اسے میری کلاس کے لڑکوں نے بتایا کہ ہماری کلاس کا سب سے ہوشیار لڑکا میں ہوں اور وہ خبردار رہے کہ ابھی فیروز عالم نے کلاس جوائن نہیں کی ہے۔ اس نے میری شخصیت کے متعلق نہ جانے کیا کچھ تصور کیا ہوا تھا۔ ادھر جب میں اسکول پہنچا تو بقول اسکے اس نے دیکھا کہ ایک نہایت منحنی سانولا سا لڑکا جو گنجہ تھا، ایک آنکھ سوجی تھی اور ایک پیر ننگا تھا اور جس کے انگھوٹے پر ایک غلیظ پٹی بندھی تھی لنگڑا کر چل رہا ہے۔ وہ میری طرف بڑھا اور اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھا کر کہا''میں اشفاق بیگ ہوں'' یہ لمحہ میری زندگی کا ایک نہایت تابناک اور نا قابل فراموش لمحہ ہے جو میرے لئے ان مٹ ہو گیا ہے۔ اس لمحے سے اشفاق اور میں، اپنے درمیان تمام تر مقابلے کی فضا کے باوجود دوستی کے ایسے بندھن میں بندھے جسے شاید موت بھی نہیں توڑ سکے گی۔

اشفاق دراز قد، گوری رنگت اور ہلکی سی نیلاہٹ لئے سلیٹی آنکھوں کا مالک تھا۔ وہ ہماری کلاس کیا سارے سکول کا سب سے خوبصورت لڑکا تھا۔ اسکے بولنے میں وہ روانی تو نہیں تھی جو مجھ میں تھی مگر وہ بہت نفیس گفتگو اور اعلی درجہ کی زبان ٹھہر ٹھہر کر استعمال کرتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی تمام تر صلاحیتوں اور اس احساس کے باوجود کہ میں اسکا مقابل ہوں اسے نہ صرف مجھ سے کوئی حسد نہ تھا بلکہ وہ کلاس کے تمام لڑکوں میں مجھ سے سب سے زیادہ قریب تھا اور اگرچہ مستقبل میں اسکے فوج میں شمولیت کی وجہ سے ہمارے راستے جدا ہو گئے مگر آج ترپن (۵۳) سال بعد بھی اگر ہم پہلے دن کی طرح ایک دوسرے کے قریبی دوست ہیں تو شاید اسمیں مجھ سے زیادہ اسکی کوششوں کا دخل ہے۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے سے بہت سی چیزیں سیکھیں اور ہم ایک دوسرے کی شخصیت پر کئی طرح سے اثر انداز ہوئے۔

اشفاق کو فوراً کلاس کا مانیٹر بنا دیا گیا۔ اس سے پہلے ہماری کلاس کا مانیٹر مقبول احمد آرائیں تھا۔ مقبول ایک مضبوط کاٹھی کا پنجابی نوجوان تھا اور اسکا نصب العین فوجی بننا تھا۔ وہ ڈرل کرتے ہوئے جب فوجی لباس پہنتا تھا تو حقیقت میں پاک فوج کا سپاہی لگتا تھا۔ وردی اسپر سجتی بھی خوب تھی۔ میری مقبول سے بھی بڑی دوستی تھی اور میں کئی دفعہ اسکی سائیکل پر بیٹھ کر اسکے گاؤں جو میر پور خاص سے دو میل دور کھیتوں میں تھا جا چکا تھا جہاں ہم پودوں سے تازہ ٹماٹر توڑ کر کالی مرچ اور نمک لگا کر کھاتے تھے۔۔ ہمارے کلاس ٹیچر نے یہ فیصلہ کیا کہ اب کلاس میں دو مانیٹر ہونگے۔ مقبول نظم وضبط برقرار رکھنے کا مانیٹر اور اشفاق تعلیمی معاملات کا مانیٹر مقرر ہوئے۔ میں اس معاملے میں کسی قطار شمار میں نہیں تھا کیونکہ اپنے پچاسی پاؤنڈ کے وزن اور چھپکلیوں سے خوف کھانا میری وجہ شہرت بن چکی تھی جس کی وجہ سے مجھے کسی قسم کی قیادت سوپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی جہاں تک کلاس میں مباحثوں، سوالوں کے جواب دینے اور استاد سے انتہائی مشکل سوالات پوچھ کر انکو لاجوب کرنے کا تعلق تھا میں اب بھی سب سے آگے تھا۔ اسکے علاوہ جنرل نالج جس میں بین الاقوامی حالات حاضرہ اور ملکی سیاسی صورتحال سے مکمل آگاہی شامل تھی میں نے کلاس میں اپنا ایک خاص مقام بنایا ہوا تھا جس میں صرف اشفاق ہی میرے مدمقابل تھا۔

ماسٹر چوہدری بشیر

اسی کلاس میں ہمارا واسطہ ایک ایسے شخص سے ہوا جسے ہماری کلاس یعنی ہمارے بیچ کا کوئی بھی لڑکا تا حیات فراموش نہیں کر سکتا۔ ہماری شخصیت کی

تعمیر میں اسکا بڑا حصہ ہے۔ایک بات جسکا تذکرہ یہاں ضروری ہے وہ یہ کہ اتفاق سے ہمارے بیچ میں پورے اسکول کے سب سے زیادہ قابل ذکر اور مختلف طور پر با صلاحیت لڑکے جمع ہو گئے تھے۔اس لئے یہ کلاس پورے اسکول کی نظروں کا مرکز تھی اور تمام ٹیچر ہماری کلاس کو بہت ہی دل چسپی سے دیکھتے تھے اور ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ اس کلاس کا استاد مقرر ہو۔ہماری کلاس میں نہ صرف اشفاق، میں، لئیق، حبیب، عزیز، مقبول اور اصغر جیسے پڑھائی میں انتہائی تیز لڑکے تھے بلکہ اس میں کچھ شریر اور منہ زور لڑکے بھی شامل تھے اسکے علاوہ کچھ لڑکے اپنے خاندانی وقار یا مالی حیثیت کی وجہ سے بدماغی اور غرور میں بھی مبتلا تھے۔ایسی کلاس کے لئے ایک انتہائی سخت اور جرأت مند استاد کی ضرورت تھی۔اس قسم کی صلاحیت کے لحاظ سے چوہدری بشیر پوری فیکلٹی میں سرفہرست تھے اور اسی لئے ہمارے ہیڈ ماسٹر دین محمد آرائیں نے چوہدری بشیر صاحب کو ہمارا استاد مقرر کر دیا۔بشیر صاحب نئے نئے پنجاب سے آئے تھے اور انتہائی کثرتی اور خوبصورت جسم کے مالک تھے۔اسکے علاوہ وہ ایتھلیٹک اور دوسرے اسپورٹس میں ضلع بھر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔جب سالانہ ضلعی مقابلے ہوتے تو انکا جیولن تھرو، ڈسکس تھرو، ہرڈلز اور دوسرے کھیلوں میں صرف میونسپل اسکول کے چوہدری نذیر ہی مقابلہ کرتے تھے مگر جیت ہمیشہ بشیر صاحب ہی کی ہوتی تھی۔اپنی جسمانی صحت اور مضبوط شخصیت کو استعمال کرتے ہوئے اور کچھ اپنی دوستانہ حکمت عملی کی بنا پر انہوں نے تمام منہ زور لڑکوں پر مکمل قابو پالیا۔ادھر ہماری کلاس میں کچھ لڑکوں میں اسپورٹس میں نام پیدا کرنے کی مخفی صلاحیتیں تھیں۔چوہدری بشیر نے انکی خوب خوب ہمت افزئی کی اور ان پر خاص توجہ دی۔منتظر ہماری کلاس کا ایک دبلا پتلا لڑکا تھا مگر وہ دور تک اور دیر تک بھاگ سکتا تھا۔بشیر صاحب نے اسکا اسکول کے خرچے پر ہر شام میر پور خاص کے مشہور حلوائی کے یہاں دودھ بندھوا دیا اور ذاتی طور پر اسکو طویل فاصلے کی دوڑ کی تربیت دی جسکی وجہ سے اسنے نہ صرف اگلے سال ضلعی مقابلوں میں ایک میل کی دوڑ میں اوّل پوزیشن حاصل کی بلکہ جب تک میں نے انٹر سائینس کے بعد میر پور خاص نہیں چھوڑ دیا وہ ہر سال اس دوڑ میں اوّل آیا۔اسی کے ساتھ انہوں نے منظور، مستقیم، اور دوسرے لڑکوں کو بھی مختلف کھیلوں میں کامیابی کی راہ دکھائی۔انکی کلاس کے وقت کمرے میں ایک عجب دوستانہ ماحول ہوتا تھا اور ہر لڑکا اپنے خیالات کھل کر بیان کرتا تھا۔ہر موضوع پر خوب خوب بحثیں ہوتی تھیں۔مختلف سوالات چیلنج کی شکل میں پوچھے جاتے تھے۔جہاں ہم ان سے بے تحاشا خوف کھاتے تھے وہیں ہمیں ان سے والہانہ لگاؤ اور پیار تھا۔اس کے ساتھ یہ بھی لکھنا ضروری ہے کہ وہ چماٹ مارنے اور انگلیاں مروڑنے میں بھی کسی بخالت سے کام نہیں لیتے تھے مگر حقیقت میں ہمیں انکا مارنا بھی اچھا لگتا تھا۔چوہدری صاحب یوں تو خود بھی اچھا پڑھاتے تھے مگر بڑی حد تک وہ پڑھائی کی ذمہ داری اشفاق پر چھوڑ دیتے تھے۔ہماری کلاس کے لڑکے آج بھی یہ کہتے ہیں کہ ان کے دور میں شاید اشفاق نے کلاس کو ان سے زیادہ پڑھایا ہو۔بہر حال یہ ایک خوشگوار دور تھا ہم اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ایک تھپڑ

ایک تھپڑ جو ہمیشہ یاد رہیگا اور جسکا غصہ نہ صرف مجھے آج بھی ہے بلکہ شاید زندگی کے آخری سانس تک یاد رہیگا۔یوں تو میں نے اپنی شرارتوں اور کھسر پسر کرنے کی وجہ سے کئی دفعہ مختلف ٹیچرز سے مار کھائی ہے اور اسکا مجھے کچھ دکھ بھی نہیں اور نہ ہی کسی ٹیچر کے لئے میرے دل میں کوئی کدورت ہے مگر ایک تھپڑ ایسا ہے جسکو میں نہیں بھول سکا ہوں اور اسکی یاد آکر مجھ پر آج بھی نہ صرف شدید غصہ طاری ہو جاتا ہے بلکہ جس شخص نے یہ تھپڑ مارا تھا اسکے لئے میرے دل میں نفرت کی لہریں اٹھنے لگتی ہیں۔ہمارے اسکول میں اس وقت جغرافیہ کے ٹیچر ظفر اقبال ہوتے تھے۔ان سے ہمارے خاندانی تعلقات بھی تھے اور انکی والدہ میری والدہ کی دوست بھی تھیں۔وہ غصّے کے بہت تیز تھے اور خود کو بہت کچھ سمجھتے تھے۔پھر وہ شاید اس زمانے میں سندھ یونیورسٹی سے جغرافیہ میں ایم اے کر رہے تھے۔میر پور خاص جیسے چھوٹے شہر میں ایم اے کا طالب علم ہونا بھی بڑی بات تھی اس لئے انکو خود پر مزید غرور تھا۔ایک دن ہندوستان کا جغرافیہ سمجھانے کے لئے انہوں نے بورڈ پر ہندوستان کا نقشہ بنایا۔میں عرض کر چکا ہوں کہ جغرافیہ تو ہمارے گھر کی لونڈی تھی کہ سلطان بھائی جان نے گھر کی ایک دیوار پر تمام دنیا کا نقشہ بنایا ہوا تھا اور دن رات ہمارے یہاں جغرافیہ کی مناسبت سے دیس دیس کی باتیں، قدرت کے عجیب وغریب مظاہر جیسے قطب شمالی میں پراسرار سبز روشنیوں کے جھماکے (AURORA) اور دنیا کے دریاؤں کی لمبائی کے ذکر ہوتے رہتے تھے۔انکو نقشہ بنانا نہیں آتا تھا اور ایک عجیب وغریب سا ٹیڑھا میڑھا نقشہ بنایا ہوا تھا۔اسکے ساتھ جو کچھ وہ جنوبی ہند اور مالابار کے ساحل کے بارے میں بتا رہے تھے وہ بھی بہت غیر دلچسپ تھا اور میں اسکے متعلق پہلے ہی بہت کچھ جانتا تھا۔میں خود ان سے کہیں زیادہ اچھا نقشہ بناتا تھا اور اگر میری کلاس کے کچھ لڑکے آج بھی میر پور خاص میں ہیں تو وہ اسکی گواہی دینگے کہ میں کھڑے کھڑے چند منٹ میں تمام دنیا یا کسی بھی خطے کا صحیح نقشہ بنا دیا کرتا تھا۔مجھے انکے لیکچر یا انکے نقشے میں کوئی چیز دلچسپ نہیں لگ رہی تھی۔مگر انکے ادب کے خیال سے میں بالکل خاموش، نظریں نیچے کئے بیٹھا تھا اور جغرافیہ کی کتاب کھولے اس پر نظریں جمائے تھا۔میں مکمل طور پر اپنے خیالات میں گم تھا اتنے میں میرے چہرے پر اچانک اس قدر زور کا تھپڑ پڑا کہ نہ صرف میرا منہ ٹیڑھا ہو گیا بلکہ مجھے سچ مچ میں تارے نظر آ گئے میں اپنی پوری جان سے ہل گیا۔بڑی حد تک ڈیسک پر میرے ساتھ بیٹھے ہوئے دوسرے لڑکے نے مجھے سہارا دیا۔اس پر انہوں نے میرا کان مروڑ کر یہ کہتے ہوئے دوسرا تھپڑ رسید کیا کہ تو میرے لیکچر پر توجہ نہیں دے رہا نیچے کتاب پر کیا دیکھ رہا ہے۔بس یہ قصّہ تو وہیں ختم ہو گیا مگر انکی اس انتہائی غیر اخلاقی حرکت کو میں نہیں بھولا ہوں۔اس دن سے انکی عزت میری نظروں میں خاک میں مل گئی۔وہ بھی

چند ماہ بعد ایم اے کر کے کالج میں لیکچرار ہو گئے۔ میرا ان سے پھر کبھی کوئی واسطہ نہیں پڑا سوائے اس کے کہ اب بھی کبھی اس تھپڑ کا خیال ضرور آ جاتا ہے۔

نئی بلڈنگ

ہمارے اسکول کی نئی بلڈنگ شہر سے دور ''کیمپنگ گراؤنڈ'' جس پر بہت بعد میں گاما اسٹیڈیم تعمیر ہوا، کے شمال میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس وقت میر پور خاص کی سرحدیں اس سے بھی پہلے ڈپٹی کمشنر آفس کے نزدیک ختم ہو جاتی تھیں۔ اس لئے یہ اسکول بڑی حد تک کھیتوں میں تھا۔ یہاں چار عمارتیں تعمیر ہوئی تھیں۔ ایک گورنمنٹ ہائی اسکول، یعنی ہمارا اسکول، ایک اسکا ہاسٹل، ایک اور بڑی شاندار اور پر شکوہ بلڈنگ جس میں لڑکوں کا کالج منتقل ہونا تھا جو اس وقت تک پرتاب بھون میں تھا اور ایک اس کالج کا ہوسٹل۔ یہ پاکستان کا اولیں دور تھا اور پاکستان انتہائی خوشحالی کی جانب رواں دواں تھا۔ چاروں عمارتیں نہایت خوبصورت وسیع۔ جدید اور پر شکوہ تھیں بالکل ایسی جیسی ہم کبھی غیر ملکی رسالوں میں دیکھتے تھے۔ اسکول کی صدر بلڈنگ کے داہنی جانب ایک وِنگ نیم دائرے کی شکل میں تھا اس میں بھی کلاسیں تھیں۔ ہماری کلاس اس میں تھی مگر لڑکوں کی زیادتی کی وجہ سے دو شفٹیں ہوتی تھیں اور ہم دوسری شفٹ میں جاتے تھے۔ یہاں منتقل ہونے کے بعد بھی بشیر صاحب ہمارے ٹیچر رہے۔ انہوں نے اپنے طور پر ایک روز یہ تجویز پیش کی کہ ہماری کلاس کی ایک یونیفارم ہونی چاہئے جو فوجی انداز کی ہو۔ ہر لڑکا اپنے خرچے پر خاکی فوجی وردی سلوائے جس کے کندھوں پر نمائشی بلے ہوں اسکے ساتھ گہری خاکی رنگ کی پتلون اور چمڑے کی فوجیوں جیسی پٹی بھی ہو جسے باندھ کر سب لڑکے ایک دن اچانک اسکول آئیں اور پورے اسکول کو حیران کر دیں۔ لڑکوں میں ایک قسم کی رائے شماری ہوئی اور پھر جب مقررہ دن سب لڑکے ایک ہی یونیفارم میں انتہائی نظم وضبط کے ساتھ صبح کی اسمبلی کے وقت لائن میں کھڑے ہوئے تو پورا اسکول نہ صرف حیران ہو گیا بلکہ ہمیں ایسی تحسین آمیز نظروں سے دیکھنے لگا جیسے ہم کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔ اس سے ہماری کلاس کی عزت اور وقار پورے اسکول میں اور بڑھ گیا۔ اس یونیفارم میں ہماری ایک گروپ تصویر بھی کھنچی جو آج بھی میرے پاس ہے۔

جرأت مندانہ قدم یا حماقت

یہاں میں ایک ایسا واقعہ لکھنا چاہتا ہوں جو اس دور کے ہر لڑکے کو یاد ہوگا۔

جیسا میں نے پہلے بھی لکھا ہے، ہمارے دن کی ابتدا اسکول کے سامنے قطار میں کھڑے ہو کر تلاوت قرآن، ترانہ اور پھر ہیڈ ماسٹر آرائیں صاحب کی تقریر سننے سے ہوتی تھی۔ آرائیں صاحب نے نئی عمارت میں بھی وہی معمول جاری رکھا۔ آرائیں صاحب کی تقریر سندھی میں ہوتی تھی جس میں کبھی کبھی وہ انگریزی کے کچھ جملے بھی بول دیا کرتے تھے۔ میں پانچویں جماعت سے اسے سنتا آ رہا تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے میر پور خاص کی آبادی زیادہ تر سندھی لڑکوں پر مشتمل تھی اور اگر یہاں معدود چند پنجابی آبادگاروں کے بچے تھے بھی تو وہ بھی سندھی بولتے تھے۔ مگر پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد یہاں کی آبادی کے تناسب میں غیر معمولی تبدیلی آئی تھی۔ اب یہاں اردو بولنے والوں کی تعداد زیادہ تھی اور پنجاب سے نئے آنے والے بھی اردو ہی بولتے تھے۔ ایک دن آرائیں صاحب کا خطاب کچھ زیادہ ہی لمبا ہو گیا۔ میری ٹانگوں میں درد اور اینٹھن ہونے لگی اور سر چکرانے لگا اس پر طرّہ یہ کہ میری کچھ سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایک ایک لمحہ عذاب لگ رہا تھا۔ خدا خدا کر کے تقریر ختم ہوئی اور ہم گرتے پڑتے کلاس میں پہنچے۔ میں منہ پھٹ تو ہمیشہ سے تھا ہی اس تکلیف دہ تجربہ نے مجھے چڑچڑا کر دیا تھا۔ میں نے اپنی جھنجلاہٹ ماسٹر بشیر صاحب پر اتار دی اور ان سے کہا کہ ایسی تقریر کا کیا فائدہ جو کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ تو ایک قسم کی کھڑا رہنے کی سزا ہوئی۔ آپ ماسٹر صاحبان ان سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ اردو میں تقریر کیا کریں۔ بشیر صاحب نے اپنے خاص طنزیہ لہجے میں مجھ سے کہا ''اوئے! جو تجھ میں اتنی ہمت ہے تو بھئی تو خود کیوں نہیں کہتا؟؟۔'' میں نے جھٹ سے جواب دیا ہاں میں تو ضرور کہوں گا۔ ذرا آئندہ وہ اتنی لمبی تقریر کریں تو میں ضرور کہوں گا۔ بشیر صاحب نے مجھے مزید جھنڈے پر چڑھا دیا اور کہا کہ لمبی تقریر کا کیا انتظار تمہاری بات صحیح ہے تو کل ہی ان سے کہنا کہ اردو میں تقریر کریں۔ میں بھنّایا ہوا تو تھا ہی میں نے فوراً کلاس کے سامنے اعلان کیا کہ ہاں میں کل ہی ان سے یہ کہوں گا۔

اب آپ اسکا تصور کریں کہ میں ہائی اسکول کی انتہائی نچلی جماعت میں تھا، یہاں پری میٹرک اور میٹرک کے لڑکے تھے جو جوان لگتے تھے، پھر میں پچاسی پاؤنڈ وزن کا دھان پان سا لڑکا تھا اور ادھر آرائیں صاحب کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ نہ صرف ہمارے ماسٹر صاحبان ان سے خوف کھاتے تھے بلکہ پورے شہر میں انکا خاص رعب اور دبدبہ تھا۔ یہ تو داؤد اور جالوت کا مقابلہ ہو گیا۔ خیر دوسرے دن ہم پھر اسمبلی میں جمع ہوئے۔ اسکول کے صدر دروازے کے سامنے چوڑی چوڑی سیڑھیاں تھیں اور چھ یا سات سیڑھیاں چڑھ کر چبوترہ آتا تھا جو اسٹیج کا کام دیتا تھا۔ آرائیں صاحب اس چبوترے پر کھڑے تھے ان کے پیچھے ٹیچرس کھڑے تھے اور انکے سیدھے ہاتھ پر پاکستان کا سبز ہلالی پرچم تھا۔ انہوں نے نسواری پتلون اور بھورا چوکڑی دار کپڑے کا کوٹ پہنا تھا اور ٹائی لگائی ہوئی تھی اس کے ساتھ وہ ہمیشہ ٹوپی بھی پہنتے تھے۔ ان کی شخصیت بڑی پر وقار لگ رہی تھی۔ نیچے زمینی سطح پر پانچویں سے میٹرک کی کلاسوں کی قطاریں تھیں جو اسٹیج سے عمودی زاویہ بناتی تھیں۔ کم قد کے لڑکے آگے اور لمبے قد کے ان سے پیچھے ہوتے تھے۔ میں اپنی کلاس کی قطار میں سب سے آگے تھا۔ جیسے ہی تلاوت اور ترانہ ختم ہوا اور آرائیں صاحب نے سندھی میں پیارے بیٹو کے الفاظ ادا کئے میں قطار سے نکلا اور بالکل فوجی انداز سے چلتا ہوا دو سیڑھیاں اوپر چڑھا۔ وہ ابھی کچھ اور کہہ ہی رہے تھے کہ میں نے انکی بات کاٹ کر بلند آواز میں کہا ''سر اردو

میں بات کیجئے''۔ مجمعے پر سناٹا طاری ہوگیا۔آرائیں صاحب ایک لحہ کوسُن ہو گئے مگر دوسرے لحہ انہوں نے غصے سے زمین پر پیر مارا اور شیر کی طرح دہاڑتے ہوئے کہا'' چل بھاگ ادھر سے۔۔ تیری تو میں ابھی خبر لیتا ہوں۔۔پکڑو اسے!!۔۔۔''بس مجھ میں اتنی ہی ہمت تھی مجھے تو ایسا لگا میری جان ہی نکل جائیگی اسکے ساتھ لڑکوں اور ٹیچرز سے اسقدر شرمندگی تھی کہ دل چاہتا تھا کہ زمین پھٹے اور میں دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاؤں۔آخر کار میں ایک ناتواں کم عمر نچلی کلاس کا لڑکا ہی تو تھا۔میرا دل پتّے کی طرح کانپ رہا تھا۔میں لرزتی ٹانگوں سے تیزی سے اپنی قطار میں واپس آیا اور سب سے پیچھے جا کر جہاں لمبے لمبے لڑکے کھڑے تھے انکے قدموں میں زمین پر چھپ کر بیٹھ گیا اور اسکا انتظار کرنے لگا کہ اب لڑکے مجھے پکڑ کر اوپر اسٹیج پر لے جائیں گے اور سب کے سامنے میری دھنائی ہوگی مگر کوئی مجھے پکڑنے نہیں آیا۔دن بھر کلاس میں چوہدری بشیر مجھے ڈراتے رہے کہ اب ہیڈ ماسٹر کے کمرے سے انکا چوکیدار مجھے پکڑنے آنے والا ہے۔مگر کوئی نہیں آیا۔

مگر یہاں میں یہ لکھنا چاہتا ہوں، (اور یہ لکھتے ہوئے میرے دل میں آرائیں صاحب کے لئے جو تشکّر کے جذبات ہیں انکا بیان مشکل ہے) کہ کیا کردار تھا آرائیں صاحب کا کہ انہوں نے نہ صرف مجھے کوئی سزا نہیں دی بالکہ دوسرے دن انہوں نے اردو میں تقریر شروع کی اور پورے اسکول کے سامنے میری جرأت کی تعریف کی اور کہا کہ انہیں بدلے ہوئے حالات کا احساس نہ تھا اور وہ سندھی میں تقریر کرنے کے عادی تھے۔انہیں خوشی ہے کہ ایک نچلی جماعت کے لڑکے نے انکی توجہ اس طرف دلائی۔اسکے بعد آرائیں صاحب نے اسمبلی میں ہمیشہ اردو میں تقریر کی۔میں اس کو بیان ہی نہیں کرسکتا کہ میرے دل میں یوں تو کئی اور وجوہات کی بنا پر آرائیں صاحب کی بے پناہ عزت ہے مگر اس واقعہ کے پس منظر میں آرائیں صاحب کے کردار اور انکی فراخ دلی نے جو میرے دل پر نقش چھوڑا وہ میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔یہاں میں یہ لکھنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ سندھی مجھے بہت پیاری ہے اسکا ادب اور اسکا صوفیانہ کلام کسی بھی عالمی زبان کے مقابل رکھا جاسکتا ہے۔مجھے سندھی سے خدانخواستہ کوئی بیر بھی نہیں بلکہ میں نے میڈیکل کالج کے زمانے میں جشن شاہ بھٹائی میں سندھی کافیاں گائی ہیں، نہ ہی میری یہ حرکت کسی خودنمائی کی وجہ سے تھی یہ تو صرف اس وجہ سے تھا کہ میں سمجھتا تھا کہ وہ جو پیغام دینا چاہتے ہیں وہ ایسی زبان میں ہو جسکو انکے سامعین اچھی طرح سمجھ سکیں۔میری اس اخلاقی جرأت کا آرائیں صاحب بعد میں بھی حوالہ دیتے رہے اور انکی نظروں میں میری قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہوگیا۔

پھولوں کی چوری

مجھے پھولوں سے کلیوں سے تتلیوں سے اور تمام حسین چیزوں سے خاص لگاؤ ہے۔یہ اللہ تعالی ہی کی نوازش ہے جس کے لئے میں اسکا شکر گذار ہوں کہ اس نے مجھے وہ نگاہ عطا کی کہ میں نہ صرف خوبصورتی سے محظوظ ہوسکتا ہوں بلکہ ہر چیز میں حسن تلاش کرتا ہوں۔میر پور خاص اس دور کا حسین شہر تھا۔میں اپنے محلے میں قطار سے لگے سرس کے درختوں کا تذکرہ کر چکا ہوں جن میں ہلکے زرد ریشمی پھول آتے تھے اور پھولوں کی اس قدر کثرت تھی کہ وہ دور دور تک زمین پر بکھرے رہتے تھے۔شہر میں یوں تو کئی باغات تھے مگر ریلوے اسٹیشن کے فرسٹ کلاس گیٹ کے باہر نیم دائرے میں ایک بہت خوبصورت باغ تھا جسکے درمیان فوّارہ تھا اور اسکے چہار طرف روشوں پر رنگ برنگ پھول کھلتے تھے۔ہم محلّے کے بچے جب وہاں کھیلنے جاتے تھے تو میں کبھی کبھی وہاں سے دو چار پھول توڑ کر اپنی کتابوں میں رکھ لیا کرتا تھا۔کبھی کوئی کچھ نہیں کہتا تھا اور اگر کبھی کوئی مالی دیکھ بھی لیتا تو ذرا تنبیہ کر کے چھوڑ دیتا تھا کہ یہ محلّے کے بچے ہیں۔اِسی زمانے میں میر پور خاص میں ولندیزیوں (ہالینڈ) کے عیسائی مشنریوں نے ایک بہت خوبصورت اور جدید ہسپتال ''سینٹ ٹیریزاز'' تعمیر کیا۔

اسکی عمارت چھوٹی اینٹوں سے بنی تھی اور کھڑکیوں پر سفید رنگ کی لکڑیوں کے فریم تھے۔بالکل ایسا لگتا تھا جیسے ہم یوروپ کی کسی عمارت کے سامنے کھڑے ہیں۔اسکے احاطے میں ایک نہایت خوبصورت باغیچہ تھا جس کے کناروں، روشوں اور درمیانی قطعوں پر بیحد دلفریب پھول کھلے رہتے تھے۔پھر خاص بات یہ تھی کہ کچھ پھول ایسے تھے کہ یہ پھول میں نے پہلے کہیں نہیں دیکھے تھے۔میں اپنے دوست افسر کے ساتھ جب اپنے اسکول کی نئی عمارت کی طرف جاتا تھا تو یہ ہسپتال راستے میں پڑتا تھا اور ہم کبھی کبھی اسکے باغیچے میں بھی تھوڑی دیر کو رک کر وہاں کے منظر سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ایک دن میرا دل للچایا کہ میں ان میں سے کچھ پھولوں کو توڑ کر اپنی کتاب میں رکھ لوں۔چند مریضوں کے لواحقین کے سوا باغ میں کوئی تھا بھی نہیں۔میں نے جلدی جلدی پھول توڑنے شروع کئے ابھی چند ہی پھول توڑے تھے کہ کہیں سے انکا چوکیدار اپنی یونیفارم میں ملبوس آگیا اور اور اس نے مجھے پکڑ لیا۔میں نے لاکھ معافی مانگی مگر اس نے کہا کہ وہ مجھے بڑی میڈم کے پاس لے جائیگا کہنے لگا کہ ان گوروں کا اصول ہے کہ یہ ایسی بدنظمی ہرگز برداشت نہیں کرتے بڑی میم مجھے یقیناً پولیس کے حوالے کر دینگی۔اب تو میرا دم نکل گیا۔میں زور، زور سے رونے لگا اور سچ مچ میں اسکے ہاتھ جوڑنے لگا کہ بھائی صاحب آج معاف کردو آئندہ تو میں کبھی اس باغ میں قدم بھی نہیں رکھونگا۔مگر وہ نہ مانا اور مجھے گھسیٹ کر بڑے ہال میں ایک موٹی تازی اور لمبی چوڑی گوری میم کے پاس لے گیا۔وہ ٹوٹی پھوٹی اردو بولتی تھی۔اسنے بھی سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور غصہ سے سرخ ہوگئی۔میں اسکے سامنے اسقدر رویا اور ایسی ایسی معافیاں مانگیں کہ بیان نہیں کرسکتا۔میرے تصور میں جیل اور وہاں کے مظالم رقص کرنے لگے۔آخر اسکو کچھ ترس آیا اور اس نے پوچھا کہ میں کیا کرتا ہوں، وہ سمجھی تھی میں کوئی آوارہ لڑکا ہوں جو اسکول سے بھاگ کر ادھر اُدھر وقت گذارتا ہوں۔میں نے اسے بتایا کہ میں گورمنٹ ہائی اسکول کا ساتویں کا طالب علم ہوں۔پھر افسر نے بھی اسے بتایا کہ میرا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا ہے

اور کتابوں میں پھول رکھنا میرا مشغلہ ہے۔اس پر اس گوری میڈم نے مجھے تنبیہ کر کے جانے کی اجازت دی۔بس اس لمحہ آزادی پا کر ایسا بوجھ اترا جیسے میں سچ مچ جیل سے رہا ہوا ہوں۔سالوں بعد ڈاکٹر بننے کے بعد جب کبھی میں اس ہسپتال میں اپنے کسی ڈاکٹر دوست سے ملنے جاتا تھا تو وہ جگہ دیکھ کر جہاں میں نے رو رو کر معافیاں مانگیں تھی مجھے ماضی کا وہ تلخ واقعہ ضرور یاد دلاتی تھیں۔

ایک سیّاح

میر پور خاص کوئی ایسا شہر تو نہ تھا کہ وہاں سیّاحوں کی بہتات ہو اس لئے جب ہم نے دیکھا کہ ایک سفید فام شخص یہاں کے بازاروں اور ریلوے اسٹیشن پر گھومتا نظر آتا ہے اور کبھی فروٹ فارم روڈ پر سائیکل بھی چلاتا ہے تو سب لوگ بڑے حیران ہوئے۔عام لوگوں میں تو اس سے کچھ پوچھ گچھ کرنے کی ہمت نہیں تھی پھر زیادہ تر لوگوں کو اپنی انگلش پر بھی اعتماد نہ تھا مگر ایک دن سلطان بھائی جان نے اسے ریلوے پلیٹ فارم پر دیکھ مہذب انداز میں خوش آمدید کہا اور اس سے پوچھا کہ وہ کہاں سے ہے۔اس نے بتایا کہ وہ سویڈن سے ہے باتوں باتوں میں اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔سلطان بھائی جان نے اسے دوسرے دن دوپہر کے کھانے پر ہمارے یہاں مدعو کرلیا۔وہ دوسرے دن ہمارے یہاں آ یا میری امّاں نے اسکے لئے قیمہ اور پراٹھے پکائے کہ اس نے فرمائش کی تھی کہ وہ پاکستانی کھانے کھانا چاہتا ہے۔میں اسے حیرانی کے ساتھ تکتا رہا کیوں کہ اس سے پہلے میں نے کسی غیر ملکی اور وہ بھی سفید فام غیر ملکی کو اتنے قریب سے نہیں دیکھا تھا مگر میں اس سے بات نہیں کرسکتا تھا کیونکہ میں انگریزی نہیں بول سکتا تھا سلطان بھائی جان ہمیں اسکے متعلق بتاتے رہے۔اس نے بتایا کہ وہ سویڈن میں نرس ہے (جسے سن کر ہمیں تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی کہ اس وقت تک ہم سمجھتے تھے کہ نرس صرف عورتیں ہوتی ہیں) اور سائیکل پر وہاں سے آسٹریلیا جانے نکلا ہے۔اسے ایک لڑکی سے محبت ہے جو ٹریننگ پر سویڈن آئی تھی اور واپس آسٹریلیا چلی گئی۔اسکے پاس اتنے روپے نہیں کہ ہوائی جہاز کا ٹکٹ خرید سکے اس لئے سائیکل پر گھر سے نکلا ہے اور راستے میں ٹہر کر لوگوں سے مدد طلب کرتا ہوا اپنا سفر طے کر رہا ہے۔اس کا ارادہ راجستھان سے ہوتا ہوا کلکتہ اور آگے جانے کا تھا۔سلطان بھائی جان نے اسے خبر دار کیا کہ اس قدر گرمی میں راجستھان کے ریگستان کو سائیکل پر پار کرنے میں اسکی جان کو خطرہ ہے دوسرے دن ہم لوگ اس کو لیکر نکلے اور میر پور خاص کے کچھ مخیّر لوگوں کے پاس لے گئے اور اسقدر رقم جمع کر لی کہ اسے ٹرین کا ٹکٹ دلوا کر جودھپور کی گاڑی میں بٹھا دیا۔اب بھی کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اسکا نہ جانے کیا بنا ہوگا مگر اسکے حوصلے سے ہمارے گھر والے بہت متاثر ہوئے اور اسکا تذکرہ رہا کہ دنیا میں سفید فام اقوام کی کامیابی کی وجہ انکا حوصلہ بھی ہے کہ انہوں نے تاریک براعظم کے گھنے جنگلات اور جنوبی امریکہ کے دریاؤں کو دریافت کرنے کے لئے اپنی جانوں کی پروا نہ کی اور انسان کے لئے نئی راہیں کھولیں۔

تن نظماں

○○○

رَبّ تے میں

جدوی مل کے بیٹھے
مینوں، نیندر آ گئی

○

ہینڈل وِد کیئر

نعت نبیؐ دی
لکھدیاں ہویاں
مشرک ناں ہو جاناں

○

گُنجل

یا تے میرے اندر
کا لک ای سُئیں
یا فر، اجے اُو
باہر نیں نکلی
عمراں ہویاں
ٹیک ٹیک کے متھا
پر، متھے تے
مُہر نہیں لگی

○

نورزمان ناوک
(تلہ گنگ)

فکرِ فردا

''نبیؐ کا گھر منوّر ہوگیا''

صفوت علی صفوت

(نیویارک)

قارئین چہارسو! اُمید ہے کہ آپ سب خیریت سے ہونگے۔ چونکہ جب تک یہ نامہ چھپے گا خدا جانے کون کس حالت میں ہو! ہماری دُعا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے! آمین!

اب اگر فکرِ حال میں انسان اس قدر مست ہو کہ لکھنے کے لیے ایک موم بتی یا مشعل کا انتظام کرنا پڑے تو ہم مریخ کے متعلق کہاں سوچ سکتے ہیں۔ پھر بھی ارسطو اور افلاطون یوں زندہ ہیں کہ تمام ازمنہ ماضیہ کی تکالیف کے باوجود انسان کے آنے والے دور کی فکر لاحق رہتی ہے اور تھی۔ تو ایسے ہی لوگوں کی سنّت میں ہم یہ قلم چہارسو کے لئے اٹھاتے ہیں۔

جولائی ۲۰۱۱ء کا مہینہ میرے لیے اچھا نہ تھا۔ 30 سال کے بعد شٹل کی آخری پرواز تھی۔ اُسے اپنے گھر سے جاتے اور آتے دیکھ کر ایک سکون محسوس ہوا۔ مگر یہ بھی خیال آیا کہ زندگی کا یہ باب بھی ختم ہوا۔ وہ دن یاد آتے ہیں جب میں خود بھی ان کوششوں میں شامل تھا۔ ہم جب کسی دور دراز خلا کے علاقے کا جائزہ لیتے ہیں اور اسکا مشاہدہ کرتے ہیں تو کوشش یہ ہوتی ہے کہ اُس علاقے میں کوئی ایک ایسی چیز مل جائے جس کو نقطۂ روشنی سمجھا جائے۔ جیسے کہ کوئی Supernova یا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز اُس دور دراز علاقے میں نظر آجائے۔ یاد رہے کہ یہ کرۂ ارض کائنات میں ایک بھُنگے کے برابر بھی نہیں تو ہماری کیا حیثیت ہوگی۔ لیکن اس شعر نے وارد ہو کر میری سمجھ میں اور علم میں یکا یک روشنی پیدا کی۔

اِسقدر میرے نبیؐ کا گھر منوّر ہوگیا
ہم خلابازوں کی بھی راہوں کا رہبر ہوگیا

اب جو ہم نے مُساوات لکھی تھیں اُن کو حل کرنے میں آسانی ہوئی اور اس علاقے کی پیمائش نسبتاً آسان ہوئی۔

ابھی ہم انہیں خیالات میں تھے کہ خیال آیا کہ یہ نعت کا شعر شائد کسی کو اچھا لگے۔ تو دل چاہا کہ ایک شعر ایسا بھی لکھوں کہ جس میں Space Shuttle کا تذکرہ آجائے۔ تو یہ شعر نازل ہوا:

وہ بُراقِ نور تھا سارے ستاروں سے بلند
یہ شٹل کی کھڑکیوں سے شب کا منظر ہوگیا

اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ کس طرح سے ایسی نعت لکھی جاسکتی ہے کہ جس میں نبیؐ کا خلا میں جانا اور واپس آنا۔ فکرِ فردا سے جوڑا جاسکتا ہے میں نے یہ تذکرہ ہند کے غلام مرتضیٰ راہی سے کیا تو وہ مصر ہوئے کہ یہ نعت اُنہیں روانہ کی جائے۔ لہٰذا یہ چھوڑ کر نعت مکمل کی اور اُن کو بھیج دی۔ باقی اشعار کا انتظار چہارسو والے کریں۔ شائد ہند میں کہیں چھپ گئی ہے ویسے بھی میرا یہ نامہ کون پڑھے گا۔ یوں بھی چہارسو اب انٹرنیٹ کے حوالے کیا جانے والا ہے۔

ہیں انٹرنیٹ یہ افلاطون بچے
بزرگوں میں وہ دانائی نہیں ہے

ابھی یہی لکھ پایا تھا کہ ماضی سے ایک آواز آئی۔ ابوالحسن نقمی صاحب کا ورجینیا سے ٹیلی فون تھا۔ بولے کہ ۳۱ جولائی کو تمہیں میری طرف آنا ہے۔ آؤ اور آکر ہماری محفل میں شرکت کرو۔ اُن کو میں اپنے بچپن سے جانتا ہوں جب وہ ریڈیو پاکستان سے متعلق تھے اور میں کبھی کبھی ریڈیو سے نشر ہونے والے پروگراموں میں کسی بچے کی آواز بن کر اُن کو نظر آتا تھا۔ لہٰذا اُن سے ملنے جانا پڑا۔ اُن کی محفل کی خاص بات یہ ہے کہ 1:30 بجے دوپہر کو شروع ہو کر 4:30 پر ختم ہو جاتی ہے۔ کوئی آئے یا نہ آئے وقت کی پابندی بہت ضروری ہے۔ دیکھئے کہ آج کل کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہیں۔ اِسی محفل میں ستیہ پال آنند صاحب بھی موجود تھے۔ چند منٹ کو ''چہارسو'' کا بھی تذکرہ ہوا۔ جناب عبد الرحمان صدیقی صاحب جنہوں نے ''لنک'' کی بنیاد رکھی تھی تشریف لائے۔ وہ اُس روز ایک مقالہ پڑھ رہے تھے عنوان تھا ''آٹھواں سُر'' جسکا تعلق مرحوم موسیقار ہند کے نوشاد کی شاعری سے متعلق تھا۔ دل میں خیال آیا کہ میری چھٹی حس اور اُن کا آٹھواں سُر ہی دنیا کو اپنے محور پر چلا رہے ہیں۔ پھر عبد الرحمٰن صدیقی صاحب کے بعد میری باری آئی تو میں نے اپنی آنے والی انگریزی کتاب جو کہ مریخ پر ہے کا تذکرہ کیا اور کچھ اشعار مریخ سے متعلق پیش کیے۔ تھوڑی سی روشنی سائنسی مسئلوں پر بھی ڈالی اور یوں اس محفل کا اختتام ہوا۔

ہم گھر ساڑھے تین سو میل کا سفر کر کے واپس پہنچے تو تمام سائل اپنی جگہ موجود تھے۔ اور گلزار جاوید کی توانائی اور اُن کی ای میل پر یاد دہانیوں نے میری ساری توانائی سلب کر لی تھی۔ پتہ نہیں کہ گلزار جاوید کو ہم سے کیوں اتنی محبت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک (امریکہ) میں جب بھی پاکستان کا تذکرہ ہوتا ہے تو صرف قتل وغارت کی بات ہوتی ہے حالانکہ میں اگر سائنسدان بن کر سوچوں تو تمام تر مسائل کے باوجود پاکستان میں قتل ہونے والوں کی تعداد چاہے وہ عام جُرم ہو یا سیاسی قتل وغارت ہو۔ امریکہ اب بھی لیڈر ہے یعنی آبادی کے تناسب کو دیکھتے ہوئے۔ امریکہ میں قتل وغارت تمام ملکوں سے زیادہ ہے۔ یہ میرے لئے اچھی خبر نہیں۔

باقی صفحہ ۱۱۴ پر ملاحظہ فرمایئے

''مجلسِ شورہ''

قابل اور دانشمند لوگ

ستیہ پال آنند
(یو۔ایس۔اے)

''کوئی سیّارہ تو اپنے آپ یوں پھٹتا نہیں ہے
اک دھماکے سے کبھی یوں
ریزہ ریزہ ہو کے اڑتا تو نہیں گہرے خلا میں
اس طرح کے حادثے دیکھے نہیں عالم میں ہم نے
اس لیے ثابت ہوا یہ
ٹکڑے ٹکڑے ہونے والی اس زمیں پر
کوئی قابل اور دانشمند ہی مخلوق ہوگی
جس سے یہ ممکن ہوا ہے ....''

روشنی کے لاکھ برسوں سے بھی زائد فاصلے پر
ایک سیّارے کے سائنسدان نے سارے حوالوں
اور فلک پر اس دھماکے کی سلائیڈوں سے مزین
اک مقالہ جب مکمل کر لیا، تو
جامعہ کے آسٹرونومی ماہروں کی مجلسِ شورہ کو بھیجا۔

.....

روشنی کا برس: A Light Year

○

انتظاریہ

توصیف تبسم
(اسلام آباد)

چمن چمن میں پرفشاں،
خزاں کے جبر کی طویل داستاں،
کہاں ہے صبحِ نو بہار؟
کلی کلی کی آنکھ نم،
اُداس اُداس سنبلوں کے پیچ و خم،
روش روش ہے سوگوار!
گلوں کے لب سیئے ہوئے،
فردہ گل خموش ہیں لیے ہوئے،
نظر میں شامِ انتظار،
اُداس، بیکراں، ملول۔
کبھی تو کھل کے مُسکرا سکیں گے پھول،
کبھی تو آئے گی بہار!

○

پڑوسی

گلزار
(ممبئی بھارت)

جب تک میرے سامنے والے گھر میں روشنی جلتی ہے
میرے کمرے کی دیوار پہ
اُس گھر کی پرچھائیاں چلتی رہتی ہیں

اک ''وہیل چیئر'' ہے
دھکّا کھا کے دائیں بائیں گھومتی رہتی ہے
اُس گھر کی دو پالتو چڑیاں اُڑتی ہیں تو میری اِس دیوار سے ٹکرا جاتی ہیں
اُس گھر میں لٹکا اک پنجرہ، میرے گھر کا پنجرہ لگتا ہے

جانے کون سی کھڑکی بند ہوتی ہے، جس کی جالی سے
دیوار پہ جیل کا دروازہ بن جاتا ہے
آتے جاتے لوگ سبھی قیدی لگتے ہیں

ننگا لٹکا بلب کبھی ہل جائے تو
لوگ ہوا میں اُڑنے لگتے ہیں
اک سرکس لگ جاتی ہے
کچھ دیر غدر مچ جاتا ہے

پھر وہ کھڑکی کُھل جاتی ہے
اور کوئی بتّی جلتی ہے
دو جھومتے سایے لپٹے لپٹے، بالکنی میں، آ کے کھڑے ہو جاتے ہیں
شاید میرے گھر کی جانب دیکھ رہے ہیں

کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے
اُس گھر کے دُھوئیں کی پرچھائیں، میری دیوار پہ پڑتی ہے
تب لگتا ہے۔۔۔
دونوں گھروں میں آگ لگی ہے!!

○

خدا کی تلاش

منظور ثاقب
(فیصل آباد)

جس کے پاس
پیٹ بھر۔۔۔کھانا نہیں
سر پر۔۔۔چھت نہیں
بیماری میں۔۔۔دوا نہیں
وہ اگر زندہ ہے۔۔۔تو
بے موت مرنے کے لیے
بصد دشواری
جسم و جاں کا رشتہ قائم رکھنے کے بعد
اس کے پاس کتنا وقت بچے گا؟
دنیا کے فلسفیوں کے خیالات جاننے
اور۔۔۔کسی خدا کی تلاش کے لیے
لیکن البتہ۔۔۔صاحبِ ثروت لوگ
جن کا مستقبل محفوظ ہے
وہ۔۔۔وقت رکھتے ہیں
کہ۔۔۔خدا کی تلاش کریں
اکثر نے۔۔۔خدا پا بھی لیا ہے
وہ۔۔۔رات کی تنہائی میں
اپنے ''خدا''۔۔۔کے ساتھ ہوتے ہیں
سارے دن کی کمائی ہوئی
اپنی۔۔۔دولت کے ساتھ

○

آہ سرفرازؔ شاہ

یونس صابر

(پشاور)

پڑھ کے خبریں سندھ کی شہ سُرخیوں کے درمیاں
دم گھُٹا جاتا ہے دل کی دھڑکنوں کے درمیاں

کوئی بھی آگے نہ آیا اور تنہا سرفرازؔ
گولیاں کھاتا رہا، ہم شہریوں کے درمیاں

آہ اُس کی بے بسی، منظر تھا کیسا دیدنی
راہگیروں اور محافظ رینجروں کے درمیاں

رُوح قائدؔ پر گذرتی ہوگی کیا کیا دیکھ کر
آئے دن اُٹھتے جنازے بستیوں کے درمیاں

شکر ہے مظلوم کو انصاف کا حق مل گیا
پیار بڑھتا جائے اپنے بھائیوں کے درمیاں

○

ایک مہمان، ماہِ رمضان

ارشاد عرشی ملک (اسلام آباد)

سال میں بس اِک دفعہ آتا ہے یہ مہمان بھی
لوٹ کر جانے کو ہے کچھ روز میں رمضان بھی
فضل و بخشش کا رواں دریا ہے یہ ماہِ کریم
اس مقدس ماہ میں نازل ہوا قرآن بھی
کچھ کو دے جاتا ہے یہ قربِ خدا کی لذتیں
اور کچھ کے واسطے دُوری کا ہے امکان بھی
جھولیاں بھر لیں کسی نے کوئی خالی رہ گیا
سب کی قسمت میں نہیں یہ نعمتِ رحمان بھی
کچھ نے تو چاؤ سے کی آؤ بھگت رمضان کی
کچھ کو ہو پائی نہ پر اِس نور کی پہچان بھی
پیٹ پوجا تو ہوئی پر روح بھوکی رہ گئی
آسماں سے گرچہ اُترا نعمتوں کا خوان بھی
خوش نصیبوں کے لئے جنت کا دروازہ ہے جو
کم نصیبوں کے لئے وہ ہے درِ زندان بھی
لاکھ بارش ہو مگر بھرتے نہیں اوندھے گھڑے
ٹوٹ کر برسا کرے گو رات دن باران بھی
تم کو اپنی تنگ دامانی کا شکوہ ہے عبث
ہے خدا کے پاس علاجِ تنگیِ دامان بھی
پاک ہونے کا گناہوں سے ہے آساں راستہ
اور پھر حسنات میں بڑھنے کا ہے میدان بھی
قبل اس کے لوٹ جائے یہ مقدس میہماں
اور پیچھے چھوڑ جائے حسرت و حرمان بھی
دوڑو بھاگو کوئی تو عشرہ پکڑ لو غافلو
سُستیوں میں کھو نہ جائے جادۂ آسان بھی
جانے ہم پائیں کہ نہ پائیں اِسے اگلے برس
یہ خدا کا فضل بھی، انعام بھی، احسان بھی
پَر لگے ہوں جس طرح ایّام معدودات کو
اُڑ گئے عرشیؔ یہ دن کر کے ہمیں حیران بھی

ترانے

(رباعی کے اوزان میں تین مصرعی نظمیں)

کوثر صدیقی

(بھوپال، بھارت)

(۱)

سر بادِ مخالف میں اُٹھانا سیکھو
جو کام ہے طوفاں کا اُسے کرنے دو
تم اپنے سفینوں کو چلانا سیکھو

(۲)

رُک جاؤ ابھی رات بہت باقی ہے
پل بھر میں نہ کہہ پاؤں گا میں قصۂ غم
کہنے کے لیے بات بہت باقی ہے

(۳)

مر کے بھی نہ آساں ہوئی میری مشکل
تھا قتل کا الزام تو دشمن پہ مگر
تفتیش میں نکلا میں خود اپنا قاتل

(۴)

تشریحِ غمِ جاں نہیں کر پاتا ہوں
کچھ کہنے کو میں جب بھی بڑھاتا ہوں قدم
الفاظ کے کانٹوں میں الجھ جاتا ہوں

(۵)

گلزار کی تصویر بدلنی ہوگی
جس آگ سے پیڑوں کو حرارت نہ ملے
اُس آگ کی تاثیر بدلنی ہوگی

(۶)

تخلیق ادب کی نہیں ہوتی کوثر
آنکھوں سے لہو نوکِ قلم پر جب تک
الفاظ کی صورت میں نہ آئے ڈھل کر

(۷)

کمزوری بڑا جُرم ہے گھر میں بیٹھو
مانجھا نہیں مضبوط تو پھر کاہے کے پیچ
اوروں کی پتنگوں کا تماشا دیکھو

(۸)

گلشن میں گُل نغمہ کی مانند چہک
غنچے کی طرح خول میں محصور نہ ہو
پھولوں کی طرح خوب مہک خوب مہک

(۹)

ورثے میں ملے ہیں مجھے کچھ ایسے دیے
بس میں نہیں میرے جنہیں روشن کرنا
ملتا ہی نہیں تیل جلانے کے لیے

(۱۰)

اس تلخ حقیقت پہ ہیں آنکھیں حیران
صنّاع کی تخلیق میں خامی نہیں لیکن
ملتا نہیں کوئی بھی مکمل انسان

ہائیکو

انوار فیروز
(راولپنڈی)

مُنہ پرتالے ہیں
کیسا روز یہ آیا ہے
دن بھی کالے ہیں

مہنگا ہے آٹا
پھر بھی سب خاموش ہیں کیوں
ہر سُو سناٹا

یہ بادل کالے ہیں
ظلمت سے گھبرائیں کیا
ہم سورج کے پالے ہیں

ہر سُو آہیں نالے ہیں
کِس سے کریں فریاد بتاؤ
اب انصاف پہ تالے ہیں

کچھ تو بولو یار
روز ہوئی جاتی ہے اونچی
زنداں کی دیوار

قفلِ خموشی کھولو نا
کِتنا ظلم سہا ہے تم نے
کچھ تو بولو نا

○

''کوئی اپنا ہوتا''

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ
(کناڈا)

حسرت ہے کوئی اپنا ہوتا
گد گداتا، اٹھکیلیاں کرتا، رُوٹھ جاتا تو مناتا مجھکو
جھانکتا میرے احساس کے دریچوں سے مجھے، سینے سے لگتا، کہتا
کیا ناراض ہو مجھ سے، بولو نا، یوں گُم صُم نہ رہو، یوں چُپ نہ رہو،
جان جاتی ہے تمہیں دیکھتے یوں بیٹھے ہوئے، گاہے گاہے
کاش، اے کاش!

مجھکو خوف نہیں تنہائی کا، نہ ہی ڈستا ہے اکیلا پن بھی کبھی
ایک حسرت ہے، کوئی اپنا ہوتا، میرا اپنا،
تڑپ اُٹھتا مجھ میں اُترنے کے لیے، روح میں سرائیت کرتا،
کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں۔
جسے بھی چاہا، ٹوٹ کر چاہا میں نے، کہ سرشت میں ہے ایک لافانی
جذبۂ الفت، محبت، لامتناہی محبت۔ پھر بھی آج کوئی نہیں
جسکو میں اپنا کہوں، سرتاپا مکمل میرا اپنا ہو۔
مجھکو محسوس کرے، میرے درد کی تہہ ناپے، میرے اندر جھانکے
مگر کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں۔۔!!

○

چاند چہرہ

(نذرِ قائداعظم)

حسن عسکری کاظمی

(لاہور)

وہ چاند چہرہ سر شام جگمگانے لگا
اسی کے نور کی تابندگی ہے چہروں پر
بساطِ دل پہ بچھی چاندنی خیالوں کی
لرزتے ہونٹوں پہ مہکتے گلاب یادوں کے
اسی کے دم سے ہے احساس کا نگر آباد
اسی کا ہاتھ ہے بگڑی مری بنانے میں
اسی کی جنبشِ لب پر فدا ہوں جان ودل
اسی کے عزم سے جاگا مرے چمن کا نصیب
دعا کا زمزمہ پھوٹا لبِ عقیدت سے!
نفس نفس میں بسی اسی کے درد کی خوشبو
دیارِ دل میں رہا اس کی یاد کا موسم
یہ سرزمیں کہ ہے تعبیر اس کے خوابوں کی
یہاں بہار کے خیمے ہمیشہ نصب رہیں
اسے خبر ہے مرے حال کی خدا جانے!
کہ میں نے جب بھی پکارا اسے محبت سے
تو اس کی آنکھ میں شفقت کا آئینہ دیکھا
جھلکتا پایا ہے جس میں یقینِ مستقبل
زبانِ شاعرِ مشرق میں ہے وہی شاہیں
وہ میرا قائد اعظمؒ وہ زندگی کا نقیب!
اسی کے ناخنِ تدبیر سے کھلا زنداں
اسی کا عزمِ قیادت بنا ہے وجہِ نجات
اسی کے ہاتھ میں ذوقِ یقیں کا پرچم ہے
اسی کے در پہ عقیدت کی آنکھ پُرنم ہے

○

کہنیں تصویریں دِکھلائیں

رب نواز مائل

(کوئٹہ)

کہنیں تصویریں دِکھلائیں
یہ اپنے ہاتھوں کی کچھ اِس
تصوّر میں
سراہیں گے انہیں از بس
وہ کیسے سُرخ لفظوں میں
وہ کیسے نیلے لفظوں میں
وہ کیسے اور بھی رنگوں
کے لفظوں میں
یہ جب وہ چپ رہیں گے تو
یہ بولیں گے
کہ کیا ہم نے یہ تصویریں بنائی ہیں
کہ جن کو پوچھتا کب کوئی بھی تو ہے
یہاں شاہ و گدا تک فن، ہی کا گویا سبھی ہو کر

○

ماضی کے اسیر

جہانگیر اشرف
(برمنگھم، برطانیہ)

تقدّس کا نورانی لباس پہنے
عقیدتوں کے چراغ لیکر
عہدِ رفتہ کے تاریک غاروں میں
اپنے آباء کے چھوڑے
چھپے خزانوں کو ڈھونڈتے ہیں۔

امرت دھارا کی آس لیکر
کوہ قاف کے لامنتاء
سنگلاخ پگڈنڈیوں پر چلتے ہیں۔

گوآنے والا کل
آکاش کی مانند
بانہیں پھیلائے
ان گنت کہکشاؤں کو اپنے اندر سمیٹے
آواز دے رہا ہے

مگر ہم ہیں کہ عہدِ حاضر سے آنکھیں چرائے
ماضی کے تاریک غاروں میں
اپنے آباء کے چھوڑے
چھپے خزانوں کو ڈھونڈتے ہیں

○

یہ جو خاک سے اُبھری ہے۔۔۔

سخت سخت راہوں پر
چلتے وہ بے خبر قدم۔۔
دھڑکنوں میں طوفاں
اور۔۔۔آنکھیں بھی نم۔۔۔
ہر رُت
ہر دَور میں
خوشبوئیں وہ چنتی
ہوئی
یوں آبلہ پا ہوئی
خوشبوئیں اُس کی تمام خاک ہوئیں
اور۔۔۔اِسی خاک
ہی سے۔۔۔جانے کس
طاقت سے
اک عجب چھب
اُبھری ہے
جہاں کا ہر رنگ۔۔۔
ہر رُوپ جو۔۔۔
اس طرح دیکھتی ہے
دیکھے جیسے تماشہ کوئی
اور۔۔۔اُس پر
خوب خوب ہنستی ہے
اپنی دُھن میں
وہ مگن
پھول کلیاں چنتی ہوئی
گنگناتی گزرتی ہے۔۔
یہ جو خاک سے
اُبھری ہے
عجب یہ بنجارن ہے
یہ اک ننھی
بنجارن ہے۔۔۔!

روپا صبا
(چندی گڑھ، بھارت)

ایک صدی کا قصہ

نتن بوس

دیپک کنول
(ممبئی، بھارت)

بنگال کی زمین بڑی مردم خیز رہی ہے۔اس مٹی نے ایسے نایاب ہیرے پیدا کئے ہیں جن کے کام نے اس ملک کو نہ صرف وقار بخشا بلکہ دنیا میں اس ملک کا نام سر بلند کیا۔وہ چاہے ستیہ جیت رائے ہو، رابندر ناتھ ٹیگور ہو، سبھاش چندر بوس ہو، یا بمل رائے ہو۔ان ہی برگزیدہ شخصیتوں میں ایک اور نام ہے جس نے فلم سازی کے فن کو جلا بخشی۔انمول رتنوں میں سے ایک رتن ایسا ہے جسکا نام نتن بوس ہے۔نتن بوس کو آج کی پود بھلے ہی فراموش کر چکی ہو مگر فلمی اتہاس جب بھی لکھا جائے گا تو نتن بوس کا ذکر کئے بنا یہ اتہاس ادھورا ہوگا۔

نتن بوس 24 اپریل 1897 کو کلکتہ میں پیدا ہوا۔اُنکے والد ہیمند رموہن بوس ٹھیکداری کا کام کرتا تھا۔ٹھیکداری کے علاوہ وہ خالی اوقات میں فوٹوگرافی کا شوق بھی پورا کرتا تھا۔وہ کہتے ہیں نا کہ ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات۔ننھے نتن کو بچپن سے ہی فوٹوگرافی کا شوق پیدا ہوا۔باپ نے جب نتن میں فوٹوگرافی کا میلان پایا تو اُس نے اُس کے شوق کو مہمیز کیا۔اُسنے اُسے ایک کیمرہ لے کے دیا اور وہ گھنٹوں اُسے اپنے سامنے بٹھا کر فوٹوگرافی کی باریکیاں سمجھایا کرتا تھا۔

نتن بوس کو فلم ڈائرکشن میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی پر کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بن مانگے موتی ملے، مانگے ملے نہ بھیک۔جس کام میں اُسے رغبت تھی وہ تو نہیں ملا۔ملا کچھ اور۔1921 میں نتن بوس نے فلم ہدایت کاری کے میدان میں پہلا قدم رکھا۔اُسے بلجین کے شہنشاہ کے دورہ ہند کے اوپر بنائے جانے والی ڈاکومینٹری کو ڈائرکٹ کرنے کی آفر ملی۔روٹی روزی کا سوال تھا اسلئے اُس نے یہ پیشکش قبول کی۔دراصل نتن بوس کا رجحان ہدایت کاری سے کہیں زیادہ فوٹوگرافی میں تھا۔بہر حال اُسکی یہ خواہش سن 1926 میں پوری ہوئی جب اُسے ایک بنگالی فلم ''پنو رجانامہ'' کی فوٹو گرافی کرنے کا چانس مل گیا۔1932 میں اُسے رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ کام کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔اُنکی ہدایت میں بننے والی فلم ''ناترپوجا'' کی عکس بندی کا ذمہ اُسے سونپا گیا۔یہ ٹیگور کی پہلی اور آخری فلم تھی جو ناچ اور ڈرامے پر مبنی تھی۔

نتن بوس ''نیو تھیٹرس'' کے ساتھ جڑ گیا۔اُسے دیبکا کمار بوس کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔دیبکا بوس ''نیو تھیٹرس'' کے روح رواں تھے۔اُن دنوں اُنکی طوطی بولتی تھی۔دیبکا بوس کو وقتی طور پر ''نیو تھیٹرس'' کو چھوڑ کو ''مدن تھیٹرس'' میں جانا پڑا جہاں اُسنے فلم ''سیتا'' پوری کی۔''نیو تھیٹرس'' کے مالک بی۔این۔سرکار کے پاس کوئی قابل ڈائرکٹر نہ تھا۔وہ نتن بوس کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو پہچان چکا تھا۔اُسنے بوس کو ہدایت کاری کی طرف مائل کیا۔1934 میں نتن بوس نے دیبکا بوس کی بنگالی فلم ''چندی داس'' کو ہندی میں بنانے کی پہل کی۔

1935 میں بوس نے ایک اہم کارنامہ انجام دیا۔اُسنے اپنی بنگالی فلم ''بھاگیہ چکرا'' میں پہلی مرتبہ پلے بیک گانے کا استعمال کر کے ایک نئی تاریخ رچ ڈالی۔یہ گانے کے۔سی۔ڈے، پرل گھوش اور سپر بھا سرکار کی آواز میں فلم بندی سے پہلے ریکارڈ کئے گئے تھے۔بعد میں اسی فلم کو ''دھوپ چھاؤں'' کے نام سے ہندی میں بھی بنایا گیا۔اس میں بھی پلے بیک گانے کا استعمال کیا گیا۔ہندی میں بھی یہ پہلی فلم تھی جسمیں پلے بیک کا تجربہ کیا گیا تھا۔یہ سب کچھ نتن بوس کی کاوشوں کا ثمر تھا کہ فلمیں ارتقائی منازل کی طرف بڑھ رہی تھیں۔اس کام کو انجام تک پہونچانے کے لئے نتن بوس نے موسیقار رائے چند بورل سے مشورہ کر کے اس طرح کا تجربہ کرنے کی پہل کی۔کام خاصا مشکل تھا۔اور بھی کئی فلم ٹیکنیشنز نے اس طرح کا تجربہ کرنے کی سعی کی تھی لیکن کسی کو کامیابی نہ ملی۔نتن بوس نے دن رات ایک کیا۔وہ ناممکن کو ممکن بنانے کا تہیہ کئے بیٹھا تھا۔اس کام میں بوس کے بھائی موکل بوس نے اپنے بڑے بھائی کا خوب ساتھ دیا۔مکل بوس ''نیو تھیٹرس'' میں ساونڈ ریکارڈسٹ تھا۔وہ اگر اپنے بھائی کو اپنا بھرپور تعاون نہ دیتا تو بوس کا یہ خواب کبھی بھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا تھا۔اس تجربے کے کامیاب ہونے کے ساتھ ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔فلمی سنگیت میں ایک طوفانی بدلاؤ آ گیا۔بے سرے ہیرو ہیروئنوں کی جگہ پیشہ ور گلوکاروں نے اپنی میٹھی، مدھر آواز سے فلم بینوں کو محظوظ کیا۔فلم انڈسٹری نتن بوس کی ہمیشہ مرہون منت رہے گی کہ اُس نے پلے بیک کو ایجاد کر کے نہ صرف ایک نئی تاریخ مرتب کی بلکہ ہندوستانی سنگیت کو نئی رفعت اور وسعت دی۔

نتن بوس 1943 تک ''نیو تھیٹرس'' کے ساتھ جڑا رہا۔فلم ''کاشی ناتھ'' کی فلم بندی کے دوران بی۔این۔سرکار اور نتن بوس میں کچھ اختلافات پیدا ہو گئے جن کے سبب وہ ''نیو تھیٹرس'' میں گھٹن سی محسوس کرنے لگا۔نتن بوس اپنے پیشے کے ساتھ بے ایمانی نہیں کرنا چاہتا تھا اسلئے اُسنے فلم ''کاشی ناتھ'' کو مکمل کرنے کے بعد ''نیو تھیٹرس'' کو خیر باد کہا اور بمبئی چلا آیا۔وہ 1931 سے اس کمپنی کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔دونوں کے بیچ آپسی رشتوں میں اسقدر تلخی اور کڑواہٹ

درآئی تھی کہ ایک بار جو بوس نے کمپنی کو چھوڑنے کی ٹھانی تو اُسکے بعد اُس نے پلٹ کے بھی نہیں دیکھا۔اُسکا ''نیوتھیٹرس'' کو چھوڑ کے چلا جانا بی۔این۔سرکار کے لئے بہت بڑا زیاں تھا۔وہ اتنے مایوس اور دل برداشتہ ہوئے کہ اُسنے بوس کے جانے کے بعد اپنی فلم کمپنی ''نیوتھیٹرس'' کو ہمیشہ کے لئے تالا لگا دیا۔

بوس بمبئی آنے کے بعد ''بمبئی ٹاکیز'' کے ساتھ جڑ گیا۔اُس نے رابندر ناتھ ٹیگور کے شہرہ آفاق ناول ''ناوکا ڈوبی'' پر 1947 میں اسی نام سے ''بمبئی ٹاکیز کے لئے ایک بنگالی فلم بنائی جس کی کامیابی دیکھ کر اسے ہندی میں بھی بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔فلم کا ٹائٹل ''ملن'' رکھا گیا۔اس فلم میں دلیپ کمار کو مرکزی کردار میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔اُن دنوں دلیپ کمار کا ستارہ گردش میں تھا۔اُسکی دو فلمیں بری طرح ناکام ہوئی تھیں۔فلمی نقادوں نے تو اُسے فلمی اداکاری کے ناقابل قرار دیا تھا۔یہ فلمیں تھیں امیہ چکرورتی کی ہدایت میں بنی فلم ''جوار بھاٹا'' اور پی جے راج کی فلم ''پرتیما''۔دونوں فلمیں ''بمبئی ٹاکیز'' کی تھیں۔نتن بوس کو اپنے ہیرو کی صلاحیتوں پر پورا پورا بھروسہ تھا اسلئے وہ ہیرو کے طور پر دلیپ کمار کو ہی لینے کے لئے بضد رہے۔فلم جب بن کر ریلیز ہوئی تو اس فلم نے ملک بھر میں تہلکہ مچا دیا۔دلیپ کمار کے حریفوں کا منہ بند ہو گیا۔وہ راتوں رات اسٹار بن گیا۔جن لوگوں کو دلیپ کمار کے کام میں کھوٹ ہی کھوٹ نظر آتی تھی اب وہی دلیپ کمار کے گن گانے لگے۔فلم انڈسٹری نتن بوس کی ہمیشہ مرہون منت رہے گی کہ اُس نے ایک عظیم فن کار کو ناکامی کے منجدھار میں غرق ہونے سے بچالیا۔اُسنے دلیپ کمار کی صلاحیتوں کو اُجاگر کیا اور انڈسٹری کو ایک ایسا نایاب ہیرا پیش کیا جس نے اپنے فن کو معراج تک پہونچا دیا۔یہ وہی دلیپ کمار ہے جو اب فلمی اداکاری کے اسکول کے طور جانا جاتا ہے۔

1948 میں نتن بوس نے بنگالی فلم ''درشٹ دان'' بنائی جسمیں اُس نے بنگال کے ایک خوبرو نوجوان کو پہلی بار سینما کے پردے پر متعارف کیا۔اس نوجوان کا نام اُتم کمار تھا جو بعد میں بنگالی سینما کا سپر اسٹار بنا رہا۔وہ کئی دہائیوں تک بنگالی سینما پہ غالب رہا۔بنگالی فلم بین اس ہیرو کی پوجا کیا کرتے تھے۔آج بھی بنگال میں اُتم کمار کی پرستش ہوتی ہے۔

نتن بوس کو کلا ورثے میں ملی تھی۔اُن کی ماں مالنی مرنالنی بنگال کے جانے مانے ساہتیہ کار اُپندرا کشور رائے چودھری کی بہن تھی جو کہ بنگالی کوی سوکمار رے کا والد تھا۔بین الاقوامی شہرت یافتہ ڈائرکٹر ستیہ جیت رے اُپندر کشور رے کا پوتا اور سوکمار کا بیٹا تھا۔ستیہ جیت رے نتن بوس کا بھانجا تھا۔1950 میں رے نے ''بمبئی ٹاکیز'' کی فلم ''مشعل'' میں نتن بوس کے معاون ہدایت کار کے طور پر کام کیا۔بمل رائے بھی نتن بوس کی نگرانی میں کئی برس تک کام کرتا رہا اور یہیں پر وہ نمو پا گیا۔اپنے گورو سے اُس نے بہت کچھ سیکھا جسکا وہ کھلے دل سے اعتراف کرتا تھا۔

''ملن'' کی ریکارڈ توڑ کامیابی کے بعد نتن بوس نے دلیپ کمار کے ساتھ ایک اور فلم ''دیدار'' کی۔اشوک کمار،نرگس اور دلیپ کمار کی تکونی پریم کہانی،ایک یادگار فلم ہے۔1951 میں بنی یہ فلم اُس زمانے کی ملٹی اسٹار فلم تھی جس میں ان تینوں کے علاوہ نمی نے بھی ایک ناقابل فراموش رول ادا کیا تھا۔اس فلم میں دلیپ کمار نے ایک اندھے عاشق کا کردار ادا کیا۔مجھے یاد ہے کہ ایک بار جب دلیپ صاحب محبوب صاحب کا ذکر کر رہے تھے تو باتوں باتوں میں وہ ''دیدار'' کے کردار کے بارے میں یہ انکشاف کر گئے کی جب نتن بوس نے اُنہیں یہ رول پیش کیا تو وہ کئی دنوں تک اس پریشانی میں رہے کہ آیا وہ اس رول کے لئے حامی بھریں یا نہیں کیونکہ اندھے کا رول ادا کرنا اُنہیں قدرے مشکل نظر آرہا تھا۔وہ جا کر محبوب صاحب سے ملے اور اُنہیں اپنی اس اُلجھن سے آگاہ کر دیا۔محبوب صاحب نے اُنہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ امپیریل تھیٹر جا کر اُس اندھے بھکاری سے ملیں جو وہاں بیٹھ کر بھیک مانگتا ہے۔وہ اُس کا قریب سے مشاہدہ کرے۔اُسکے لئے کام کرنا آسان ہو جائے گا۔دلیپ صاحب نے اپنے گورو کی بات مان لی اور کئی ہفتوں تک وہ امپیریل تھیٹر جا کر اُس بھکاری سے ملتے رہے اور اُس کے بعد جب اُنہوں نے اندھے کا رول کیا تو فلم جگت اس کی اداکاری دیکھ کر دنگ رہ گیا۔فلم ''دیدار'' نتن بوس کی یادگار فلموں میں سے ایک ہے جس کا نہ صرف صدا بہار سنگیت آج بھی کانوں میں رس گھولتا ہے بلکہ اُس کا ایک ایک سین دیکھنے والے کو خون کے آنسو رلا دیتا تھا۔اتنی جذباتی کہانی اس فلم میں پیش کی گئی تھی جس میں ان تین مہارتھیوں نے رنگ آمیزی کی تھی۔

1953 میں نتن بوس نے فلم ''دردِ دل'' بنائی۔1954 میں فلم ''وارث'' 1955 میں ''امر سہگل'' 1956 میں ''چار دوست'' اور 1957 میں فلم ''کٹھ پتلی'' بنا کر اُنہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ سماجی موضوعات کو پیش کرنے میں کسقدر مہارت رکھتے ہیں۔''کٹھ پتلی'' ایک حساس فلم تھی جسکو اپنی سحر انگیز موسیقی سے شنکر جے کشن نے سنوارا تھا۔

ساٹھ کی دہائی میں دلیپ کمار نے فلم سازی کے میدان میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا۔فلم ''مغل اعظم'' کے فائنانسر شاہ پورجی پالن پورجی کے ساتھ اُنکے دوستانہ مراسم تھے۔اُن ہی کی شہہ پر اُنہوں نے اپنی فلم کمپنی کھولنے کا فیصلہ کیا۔اُن کے پاس ایک کہانی تھی جسے وہ اپنے حساب سے بنانا چاہتے تھے۔یعنی وہ فلم کو حقیقی رنگ میں پیش کر کے اس کے مکالمے بھوجپوری میں لکھوانا چاہتے تھے۔اُنکے جتنے بھی قریبی لوگ تھے اُن سب نے دلیپ صاحب کو منع کیا کہ وہ بھوجپوری زبان میں فلم بنا کر اپنے کیریر کو داو پر نہ لگائیں۔اختلاف کرنے والوں میں گھر کے لوگ بھی شامل تھے۔دلیپ صاحب اپنی ضد کے پکے ہیں۔جب وہ کوئی چیز کرنے کی ٹھان لیتے ہیں تو دنیا چاہے ادھر کی اُدھر ہو جائے وہ اپنا فیصلہ کسی کے کہنے سے یا کسی کے دباو میں آکر نہیں بدلتے۔اُنہوں نے جب اپنا فلمساز ادارہ ''سٹی زن فلمز'' کے نام سے شروع کیا تو وہ اپنے محسن کو نہیں بھولے۔اُنہوں نے شروع سے ہی یہ فیصلہ کر کے رکھا تھا

کہ جب بھی وہ خود کوئی فلم پرڈیوس کریں گے تو اسکی ڈائرکشن وہ نتن بوس سے ہی کروائیں گے۔ 1961 میں فلم ''گنگا جمنا'' کی ہدایت کاری کی کمان نتن بوس کو سونپی گئی۔۔ یہ وہ دور تھا جب دلیپ کمار کا ستارہ اپنے پورے عروج پر تھا۔ تمام تر مخالفت کے باوجود اُنہوں نے وہی کیا جو وہ کرنا چاہتے تھے۔ اس فلم کے لئے دلیپ صاحب نے وجاہت مرزا سے فلم کے سارے ڈائیلاگ بھوجپوری زبان میں لکھوائے۔ اس فلم کو مکمل کرنے میں دلیپ صاحب نے اپنا سب کچھ داو پر لگا دیا پر فلم میں کوئی کمی کسر رہنے نہ دی۔ فلم بننے تک دلیپ صاحب گلے گلے تک قرض میں ڈوبے ہوئے تھے۔ فلم جیسے تیسے پوری ہو کے جب سنسر میں چلی گئی تو سنسر نے فلم میں ایک سو بیس کے قریب کٹ دئے۔ اتنے سارے کٹوں کے حساب سے فلم میں تو پھر کچھ بچتا ہی نہیں۔ وہ دلیپ صاحب کی زندگی کا انتہائی بد ترین دور تھا۔ وہ صبح سے شام تک سنسر بورڈ کے آفس کے باہر جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ سنسر بورڈ کے چیئرمین کو نہ جانے دلیپ صاحب سے کس جنم کا بیر تھا کہ اُنہیں ستانے میں اُسے خوب مزہ آرہا تھا۔ آخر جب بات حد سے تجاوز کر گئی تو دلیپ کمار نے ایک روز سیدھے دلی کی اُڑان بھری اور جا کر اُسوقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو سے ملے۔ نہرو جی دلیپ صاحب کے زبردست فین تھے۔ اُنہیں اُن سے ملنے میں کوئی دقت نہ ہوئی دلیپ صاحب کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر نہرو جی نے ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد فلم ''گنگا جمنا'' کے بارے میں پوچھا تو دلیپ صاحب نے اُنہیں سارا ماجرا سنا ڈالا۔ نہرو جی نے مرار جی ڈیسائی کو اُسی وقت طلب کیا۔ مرار جی بھائی اُس زمانے میں وزیر خزانہ اور نہرو جی کے دست راست تھے۔ اُنہیں یہ حکم ہوا کہ وہ کل ہی بمبئی چلے جائیں اور دلیپ صاحب کی سمسیا حل کر دیں۔

اگلے روز حکم کے مطابق وہ دلیپ صاحب کے ساتھ بمبئی پہونچ گئے۔ مرار جی بھائی نے سب سے پہلے دلیپ صاحب کے سامنے یہ شرط رکھی کہ وہ اس فلم کو ایک بار دیکھنا چاہیں گے۔ جھٹ پٹ اُنہیں فلم دکھانے کا انتظام کیا گیا۔ فلم دیکھنے کے بعد مرار جی بھائی چپ چاپ چلے گئے اور دلیپ صاحب بس دیکھتے رہ گئے۔ وہ رات اُن پر قیامت کی طرح گذری۔ وہ ایک پل بھی سو نہیں پائے۔ پوری رات اُنہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹی۔ صبح ہوتے ہی مرار جی بھائی نے اُنہیں فون کر کے اپنی رہائش گاہ پر بلوایا۔ وہ فوراً تیار ہو کے اُن کی رہائش گاہ پر پہونچ گئے۔ اُن کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ فلم کے بارے میں مرار جی بھائی کی رائے جاننے کے لئے بے چین تھے۔ مرار جی بھائی تھے کہ فلم کے بارے میں بات ہی نہیں کر رہے تھے۔ آخر دلیپ صاحب سے رہا نہ گیا۔ اُنہوں نے پوچھ ہی لیا۔ ''مرار جی بھائی۔ کل آپ فلم دیکھ کر چپ چاپ چلے گئے۔ آپ نے یہ بھی بتانے کی زحمت گوارہ نہ کی کہ فلم آپ کو کیسی لگی۔'' جواب میں مرار جی بھائی بولے ''ارے میں اُسوقت تم سے کیا بات کرتا۔ مجھ پر تو فلم کا ایسا اثر طاری تھا کہ میں آج صبح تک اُسی ہینگ اوور میں رہا۔ اب یہ بتاو کہ تم اپنی فلم میں کتنے کٹ چاہتے ہو'' دلیپ صاحب نے تین کٹ کی بات کی۔ ان تین کٹ میں وہ سالے کا لفظ بھی نکالنا چاہتے تھے تو مرار جی نے اُنہیں پیار سے ڈانٹ کر کہا۔ ''سالا کیوں نکال دو گے۔ کیا بیوی کے بھائی کو سالا نہیں کہتے ہیں؟'' فلم مرار جی کی ذاتی کوشش سے صرف دو کٹ کے ساتھ پاس ہو گئی۔ یہ فلم جب ریلیز ہوئی تو فلم نے باکس آفس پر تہلکہ مچا دیا۔ فلمی نقادوں کے سارے قیافے اور اٹکلیں غلط ثابت ہوئیں۔ فلم بینوں کو یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ ہندی فلم دیکھ رہے ہیں یا بھوجپوری فلم۔ سچ بات تو یہ ہے کہ اس فلم کو بھوجپوری میں لکھے گئے مکالموں نے چار چاند لگا دئے تھے۔ ''گنگا جمنا'' نے جس قدر مقبولیت حاصل کی، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس فلم نے بکس آفس کے سارے ریکارڑ توڑ دئے۔ یہ فلم دلیپ کمار کی فلمی زندگی میں ایک سنگ میل کی حثیت رکھتی ہے۔ یہ نتن بوس کی سب سے بڑی ہٹ ہے۔

''گنگا جمنا'' کے بعد نتن بوس نے 1962 میں فلم ''اُمید'' 1963 میں فلم ''نرتکی'' 1964 میں فلم ''دھوج کا چاند'' 1966 میں ''ہم کہاں جا رہے ہیں'' اور 1972 میں فلم ''سامنا'' کو ڈائرکٹ کیا۔ ان فلموں کو ملی جلی کامیابی ملی۔ اُسکے بعد وہ واپس کلکتہ چلے گئے۔ 14 اپریل 1986 کو اس ہمہ جہت فن کار نے اپنے آبائی گھر میں زندگی کی آخری سانس لی۔ نتن بوس بلاشبہ اپنے دور کا ایک نابغہ روزگار تھا جو اس فلم انڈسٹری کو بہت کچھ دے کے چلا گیا۔

1977 میں حکومت ہند کی طرف سے نتن بوس کو دادا صاحب پھالکے ایوارڑ سے نوازا گیا۔

- بقیہ -

''نبی کا گھر منوّر ہو گیا''

ہوئی جاتی ہے صفوت ختم فکرِ کشتِ ویراں بھی

یہ لکھنے کے بعد میرا دل چاہا کہ کچھ فارسی میں لکھا جائے۔ لہٰذا فارسی کے کچھ اشعار کہہ ڈالے۔ اس لئے کہ علامہ اقبال کو لوگ صرف اُردو ہی میں یاد کرتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ فارسی میں بھی کچھ ہونا چاہیئے۔ دو اشعار ایک غزل سے:

چہ مکاں چہ مکاں چہ مثنوی ہستند
دورِ صفوت عشقِ صفوت رہنمائے مستند
لالی المکنون و مرجاں حور و غلماں مسترد
ماپسِ دنیائے می رم نان سنگِ خستند

☆

''گھر کی صورت''

مولانا الطاف حسین حالی

(●)

اُس کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے، نہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بُلبُل
کل نہ پہچان سکے گی گُلِ تر کی صورت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اِک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

واعظو! آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

کیا خبر زاہدِ قانع کو کہ کیا چیز ہے حرص
اس نے دیکھی ہی نہیں کیسۂ زر کی صورت

حملہ اپنے پہ بھی اک بعدِ ہزیمت ہے ضرور
رہ گئی ہے یہی ایک فتح و ظفر کی صورت

رہنماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا
راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت

اُن کو حالؔی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

○

عبدالمجید سالک

(●)

چراغ زندگی ہوگا فروزاں، غم نہیں ہوں گے
چمن میں آئے گی فصلِ بہاراں، ہم نہیں ہوں گے

جوانوں اب تمہارے ہاتھ میں تقدیرِ عالم ہے
تم ہی ہوگے فروغِ بزم امکاں، ہم نہیں ہوں گے

جئیں گے جو وہ دیکھیں گے بہاریں زُلفِ جاناں کی
سنوارے جائیں گے گیسوئے دوراں، ہم نہیں ہوں گے

ہمارے ڈوبنے کے بعد اُبھریں گے نئے تارے
جبیں دہر پر چھٹکے گی افشاں، ہم نہیں ہوں گے

نہ تھا اپنی ہی قسمت میں طلوعِ مہر کا جلوہ
سحر ہو جائے گی شامِ غریباں، ہم نہیں ہوں گے

اگر ماضی منوّر تھا کبھی تو ہم نہ تھے حاضر
جو مستقبل کبھی ہوگا درخشاں، ہم نہیں ہوں گے

ہمارے دور میں ڈالیں خرد نے اُلجھنیں لاکھوں
جنوں کی مشکلیں ہوں گی جب آساں، ہم نہیں ہوں گے

کہیں ہم کو دکھا دو اک کرن ہی ٹمٹماتی سی
کہ جس دن جگمگائے گا شبستاں، ہم نہیں ہوں گے

ہمارے بعد ہی خونِ شہیداں رنگ لائے گا
یہی سُرخی بنے گی زیبِ عنواں، ہم نہیں ہوں گے

○

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید

(راولپنڈی)

برادرم گلزار جاوید! آداب۔

پہلے آپ کا کرم نامہ بعد ازاں ''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ Internet پر نظر نواز ہوا۔ کرم نامے کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔ ''چہارسُو'' کے شمارے کے لیے کسی رسمی لفظ کا استعمال کر کے آپ کی محبت کے وقار کو کم کرنے کی گستاخی نہیں کروں گا۔ آپ کی محبت کا یہ قیمتی تحفہ میرے گوشۂ دل میں ہمیشہ محفوظ رہ کر اردو زبان کی جانب میری ذمہ داری کا مجھے احساس دلاتا رہے گا۔

انل ٹھکر (بھلی، بھارت)

برادرم گلزار جاوید صاحب! سلام مسنون۔

''چہارسُو'' کا جولائی اگست ۲۰۱۱ء کا شمارہ مل گیا ہے۔ اس کرم کے لیے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے ادبی صحافتی برادری میں ایک ایسی روایت کو قبول کر رکھا ہے جس پر بلا واسطہ طور پر سب عمل کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ''نقصان مایہ'' اور ''شمائت ہمسایہ'' کا واویلہ بھی مچاتے رہتے ہیں۔ ادبی پرچہ اب سٹال پر فروخت نہیں ہوتا۔ سٹال پر جائیں تو ''بک سٹالر'' فروخت شدہ پرچے کی قیمت ادا نہیں کرتا۔ چنانچہ محترم مدیر کا واویلہ بھی اکارت جاتا ہے۔ ''چہارسُو'' کا زیرِ سالانہ ''دل مضطرب نگاہِ شفیقانہ'' ہے۔ اور اس کے باطن میں جو پیغام ہے اسے دل و جان سے قبول کیا جائے تو گردن جھک جاتی ہے اور آپ کی ادبی خدمت بلکہ ''ادب پر شفقت'' کا نقش مستحکم ہو جاتا ہے۔ میں ''چہارسُو'' اور اس کے عالی ظرف مدیر کی زندگی اور صحت کی دعا کر رہا ہوں۔

آپ کے اس اقدام کی تحسین بھی ضروری ہے کہ آپ ''چہارسُو'' میں غیر ملکی اور بالخصوص ہندوستان کے ادیبوں سے متعارف کرا رہے ہیں۔ اس مرتبہ انل ٹھکر صاحب کا گوشہ دلآویز محسوس ہوا۔ دونوں ملکوں کی حکومتوں نے ڈاک کی شرح اتنی بڑھا دی ہے کہ اب کتابوں کا حصول میرے جیسے پنشنر قاری کے لیے ممکن نہیں رہا۔ ہندوستان کے بہت سے ادیب اب میرے لیے اجنبی ہو گئے۔ ''چہارسُو'' میں انل ٹھکر صاحب کے فن اور شخصیت سے ملاقات ہوئی تو اپنی محرومی کا احساس ہزار چند ہو گیا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس گوشے میں شمس الرحمٰن فاروقی، سلیم شہزاد، رؤف خیر اور نصرت ظہیر کے مضامین شائع کیے۔ ''براہِ راست'' میں انل ٹھکر بظاہر آپ کے سوالات کے جواب دے رہے ہیں لیکن دراصل وہ میرے ساتھ مخاطب ہیں۔ انل ٹھکر صاحب! آپ سے ملاقات کر کے بے پایاں خوشی ہوئی۔ ''قرطاس اعزاز'' مبارک ہو۔ ''سارک فیسٹیول'' دہلی کے منتظمین کی اس حکمتِ عملی کی جتنی داد دی جائے کم ہے کہ انہوں نے اس ''میلے'' میں پاکستان کی نئی نسل کے چند ادیبوں کو شریک ہونے کی دعوت دی اور ان ''فصلی بیٹروں'' کو نظر انداز کیا جو عمر رسیدگی کے باوجود غیر ملکی کانفرنسوں کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہے ہیں۔ اس کانفرنس کا رپورتاژ محترمہ طاہرہ اقبال نے مشاہداتی انداز میں لکھا۔ اور کانفرنس کے بارے میں عمدہ تاثر پیدا کیا۔ اس سے قبل وہ مشرقی پاکستان کا ایک رپورتاژ بھی لکھ چکی ہیں۔ جس میں ایک افسانہ نگار کی آنکھ ہر جگہ کیمرے کی صورت اختیار کرتی نظر آتی ہے۔ اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر ملال جاگ اٹھتا ہے۔ ''کلدیپ نیئر اور پیر صاحب'' میں گلزار افسانہ نگار کم اور حقیقت نگار زیادہ نظر آتے ہیں۔ اس کا ''فارمیٹ'' بھی رپورتاژ کا ہے اور وہ منظر عجب کیفیت پیدا کرتا ہے جب واحد متکلم (یعنی راوی) وہ چادر جو اپنے ساتھ پاکستان لے گیا تھا دہلی واپس جا کر نظام الدین اولیاء کی درگاہ پر چڑھا دیتا ہے''۔

آپ کو خبر مل چکی ہو گی کہ افتخار نسیم شکاگو میں انتقال کر گئے۔ انہوں نے عنفوانِ شباب میں فیصل آباد کو غزل کے افق پر تابندگی عطا کی تھی۔ خلیق قریشی کا یہ فرزند اس شہر کے نوجوان شعراء عدیم ہاشمی، ریاض مجید، احسن زاہدی، سلیم بے تاب اور انور محمود خالد کے ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا کے رسالہ ''اوراق'' میں اپنی تازگی اور جدّت پسندی سے معروف ہو رہا تھا۔ اس کی زندگی کا ایک سنہری دور ایچی سن کالج میں استاد کی حیثیت میں گزرا۔ لیکن اس کے جسم کا ''سچ'' شکاگو جا کر سامنے آیا۔ اس ملک میں وہ ''گے موومنٹ'' (Gay Movement) کا نمائندہ تھا۔ اس کی کتاب ''نرمان'' اس کے ''جسمانی سچ'' کی نمائندہ ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ ہندو پاکستان سے جتنے لوگ مشاعرے پڑھنے کے لیے شکاگو جاتے تھے سب افتخار نسیم کے مہمان ٹھہرتے اور بعض تو ناواجب فرمائشیں بھی کر دیتے اور افتخار نسیم ان کو شرمندہ کرنے سے گریز نہ کرتا۔ اور پاکستان کی عزّت کا تحفظ کرتا تھا۔ یہ سب باتیں افتخار نسیم نے ایک کتاب میں لکھی تھیں جو میرے پاس محفوظ ہے لیکن خوفِ فسادِ خلق سے چھپ نہ سکی۔

انور سدید (لاہور)

عزیز و مکرم گلزار جاوید صاحب! سلام شوق۔

''چہارسُو'' جولائی اگست ۲۰۱۱ء کا شمارہ ملا۔ اس پر ''دلِ مضطرب سے نگاہ شفیقانہ'' ڈالی تو معلوم ہوا کہ ہم پاکستانی اردو زبان کے ایک بڑے گجراتی، بھارتی ادیب انل ٹھکر کے نام اور کام دونوں سے ناواقف ہیں۔ آپ کو ہر بار کوئی نہ کوئی ادبی دھما کا کرنے کی بری عادت پڑی ہوئی ہے۔ سو ہم بے چارے قاری برداشت کیے جا رہے ہیں۔ مگر اب کے دھما کا زیادہ زوردار تھا۔ لہٰذا اُس نے

چونکایا بھی زیادہ۔ایک مضمون میں پڑھا کہ انل ٹھکر ہند آریائی تہذیب کے مقابلے میں ہند اسلامی تہذیب کے ترجمان ہیں۔اچھی بات۔۔۔مگر یہ بحث بے سود ہے ہمارے نزدیک اگر کوئی ادب توحید ورسالت کے تصور سے متصادم نہیں ہے تو اُس پر کوئی چھاپ لگانے کی ضرورت نہیں۔ ڈرامہ، ناول یا افسانہ ہندو ہوتا ہے نہ مسلمان۔ بڑا فنکار وہی کہلاتا ہے جو اعتقادی تعصّبات سے بلند ہو کر سماج کی صحت مند اقدار کی نمائندگی کرے اور انسان کو انسان سمجھے۔انل ٹھکر کے ڈراموں پر بعض ادیبوں کو اعتراض ہے کہ ان میں ادبیت کم ہے۔ڈرامہ (اسٹیج ڈرامہ) تو نام ہی خیر وشر کی کشمکش کو کامیابی سے پیش کرنے کا ہے۔مکالموں میں ادب پیدا ہو جائے تو یہ ڈرامے کا حسن لیکن شرط نہیں۔ادبی ڈراموں کا ذوق ہو تو یک بابی ڈرامے پڑھیے جو ریڈیو کے تقاضوں کے پیش نظر آل انڈیا ریڈیو کے قیام پر شروع کئے گئے تھے۔ اور جن کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

''چہارسو'' کی متعدد تحریروں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ انل ٹھکر کی ناول نگاری کی عمر زیادہ نہیں ہے۔اُن کا پہلا ناول ''اوس کی جھیل'' ۲۰۰۲ء میں چھپا جبکہ اُن کی اپنی عمر اُس وقت ارسٹھ (۶۸) برس تھی۔''اوس کی جھیل'' کا موضوع رشوت ہے۔ظاہر ہے کہ ایک عرصے سے پورا برصغیر رشوت اور دیگر بدعنوانیوں کی لپیٹ میں آیا ہوا ہے۔اُنھوں نے درست موضوع کا انتخاب کیا۔ناول کا انجام رشوت خور کردار کے اعتراف جرم اور اظہار ندامت پر ہوتا ہے وہ بھی ایسے وقت میں جبکہ اُس کا طائر روح پرواز کرنے والا ہے۔یہ وہ وقت ہوتا ہے جب توبہ کے دروازے بند ہو چکے ہوتے ہیں۔انل ٹھکر کا دوسرا ناول ''خوابوں کی بیساکھیاں'' یہ ناول ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا جو بامقصد جرأت مند ناول ہے۔یہ ہندو دھرم کے قدیم عقیدے نیوگ (کسی دوسرے کے نطفے سے بہ رضا بچے کا حصول) پر بھرپور چوٹ ہی نہیں کرتا بلکہ اسے تہس نہس کرتا ہے۔ ہندو دھرم کا اسطوری تصور ایسے بچے کو تو قبول کر لیتا ہے مگر انسانی فطرت کے مطابق بچے کی ماں منگلا اور بچے کے اصلی باپ سوامی کو قبول نہیں کرتا چنانچہ اس زندہ ثبوت کو ختم کرنے کے لیے منگلا کی ساس منگلا اور سوامی کو بے ہوش کر کے سمندر میں پھینکوا دیتی ہے۔گویا دھارمک حل ''نیوگ'' درست مگر ثبوت برداشت نہیں کرتا۔حالانکہ اسطوری لحاظ سے ثبوت بھی قابلِ قبول رہا ہے۔ اس میں مہا بھارت (پانچ پانڈو اِسی نیوگ سے پیدا ہوئے اِسے منتر کا نام دینے سے کیا فرق پڑتا ہے) اور رامائن کے واضح حوالے موجود ہیں۔مزید تحقیق کی ضرورت ہو تو سلیم شہزاد کی تجویز کردہ کتاب ''ہندو دھرم، ہزار برس پہلے'' ص ۱۲۷، ناشر خدا بخش لائبریری پٹنہ سے رجوع کیا جا سکتا ہے (چہارسو، صفحہ ۲۳، شمارہ جولائی، اگست ۲۰۱۱)

کرداروں کو پیش کرنے کے لیے انل ٹھکر نے جس طرح حسب توقع ہلکی پھلکی ہندی زبان کا سہارا لیا ہے وہ بھی اچھا لگتا ہے۔اور ''خوابوں کی بیساکھیاں'' پر سلیم شہزاد (مالیگاؤں بھارت) کا تجزیاتی مضمون کو بھی جی کھول کر داد دینی چاہیے جو نہ صرف بہت محنت اور محبت سے لکھا گیا ہے بلکہ ہمارے ایسے بے خبر لوگوں کی آگاہی کا باعث بھی بنا ہے۔انل ٹھکر کے چار ڈراموں کا مجموعہ ''خالی خانے'' بھی ایسی ہی اخلاقی بے راہ روی سے پیدا ہونے والے معاشرتی انتشار کو پیش کرتا ہے۔اس مجموعے کا ڈرامہ ''اکھڑے لوگ'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔اس کے مکالمے جان دار اور جرأت مند ہیں۔ڈرامہ ''خالی خانے'' جس پر مجموعے کا نام بھی رکھا گیا ہے ایک غیر معمولی انسانی المیے کو پیش کرتا ہے۔ باپ اپنے بیٹے کو کچھ بنانا چاہتا ہے اور بیٹا کچھ اور بننا چاہتا ہے۔اس کشمکش کے انجام پر بیٹے کو محسوس ہوتا ہے کہ میں تو کچھ بھی نہیں۔نہ میرا نام میری مرضی سے رکھا گیا نہ مجھے اپنے مرضی سے مذہب اختیار کرنے کا موقع دیا گیا اور نہ ہی مجھے اپنی مرضی سے اپنا پیشہ اختیار کرنے کا اختیار ملا۔گویا میرے تو سب خانے ہی خالی ہیں۔بہت عمدہ اور بہت ہی عمدہ خیال کو ڈرامے کا روپ دیا گیا ہے۔اس پر بھی عبدالرؤف استاد (گلبرگہ) کا مضمون اپنے اختصار میں اتنی جامعیت لیے ہوئے ہے کہ قاری تک مکمل معلومات پہنچانے کا حق ادا کر دیتا ہے۔

اس سلسلے کا ایک اور بہت ہی اچھا مضمون رؤف خیر (حیدرآباد دکن) کا ہے۔رؤف خیر کا میں غائبانہ مداح ہوں۔ پاکستان کے بعض رسائل میں اُن کے مضامین چھپتے رہتے ہیں اور مجھے مضمون پڑھنے سے پہلے ہی یقین ہوتا ہے کہ یہ بہت اچھا ہوگا۔اُن کے علم وفضل، ژرف نگاہی اور جرأت آمیز طرزِ فکر تینوں کا قدر دان ہوں۔بس دکھ یہی ہے کہ اُن سے تعارف دیر سے ہوا اور یہ کہ اُن کی کوئی کتاب اب تک پڑھنے کو نہیں ملی۔اُنھوں نے انل ٹھکر کی جرأت کو داد تو دی ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ ''خوابوں کی بیساکھیاں'' ایسے موضوع پر کوئی مسلمان ادیب لکھتا تو اُس کا سر قلم کر دیا جاتا۔اُن کے مضمون سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بھارت کا فلمی اداکار سلمان خان اپنے گھر میں گنیش کی پوجا کرواتا ہے مگر لوگ باگ اُسے پھر بھی مسلمان ہی سمجھتی ہے، جیسے سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کو مسلمانوں کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔

آخر میں رؤف خیر، اپنے ممدوح انل ٹھکر کی بعض اوقات غیر ضروری تمہید کے حوالے سے یہ جملہ لکھ کر بات ختم کر دیتے ہیں کہ ''میرے خیال میں تحریر ایسی ہونی چاہیے جس کی تلخیص نہ کی جا سکتی ہو''۔اور میں حضرت رؤف خیر کے قلم کو چومنے کی آرزو کے ساتھ اپنا خط ختم کرتا ہوں۔

امین راحت چغتائی (راولپنڈی)

مکرمی گلزار جاوید صاحب! تسلیمات

قرطاسِ اعزاز کے لیے ایسے خوبصورت ستارے تلاش کرنا آپ کو زیبا ہے اور چہارسو کی زینت۔انل ٹھکر کا نام سن کر کچھ پرانی یادیں تازہ ہو گئیں جب ان کے افسانے ''شمع دہلی'' اور ''بیسویں صدی'' میں پڑھنے کو ملا کرتے تھے۔ لیکن چہارسو کا تازہ شمارہ جولائی اگست ۲۰۱۱ء نے ان کے فن کے کئی پہلوؤں کو نہایت خوبصورتی سے اجاگر کیا۔اب ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہم انل ٹھکر کو جانتے ہیں۔ان کے نام مشاہیر کے خطوط اور آپ کے ''براہِ راست'' نے ان کا مفصّل

تعارف کروادیا۔آپ نے صحیح کہا''ہند آریائی سماج میں جنم لینے والے کسی شخص کا اردو زبان اور ہند اسلامی تہذیب کا متوالا ہو جانا بجائے خود حیرت انگیز بات ہے'' میں سمجھتا ہوں گہرا مشاہدہ ہر انسان کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنا، دکھوں سے عاری دنیا کا خواب دیکھنا اور سچائی کے متوالے اس فنکار کو انل ٹھکر بنا دیا۔قدیر زمان صاحب نے کیا خوب کہا''ادب جو انسانوں کو بدلنے کا سب سے زیادہ مہذب اور امن پسند طریقہ ہے'' آپ نے ان کا نمائندہ افسانہ''اب کیا ہوگا'' جو شامل کیا ہے افسانہ نگار نے اپنا دل چیر کہ رکھ دیا۔میں اب''خوابوں کی بیساکھیاں'' جلد از جلد پڑھنے کے لیے بے چین ہوں۔ان کا ڈرامہ''اکھڑے لوگ'' اور زیر تکمیل ناول''رشتے'' جس کا ایک باب پڑھنے کو ملا۔آج کے نام نہاد ترقی یافتہ سماج کا المیہ ہے۔شمشاد احمد صاحب کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔انہوں نے کس خوبصورتی سے بیان کیا کہ کرکٹ میں کیریئر بنانے کے لیے لگن، شوق اور محنت کے ساتھ ساتھ دعا اور بدعا کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔آغا گل نے''سرسوتی'' میں سرسوتی کا ایک انوکھا روپ دکھایا۔عظمیٰ صدیقی کا افسانہ''فوجی'' خوبصورت اظہار پر مبنی ہے کہ فوجی بھی انسان ہوتے ہیں لیکن ہر کھیل کی طرح جنگ کے بھی اپنے اصول ہوتے ہیں۔جس سے روگردانی نہیں کی جاسکتی۔''تاریخ کی امانت'' معاشرے کے مختلف کرداروں سے سجا آپ کا افسانہ ہمیں منہ چڑاتا ہے کہ اب قبرستان ہی کنج عافیت ہے۔گلزار کی دونوں نظموں''وہ جو شاعر تھا'' اور''آنکھوں کو ویزا نہیں لگتا'' نے متاثر کیا۔

نجیب عمر (کراچی)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موصول ہوا، شکریہ۔میری غزل میں کچھ غلطیاں ہیں، دوسرا شعر میں دستار کا لفظ نہیں شعر دراصل یوں ہے۔

واعظِ قوم بہ ایں جُبّہ ہیں اب تک ناکام
زیبِ تن کاش وُہ تقویٰ کا لبادہ کر لیں

مقطع کے دونوں مصرعوں میں''غزل'' نہیں بلکہ''منزل'' ہے یعنی ''منزل شوق'' اور غزل''جاناں'' اصلاح کروادیں کئی لوگ دوسروں کے متعلق ہار جیت کے قصے چھپوا دیتے ہیں یہ اچھی بات نہیں۔

محمود الحسن (راولپنڈی)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسو'' جولائی اگست کا شمارہ ملا اور اپنی پہلی فرصت میں اسے پڑھ ڈالا۔خطوط کے مطالعے سے لطف اندوز ہوا۔چتر بھوج ٹھکر کے لیے قرطاس اعزاز دیکھ کر حیرانی اور خوشی ہوئی کہ آپ ہمیں کیسے کیسے لکھاریوں سے ملوا رہے ہیں۔''چہارسو کے سرورق اور کبھی کبھی پس ورق پر صاحبِ گوشہ کی اہم تصاویر دیگر علمی و ادبی شخصیات کے ساتھ ہوتی ہیں اگر تصویر میں موجود شخصیات کے نام دے دیئے جائیں تو ہم جیسوں کے لیے آسانی ہو جائے گی۔''براہِ راست'' میں آپ کے علمی و ادبی اور لسانی و سماجی نوعیت کے سوالات اور ٹھکر صاحب کے جوابات سے ہندوستان میں ہندی اور اردو زبان اور تخلیقی ادب کے متعلق مفید معلومات حاصل ہوئیں۔شمس الرحمان فاروقی صاحب کا مضمون''کردار کے خدو خال'' میں انل ٹھکر کی ڈراما نگاری پر مختصراً مگر جامع تبصرہ کیا ہے اور محاسن و معائب کی نشاندہی کی ہے۔''انل ٹھکر اور خالی خانے'' میں عبدالرب استاد نے اُن کی افسانہ نویسی اور ڈراما نگاری کا تجزیہ انہماک سے کیا ہے۔ٹھکر صاحب کا ڈراما ''اکھڑے لوگ'' پرچے میں شامل ہے اور ڈرامے کا تجزیہ بھی یہ ایک اچھا عمل ہے۔''اکھڑے لوگ'' میں ڈرامے کے بنیادی فنی لوازم کی خوبیاں موجود ہیں حقیقت کے رنگوں کے ساتھ ساتھ''تجسس'' بھی ہے۔ٹھکر صاحب کا افسانہ ''آگے کیا ہوگا'' ایک خوب صورت تخلیق ہے۔جس میں محبتوں کے رشتوں اور علم و آگہی کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔''سارک فیسٹیول آف لٹریچر'' میں طاہرہ اقبال نے کانفرنس کے روداد اور تفریحات کا حال دلچسپ انداز میں سنانے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی اور پاکستانی سیاست دانوں عوام کے مزاج و فکر اور طرز زندگی کا موازنہ مؤثر انداز میں کیا ہے۔مسلم دنیا کے ہیرو حسینی مبارک اور صدر قذافی اپنی ہٹ دھرمی اور سازشوں کا شکار ہوئے۔صدر پرویز مشرف کی بات دوسری ہے۔پاکستان کا ہر بڑا سیاست دان پاکستان کو کرائے کا مکان تصور کرتا ہے۔ملک پر اللہ مزید کرم کرے اور ہمیں عقل کے ناخن دے (آمین)۔نیلم احمد بشیر کا افسانہ A.B.C.D ظاہر و باطن کی کہانی ہے۔غافر اور کرن کے کرداروں میں دو معاشرے سانس لے رہے ہیں اندرونِ ذات کا سفر ہے۔پلاٹ پر مزید محنت کرنی چاہیے تھی۔مغربی معاشرے میں نام کو مختصر کر کے پکارنے کا رواج عام ہے مگر افسانے میں اس چیز کا خیال نہیں رکھا گیا جبکہ انہوں نے خود اس جانب اشارہ بھی کیا ہے۔

''پہلے تو یہ بتائیں آپ کا امریکن نام کیا ہے''

''ہاں میری ورک پلیس پہ لوگ مجھے گیا۔۔کہہ کر بلاتے ہیں' غافر مسکرایا (ص۔۵۷) شمشاد احمد کا افسانہ''ہیروز'' بھی ظاہر و باطن کی کیفیت کی کہانی ہے۔تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور محبت کو عداوت کے جذبات کو کہانی کی ضرورت کے تحت پیش کیا گیا ہے۔افسانہ پڑھتے ہوئے افتخار عارف کی نظم''بارہواں کھلاڑی'' یاد آتی رہی۔عظمیٰ صدیقی کا افسانہ''فوجی'' کسی قدر مختصر اور نامکمل لگا۔گلزار جاوید کا افسانہ''تاریخ کی امانت'' موجودہ ملکی اور بین الاقوامی پس منظر کے حوالے سے بڑی جاندار تخلیق ہے۔''چہارسو'' میں تعریف لکھنا کچھ عجیب سا ہے بس اتنا کہوں گا گلزار جاوید زندہ باد۔محمود الحسن، امین راحت چغتائی، ڈاکٹر سید سعید نقوی، شبنم شکیل، غلام مرتضیٰ راہی، فیصل عظیم، پرتپال سنگھ بیتاب، قیصر مسعود، کرامت بخاری، تصور اقبال اور حامد علی سید کی غزلوں میں روایت پسندی اور جدید احساسِ فکر کی روشنی ہے۔مشکور حسین یاد اور عرش صہبائی کی غزلوں کا اپنا رنگ ہے۔یاد صاحب نے غزل کی ردیف''کو لیے بیٹھے ہیں مدت سے'' سے نئے نئے معنی تراشے ہیں۔امجد اسلام امجد نے

چھوٹی بحر اور تنگ قافیوں میں اچھے شعر نکالے ہیں۔اختر رضا سلیمی کی غزل سادگی و پُرکاری کی اچھی مثال ہے۔آصف ثاقب صاحب کی غزل کیا ہے نوحہ ہے۔امریکا کا ایبٹ آباد پر حملے، کھلی بربریت کے پس منظر میں لکھی گئی داخلی و خارجی کیفیت کی کربناکی میں ڈوبی ہوئی غزل ہے۔شعر ملاحظہ کیجیے۔

غریب شہر پہ غیروں کی یورشیں ہیں بہت
وہ قتل کر کے جنازے بہائیں دریا میں

شبنم شکیل کا یہ شعر ہمارے عدالتی، سماجی اور سیاسی نظام کو آئینہ دکھا رہا ہے۔

منصف پر اعتماد بھلا کس طرح سے ہو
پہلے سے علم ہے کہ جو ارشاد ہوگا آج
شبنم شکیل

فیروز عالم صاحب کی خودنوشت سوانح عمری ''ہوا کے دوش پر'' بہت دلچسپ ہے۔میں بڑی توجہ سے اس کا مطالعہ کر رہا ہوں۔اس قسط میں شاہ عبداللطیف کالج (میں اسی درسگاہ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوں) پرتاب بھون بلڈنگ (جواب شہید بےنظیر بھٹو شہید ہائر سیکنڈری اسکول ہے) کا ذکر ہے۔اپنے بڑے بھائی سلطان عالم کا خاکہ ''بھاچپ'' بہت خوب ہے۔فیروز عالم نے اپنے بھائی کی بےلوث محبت اور ایثار کو بہت محبت سے یاد کیا ہے۔فیروز عالم اپنی داستان حیات تو لکھ ہی رہے ہیں مگر اُس کے ساتھ ساتھ وہ ایک خاص زاویے سے میرپور خاص کی تاریخ بھی رقم کر رہے ہیں ان کی یہ داستان یہاں کا حلقہ خاص دلچسپی سے پڑھ رہا ہے۔

فیروز عالم صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ افتخار رانا کا انتقال ہو چکا ہے۔اس خاندان کے کچھ لوگ یہاں آباد ہیں۔آپ کے ایک ہم جماعت محمد حسین جواب ماہر اجمیری کے نام سے بحیثیت شاعر معروف ہیں آپ کو یاد کرتے ہیں۔پروفیسر امیر خاں حکمت (انگریزی) آپ کے انداز خطابت کے گرویدہ رہے ہیں۔میں میرپور خاص سے جاری ہونے والے رسالے ''پہچان'' (مرتبین کرن سنگھ، نوید سروش، ذوالفقار دانش) ارسال کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

نوید سروش (میرپور، سندھ)

گلزار بھائی، آداب۔

چہارسو بروقت ملنے پر خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی! آپ نے انل ٹھکّر صاحب کے لیے عمدہ قرطاسِ اعزاز سجایا ہے۔براہِ راست میں اُن کی پوری شخصیت کھل کر سامنے آ گئی ہے۔انل ٹھکّر صاحب کے گیروی لباس اور منکے والی مالا کے بارے میں سوال بہت ضروری تھا۔اس انٹرویو سے پہلے میں سوچ رہی تھی کہ کچھ لوگ سماج میں رہ کر بھی سنیاسی کی زندگی گزارتے ہیں۔ٹھکّر صاحب نے جواب میں جو پس منظر بیان کیا اُس سے اطمینان بھی ہوا اور ٹھکّر صاحب کے مشاہدے کا بھی پتہ چلا۔آپ کے انٹرویو میں صاحبِ قرطاسِ اعزاز کے ادبی سفر کی پوری معلومات ہوتی ہے مگر اُن کی ذاتی زندگی اور خانگی معاملات و پسند ناپسند کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔بہرحال آپ اور انل ٹھکّر صاحب قابلِ مبارکباد ہیں۔ٹھکّر صاحب کی تینوں تخلیقات پڑھ کر لطف آ گیا۔

گلزار صاحب کا مضمون افسانے ہی کی طرح دلچسپ ہے۔شمشاد احمد صاحب نے ہیروز کو بہت خوبصورتی سے نبھایا ہے۔کھلاڑیوں کے نفسیاتی پہلو کو نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔نیلم احمد بشیر کا A.B.C.D بھی کمال ہے۔تاریخ کی امانت اچھا افسانہ ہے۔اس افسانے کی خوبی یہ ہے کہ اسے ڈرامے کے رنگ میں لکھا گیا ہے۔آغا گل صاحب کا افسانہ ''سرسوتی'' پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔کہانی کو میں اچھا گردانتی اگر وہ صرف مورتی ہوتی مگر آغا صاحب نے مورتی کو ماں سرسوتی کا نام دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جس جگہ سرسوتی ماں کا واس ہوتا ہے وہاں لکشمی نہیں رہتی اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں ماں سرسوتی کی مورتی رکھ دی جائے وہاں تباہی ہوتی ہے یا سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔افسانہ پڑھ کر جہاں آغا صاحب کی علمی بصیرت پر دُکھ ہوا وہیں اس بات پر بھی افسوس ہے کہ گلزار بھائی نے اس طرف دھیان کیوں نہیں دیا۔ایک ادیب کو ہر مذہب کا احترام کرنا چاہیے۔ہوا اس کے برعکس آغا گل صاحب نے تو سرسوتی ماں کو ڈبوں میں بند کر کے کبھی اِدھر پھینکا تو کبھی اُدھر۔بہرحال اس طرح کے حساس موضوع پر احتیاط برتنا لازمی ہے۔

شاعری کا حصہ ہر بار کی طرح اس بار بھی لطف دے رہا ہے۔دیپک کنول کا ایک صدی کا قصّہ ''بمل رائے'' معلوماتی اور دلچسپ ہے۔ہر بار ایک نئی شخصیت سے ملاقات کا سلسلہ لاجواب ہے۔

رینو بہل (چنڈی گڑھ، بھارت)

پیارے گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو کی خوش منظری میسر آئی۔اطلاعِ رسیدگی، میں تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ میری بڑی بہن کا (ایک ہی بہن) کا انتقال ہو گیا تھا۔میں ماتم پرسُن برج وزیرآباد (میرا ننھیال) گیا تھا۔اب واپس آیا ہوں تو خط لکھنے بیٹھا ہوں۔میری بہن (مرحومہ) برسوں پہلے خواتین کے رسالوں (حور وغیرہ) میں افسانے لکھتی تھیں نغمہ ہزاروی کے نام سے۔مرحومہ نے متعدد انعامی مقابلوں میں اول انعام بھی حاصل کیا۔''چہارسو'' کے مشمولات بہت پسند آئے۔آپ اکیلے اتنا بڑا کام کر لیتے ہیں۔اس پائے کا رسالہ نکالنا منہ کا نوالہ نہیں مثل ایک لکڑی کیا جلے اور کیا اجالا ہو آپ کے دم قدم سے باطل ہوئی آپ نے اجالا کر دکھایا۔کچے گھڑے میں پانی بھرنا آپ کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔انل ٹھکر سے اس نہج کا تعارف خوش گوار اور میٹھا میٹھا لگا۔ان کی تحریر خوب ہے۔لفظ ایسا بندھا کہ موتی موتی لگتا ہے۔اچھے اچھوں نے ان کی قلم آرائیوں کی تعریف کی ہے۔جس کو چاہے پیا وہی سہاگن۔انل ٹھکر۔سہاگن نہ سہی تاہم یہ بات ان پر صادق آتی ہے۔ہر طور لکھائی میں سہاگ برستا ہو تو جو بھی کہو سر آنکھوں پر۔

''چہارسُو''

ایک صدی کا قصہ برطابق بمل رائے از دیپک کنول دل کو لگا۔ ان کے گزشتہ مضامین کی طرح یہ بھی ''چشم نم'' سے مصور ہے۔ مدھومتی میری دیکھی ہوئی۔ اس کی موسیقی تم سنگ جنم جنم کے پھیرے آئے نہ کیوں ساجن میرے اس کے نظروں سہانا سفر اور یہ موسم حسیں کو کون بھلا سکتا ہے دیپک کنول نے اپنے مضمون میں بمل رائے کی فلموں کی سی دل کشی بھر دی ہے۔ امید ہے وہ اس طرح کے مضامین سے ہمیں مسلسل نوازتے رہیں گے۔

آپ نے ایبٹ آباد کے سانحے سے متعلق میرے قطعات شائع کئے۔ آپ کی یہ نوازش ان شاء اللہ تاریخ کا حصہ بنے گی۔ کیونکہ یہ سانحہ اتنے بڑے جھوٹ کا شاخسانہ ہے کہ اسے سچ نہیں مانا جا سکتا۔ ایبٹ آباد کے سے پُر امن اور شانت شہر کو ایک بڑی طاقت نے سستی شہرت کے لیے رسوا کیا ہے ہمارے پیارے ملک پاکستان کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے بات وہی ہے چاند کا تھوکا منہ پر۔ میں نے اس خصوص میں اور شاعری بھی کی ہے۔ میں نے ایک دو اور جگہوں کو بھی ایسا کلام بھیجا ہے وہ مصلحت میں پڑ گیا ہے۔ آپ کی بہادری کو سلام۔ آپ کے دل میں ملک وقوم کے لیے درد ہے۔ قرینے سے پتہ چلتا ہے کہ ''چہارسُو'' پاکستان کی محبت کا نقش بند ہے، سرسوتی، فوجی اور تاریخ کی امانت کے مطالعے سے افسانے کی تازگی سے اٹھتا ہوا ایمان تازہ ہو گیا۔ افسانے اچھے بھی ہیں اور دل خوش کُن بھی۔

کالموں اور مضامین ہی سے منصورہ احمد کے انتقال کی خبر ملی؟ بہت دکھ ہوا اس خبر سے۔ منصورہ احمد نے اپنی تمام صلاحتیں اور خدمتیں احمد ندیم قاسمی مرحوم اور فنون کے لیے وقف کر دی تھیں اس امر واقعہ میں کوئی کیسا بھی رنگ کیوں نہ دے۔ اخلاص اور حق پر پردہ نہیں پڑ سکتا۔ منصورہ نے رہبر کارواں کی یاد میں رسالہ ''مونتاج'' جاری کیا جس میں اُس نے ندیم کی روایات کی حتی المقدور پاسداری کی۔ اس ''ناچیز'' کو بھی وہی مقام دیا جو ندیم نے متعین کیا تھا۔ منصورہ احمد کی شاعری بھی پسندیدہ ٹھہری ہے ہر چند بعضے اسے ندیم کی قدر سمجھتے ہیں۔ ندیم کے بعد بھی منصورہ کا قلم رکا نہیں۔ یہ تو ہوتا آیا ہے اور ہو رہا ہے کہ اکثر خواتین شعراء کے کلام کو معرض تشکیک ڈالا جا رہا ہے۔ پس منظر میں کسی ''مرد'' کا ہاتھ ڈھونڈا جا رہا ہے جس نے دستانہ پہن رکھا ہے۔ میں نے ایک شاعرہ کا کلام پڑھا پھر اس شخص کا بھی جس سے شاعرہ کا کلام منسوب کیا گیا ہے۔ مجھے مرد شاعر کا کلام زور زبوں نظر آیا یہ دل نہیں مانا کہ اِس نے اُس کو شعر کہہ کے دیئے ہوں گے۔ احمد ندیم قاسمی کی شاعری تو اعلیٰ پائے کی ہے۔ اس کا عکس کہیں اور نہیں مل سکتا۔ بات سمجھنے کی ہے سمجھانے کی نہیں۔ چہارسو کے جملہ پیرائے خوب ہیں۔ آنکھوں سُکھ کلیجے ٹھنڈ۔

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

محترمی ومکرمی گلزار جاوید صاحب، سلام ورحمت۔

آپ کی محبتوں کا تسلسل ''چہارسُو'' تازہ شمارہ موصول ہوا۔ اس سوغات کی مسلسل اور بلا تعطل ترسیل کے لیے بہت ممنون ہوں۔ قرطاسِ اعزاز ''انل ٹھکر'' چہارسو کی قابلِ تحسین روایت کا اثبات ہے۔ تاریخِ ادب اردو میں اس جریدے کے قرطاس ہائے اعزاز ہمیشہ ایک معتبر حوالے کا کام دیتے رہیں گے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ''براہ راست'' میں بنیادی سوانحی کوائف اور تخلیق کار کے کام کی مختلف جہات روشن ہوتی چلی جاتی ہیں۔ انل ٹھکر کے حوالے سے مقالات کا حصہ بھی ماشاء اللہ بہت دقیع ہے۔ متاعِ چہارسو میں اگر صفحات کا اندراج (یعنی صفحہ نمبر) شامل کر دیا جاتا تو متعلقہ تحریر تک رسائی آسانی پیدا ہو جایا کرے گی۔ اس شمارے کے افسانے ''نیرَ اور پیر صاحب'' ''ہیروز'' اور ''A.B.C.D'' بہت عمدہ ہیں۔ آغا گل اور آپ کا لکھا افسانہ خاصے کی چیز ہیں۔

غفور شاہ (لاہور)

پیارے گُل وگلزار، خوش رہو۔

چہارسو کی Soft کاپی دستیاب ہوتے ہی دیہاڑ یعنی مشقت پر لگ گیا ہوں۔ جس طرح طویل جدائی کے بعد ملاپ میں لطف آتا ہے اُسی طرح اس مشقت میں بھی بڑی راحت ہے۔ انل ٹھکّر پہلے بھی میرے پسندیدہ لکھاری رہے ہیں مگر چہارسُو میں اُن کے رشحات قلم وقلب سے تفصیلی اور بھرپور ملاقات کے بعد میں جی جانے سے اُن کا عاشق ہو گیا ہوں۔ پروردگار نے اُن کے قلم میں بلا کی روانی اور جولانی بھر دی ہے۔ مشاہدہ بھی اُن کا غضب کا اور اندازِ تحریر بھی جداگانہ ہے۔ اگر کوئی کور ذوق چہارسو کی اس خاص مساعی کے بعد بھی ٹھکّر جی کو صفِ اوّل کے لکھاریوں سے دور رکھتا ہے تو اس میں سارا قصور خود اُسی کا شمار ہونا چاہیے۔ دیگر افسانے یعنی گلزار صاحب، شمشاد صاحب، نیلم احمد بشیر اور آغا گل بہت خوب ہیں۔ اور جناب آپ تو پھر آپ ہیں۔ موجودہ عالمی اور علاقائی پس منظر میں آپ کا افسانہ ''تاریخ کی امانت'' HOMER کے رزمیوں کی یاد دلاتا ہے۔ حیرت ہے کہ آج کے گُم سُم معاشرے کی بے خبری اور بیگانگی کے باوجود آپ صحرا میں مسلسل اذان دیتے جاتے ہیں۔ شاعری کا انتخاب عمدہ ہے آپ کی مزید توجہ اسے بہترین بھی بنا سکتی ہے۔ By The Way ہارڈ کاپی کے لئے اور کتنا انتظار درکار ہے؟

یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا)

گلزار جاوید صاحب، آداب۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ بابت جولائی۔ اگست ۲۰۱۱ء ہمدست ہوا۔ شکریہ۔ یہ شمارہ جناب انّل ٹھکر کی ادبی کاوشوں اور صلاحیتوں کا واضح عکس ہے اور اسی لئے اُن کا قرطاس اعزاز سے نوازا جانا اُن کی شخصیت کو چار چاند لگاتا ہے۔ جہاں انل ٹھکّر صاحب کی عظمت کے گُن گا کر چوٹی کے فنکاروں نے اپنی رائے پیش کی ہے وہیں ''خوابوں کی بیساکھیاں'' کی اشاعت پر آپ کے سوال کے جواب میں (براہِ راست کے صفحہ ۱۱) جناب انل ٹھکّر صاحب فرماتے ہیں کہ ''اس

ناول کو لکھنے کے بعد کوئی مخالفت یا مخاصمت کچھ بھی نہیں ہوا۔ کیونکہ اِس ناول میں کسی قوم یا مذہب کی برائی نہیں کی گئی''۔ بجا فرمایا ہے ٹھکّر صاحب نے! اُنہوں نے برائی بالکل نہیں کی لیکن ایک عورت سے یہ ضرور کہلوایا ہے کہ ''یہ ایم ایل اے ہے۔ میرے شوہر کی رضامندی سے، شوہر کی ترقی کیلئے، مجھے منسٹر صاحب کے پاس لے جا رہا ہے۔ یہ تو پُجاری ہے۔ صرف پرساد چکھ رہا ہے۔ میرا بھگوان تو بنگلور میں ہے۔ میرا بھوگ کل منسٹر صاحب لگائیں گے''۔ اگر بقول ٹھکّر صاحب یہ کسی قوم یا مذہب کی طرف اشارہ نہیں بھی ہے تب بھی وہ ''عظمت نسواں'' کا کیا ہوا جس کی پیروی ہر قوم اور مذہب میں ہے۔ ہر صنف نازل کی عزت اور احترام کرنے والا تو یہی کہے گا کہ حالانکہ اِس عورت کا بیان بالکل سیدھا سادہ ہے لیکن اس کا ایک ایک لفظ چیخ چیخ کر اپنا درد بیان کر رہا ہے جس کو سُن کر کم از کم میرے جیسا انسان تو کرّاہ اٹھتا ہے۔ ''خوابوں کی بیساکھیاں'' پر جناب سلیم شہزاد کا میں بہت شکر گزار ہوں جنہوں نے ہندو دھرم پر بہت گہری ریسرچ کی ہے۔ اور بیشتر نئی نئی باتیں منظر عام پر لائے ہیں کئی نئے نئے الفاظ جیسے ''تخم ریزی'' ''نیوگ'' سے روشناس کرایا ہے جو پہلے میری ڈکشنری میں نہیں تھے۔ ایک اخبار میں جب میں نے ''عظمت نسواں'' کی دھجیاں اُڑتی ہوئی دیکھیں۔ دو ایک کہانیاں عُریانیت سے بھرپُور اور انسانیت سے شرمسار پڑھیں تو فوراً ایڈیٹر صاحب کو فون کر کے اپنے اعتراض اور ناراضگی کا اظہار کیا تو اُن کا جواب تھا ''جناب ہم کیا کریں۔ آج کل لوگ اِسی قسم کی کہانیاں ہی پسند کرتے ہیں''۔

جناب گلزار صاحب کا لکھا ہوا ''کلدیپ نیئر اور پیر صاحب'' بہت ہی دلچسپ افسانہ ہے۔ کلدیپ نیئر صاحب تو مجھے نہیں جانتے لیکن میں اُن کا بچپن سے پرستار ہوں۔ گلزار صاحب کو پُر اثر تخلیق پر دلی مبارکباد گلزار صاحب ہمارے ملک کے چوٹی کے شاعر ہیں اُن کے بارے میں کچھ کہنا سُورج کو چراغ دکھانا ہے۔ جناب مہندر پرتاپ چاند کی غزل بہت اونچے درجہ کی ہے جو اُنکی پختہ سوچ کی ترجمانی کرتی ہے۔ جناب عرش صہبائی کی غزل

ناحق بھٹک رہا ہے کس کے خیال میں
اس ضد کو چھوڑ خود اپنی تلاش کر

سیدھی رُوح پر اثر کرتی ہے۔ جناب ستیہ پال آنند کو عہد شباب کیلئے۔ جناب محمود شام کو بنت وطن کیلئے اور جناب گلزار صاحب کو ''آنکھوں کو ویزا نہیں لگتا'' کیلئے، ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ کو فضائے محبت کیلئے، بہت بہت مبارکباد۔

کرشن نندہ (چندی گڑھ، بھارت)

برادر محترم گلزار جاوید صاحب، سلام و رحمت۔

تازہ شمارے میں قرطاسِ اعزاز انل ٹھکر کے نام ہے۔ موصوف ایک کہنہ مشق لکھاری ہیں اور تین اصناف ادب ناول، افسانہ اور ڈرامہ میں خاصا دقیع کام کر چکے ہیں۔ ''چہارسو'' کا قرطاس اعزاز انہیں زیبا ہے۔ پروفیسر شمس الرحمان فاروقی نے اپنے مضمون ''کردار کے خدوخال'' میں اردو ڈرامے کا اسلامی تہذیب کے پس منظر میں جائزہ لیا ہے اور بجا طور پر ناول اور ڈرامہ دونوں میں اختیار کی کشمکش کے بڑی حد تک مشترک ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے، نیز اردو میں ڈرامہ کی کمی کے اسباب تلاش کرنے کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے فاضلانہ انداز میں انیسویں صدی کے دوران انگریزی ڈرامے کے ارتقائی سفر میں تعطل پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے انل ٹھکر کے ڈراموں کو اسٹیج کے کامیاب ڈرامے قرار دیا ہے۔

قدر یزمان نے انل ٹھکر کو بعض معروف قلمکاروں کی آراء کے حوالے سے ہی نہیں اپنے دلائل و براہین سے بھی ہند آریائی و ہند اسلامی تہذیب کا نمائندہ ادیب ثابت کیا ہے۔ سلیم شہزاد کے مطابق انل ٹھکر نے فکشن کی مختلف اصناف میں اہم تصانیف معاصر ادب کو دی ہیں۔ ''خوابوں کی بیساکھیاں'' کو انہوں نے انل ٹھکر کا کلاسک اہمیت کا ایک ناول تسلیم کیا ہے۔ بقول شہزاد صاحب انہوں نے لفظ کلاسیک کو اصطلاحی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ ''خالی خانے'' انل ٹھکر کے ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ جس میں چار ڈرامے شامل ہیں۔ عبدالرب استاد نے چاروں ڈراموں کا دقّت نظر سے جائزہ لیا ہے۔ ان کے بقول انل ٹھکر کے ڈراموں میں معاشرتی مسائل پیش کئے گئے ہیں۔ ان کا اسلوب اظہار شستہ ہے اور مکالمے جاندار ہیں، جن میں انہوں نے میر کی سہل ممتنع والی کیفیت پیدا کر لی ہے۔ رؤف خیر کا مضمون ''خوگر کا تھوڑا سا گلہ'' خاصے کی چیز ہے۔ انہوں نے انل ٹھکر صاحب کی تخلیقی جہات اور فنی زاویوں کا گہرے تنقیدی شعور سے تجزیہ کیا ہے۔

نثر ہو یا نظم گلزار کا قلم دل کو چھو لیتا ہے۔ پیش نظر مضمون ''کلدیپ نیئر اور پیر صاحب'' میں نیر صاحب کی چوٹوں کا درد انہوں نے نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ اسے ہم قارئین کے بھی رگ و ریشہ میں اتار دیا ہے۔ مضمون میں کئی ایسے مقامات ہیں جہاں دھاڑیں مار کے رونے کو جی چاہتا ہے۔ خدا جانے ہمیں کیوں ایسا لگتا ہے کہ گلزار اس دنیا کا انسان نہیں۔ شمشاد احمد کا افسانہ ''ہیروز'' اسلوب اظہار کی مقناطیسیت کے باوصف گرفت میں نہیں لے سکا ہے۔ افسانہ نگار اس افسانے میں کیا کہنا چاہتا ہے، یہ ہم نہیں سمجھ پائے ہیں۔ نیلم احمد بشیر کا افسانہ ''A.B.C.D'' فنّی اعتبار سے ایک مکمل افسانہ ہے۔ جس میں پلاٹ، کہانی، واقعات کی بُنت، تجسس، عروج، انجام غرض پوری پہلو ایک قابل تقلید مثال ہے۔ پختگی زبان و بیان نے تو اس بیانیے کو ناقابل فراموش بنا دیا ہے۔ آغا گل ایک منجھے ہوئے کہانی کار ہیں۔ افسانہ کو حقیقت اور حقیقت کو افسانہ بنانا آغا گل کا فنّی اختصاص ہے۔ ''سرسوتی'' جیسا افسانہ لکھنا تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ آبگینوں کو ٹھیس لگنے کا ہمہ وقت خوف رہتا ہے۔ مگر آغا صاحب نے اس کمال فن سے کہانی کا تار و پود تیار کیا ہے کہ کسی کی دل آزاری کا امکان تک پیدا نہیں ہونے دیا ہے۔ گلزار جاوید کے افسانہ ''تاریخ کی امانت'' ایک معنی خیز کہانی ہے، جو ان کے سلیقۂ اظہار کی مظہر ہے۔ گلزار جاوید کے جذبۂ اصلاح و تعمیر نے ہمیں ہمیشہ متاثر کیا ہے۔

نظمیہ دانش کی انتہاؤں پر براجمان ستیہ پال آنند عصر حاضر میں ایک شعری جینئس کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ رجائیت ان کی شاعری کی ایک نمایاں خصوصیت (Salient feature) ہے۔ لیکن پیش نگاہ نظم بعنوان ''DUAL'' میں انہوں نے رجائیت کا ایک ایسا رخ پیش کیا ہے، جو معاصر نظم نگاروں میں کسی کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتا۔ سرطان ایسے موذی مرض سے مبارزت اور وہ بھی عہد پیری میں اور پھر اسے چت کرنے کا یقین۔۔۔ یہ وہ عوامل ہیں۔ جو شجاعت و حوصلہ مندی کی ایک نئی تہذیب سے متعارف کراتے ہیں اور فرمان ربّی ''لا تقنطو من رحمت اللہ'' کی عملی تفسیر و تعبیر کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ نظم ''بنت وطن'' محمود شام کے جذبۂ حب الوطنی کے ساتھ ساتھ ان کی فکری دیانت پر بھی دلالت کرتی ہے۔ گلزار نے اردو نظم کو نیا ڈکشن، نئے موضوعات اور نئی سوچ دی ہے۔ ہمارے نزدیک انہوں نے نظم کی ایک نئی بوطیقا دریافت کی ہے۔ تازہ ''چہارسو'' میں شامل اشاعت ان کی دونوں نظمیں ''وہ جو شاعر تھا'' اور ''آنکھوں کو ویزا نہیں لگتا'' ہمارے دعوے پر دال ہیں۔ ایسا لگتا ہے گلزار جی اُس پار سے زیادہ اِس پار زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ کیونکہ آنکھوں کو ویزا نہیں لگتا اور سپنوں کی سرحد نہیں ہوتی۔ پروین شیر، فیصل عظیم اور صفوت علی صفوت کی نظمیں بھی ہمیں اچھی لگی ہیں۔

قیصر نجفی (کراچی)

پیارے بھائی گلزار جاوید صاحب! آداب و نیاز۔

جولائی۔ اگست ۲۰۱۱ء کا شمارہ موصول ہو گیا تھا۔ آپ کی سچی لگن اور صادق جذبے قابلِ داد ہیں کہ اس قدر مصروفیات کے باوجود آپ نے اتنا خوبصورت شمارہ بروقت شائع فرما کر اِسے فوراً سب کو بھجوا بھی دیا۔

اب کی بار قرطاسِ اعزاز انل ٹھکر صاحب جیسے قابل تعظیم ادیب کے نام کر کے آپ نے ایک نہایت ہی مقدّس فریضہ انجام دیا ہے۔ ان کی تمام تحریروں کے موضوعات صادِق اور صالح جذبات پر مبنی ہیں اور اُن کے بیانیہ میں بھی واقعی بلا کا جادو ہے۔ کلدیپ نیئر اور پیر صاحب سے متعلق گلزار صاحب کی رُوداد بھی بے حد دلچسپ ہے اور معنی خیز بھی۔

اسی شمارے میں اتنی صاف ستھری تحریروں کے ساتھ ساتھ آغا گل صاحب کی کہانی پڑھ کر نہایت ناخوشگوار حیرت بھی ہوئی اور بے حد دُکھ بھی ہوا۔ سرسوتی، علم و ادب، موسیقی اور قوّتِ نطق کی ایک بے ضرر دیوی ہے۔ ان سے متعلق اس طرح کے مافوق الفطرت، من گھڑت اور حقیقت سے یکسر بعید واقعات منسوب کر کے آغا گل صاحب نے دانستہ نہ صرف ہندوؤں بلکہ ''چہارسو'' کے تمام انسان دوست قارئین کے جذبات کو مجروح کیا ہے۔

یقیناً آپ اُن دنوں عزیزی فاری شا کی شادی خانہ آبادی کی تقریبات کی گہما گہمی میں اس کہانی کو خود دیکھ نہ پائے ہوں گے ورنہ ایسی لچّر اور واہیات کہانی کو ''چہارسو'' میں کبھی جگہ نہ دیتے۔ خیر اب آپ بھی کیا کر سکتے ہیں! میں دعا گو ہوں کہ خدائے بزرگ و برتر آغا گل صاحب کو عقلِ سلیم عطا فرمائے اور وہ آئندہ ایسا تخریبی ادب تخلیق کرنے سے احتراز کریں جو آپسی رشتوں میں نفرت پھیلاتا ہے۔

دیگر نثری تحریریں بھی سبھی اچھی ہیں۔ ''تاریخ کی امانت'' میں آپ نے موجودہ معاشرے کے گھناؤنے کرداروں کی پیٹھ پر جس طرح کوڑے برسائے ہیں وہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔ بمل رائے سے متعلق دیپک کنول صاحب کا مضمون ہمیشہ کی طرح بے حد دل چسپ ہے اور معلوماتی بھی۔ ان کے یہ تمام مضامین بعد ازاں کتابی صورت میں شائع ہو جائیں تو بہت خوب رہے گا۔

ہاں اب کی بار حصّہ نظم قدرے کمزور لگا۔ بہر حال حضرات محمود شام، امین راحت چغتائی، امجد اسلام امجد، عرش صہبائی اور اختر رضا سلیمی کا کلام لائق توجہ ہے۔

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ، بھارت)

بقیہ: چراغِ رخِ زیبا

ہے / یونہی کچّا بدن پتھر کا بنتا ہے / تمہیں تو علم ہے میرؔا! یہ دنیا ہے / یہاں محلوں سے ٹوٹے جھونپڑوں تک / ہر قدم پہ اک عدالت ہے / جو فردِ جرم ہی تیار کرتی ہے / یہاں موجود لمحے میں تو ہر شے کی جزا / بس وِش کا پیالہ ہے / مگر انصاف کی تاریخ لمبی ہے۔

ارون دھتی رائے کے نام ان کی نظم سے اقتباس۔

ارون دھتی رائے کے نام

پیاری لڑکی! / تم کو میں نے خواب میں دیکھا / تم ٹوٹے خوابوں کی کرچیں جوڑ رہی تھیں / زخمی زخمی ہاتھوں سے خوں بھی ٹپکا تھا / یاد ہے جب دونوں ملکوں نے / آگ کے ہتھیاروں سے آتش بازی کی تھی / ہم دونوں کتنا تڑپے تھے / روتے روتے میں نے / شہر کے منصب دار کی منّت کی تھی / دیکھو، میں بھی اِک شہری ہوں / ساری دنیا کی شہری ہوں / میرے لفظوں کو بھی لوگوں تک پہنچاؤ / اس نے مجھ سے یہی کہا تھا / ایسے بے منصب لوگوں کے / لفظوں کی توقیر نہیں ہے / دنیا یوں بھی فخر کی آوازوں سے / اتنا گونج رہی ہے / کٹے پھٹے جسموں کی باتوں میں / کوئی تاثیر نہیں ہے / جشن بپا ہے / جشن میں شامل ہونا ہے تو / حاکم کی توصیف میں اک آواز اٹھاؤ / ورنہ بالکل چپ ہو جاؤ / اس دنیا میں طاقت ہی / طاقت سے ٹکر لے سکتی ہے / آؤ ہم آوازوں میں آواز ملائیں / اپنے پاس بھی پتھر کے انبار لگائیں / سارے لٹے پٹے ہاتھوں کو جوڑ کے / اک زنجیر بنائیں / اور دنیا کے ہر کونے میں دیئے جلاتے جائیں / ہم جگنو بھی بن پائے تو / رات مکمل کیسے ہوگی؟ / آؤ اس بے انت سفر کی پہلی منزل تک چلتے ہیں۔

..... اذانِ اقبال .....

محترم پروفیسر خیال آفاقی کو، شاعرِ اسلام حضرت علامہ اقبال سے جو قلبی و روحانی تعلق ہے، وہ بعینیہ ایسا ہے جیسا کہ حضرت علامہ کو اپنے پیر رومی سے تھا۔ آفاقی صاحب کی تمام شخصیت پر، اقبال علیہ رحمہ کا رنگ اس قدر غالب ہے کہ ان کے ہر ہر انداز میں مردِ قلندر کی ادا محسوس ہوتی ہے، انداز شاعری تو لاریب، اقبالیات کے پرتو میں سانس لیتی نظر آتی ہے۔

پروفیسر صاحب کے تین شعری مجموعے، شب نامہ، رودِ خیال اور نفسِ جبرئیل پر علامہ کا عکس جمیل اس طرح منعکس ہے کہ دیدہ ورانِ ادب ان کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد، اپنی آراء میں برملا اس بات کا اظہار کر چکے ہیں کہ ''خیال آفاقی کی شاعری میں روح اقبال واضح طور پر نظر آتی ہے۔'' نثر کے حوالے سے بھی آفاقی صاحب اقبال فہمی میں اپنا حصہ ڈالتے رہے ہیں اکثر اقبالؒ کے مختلف گوشوں پر گفتگو فرماتے رہے ہیں، کچھ عرصہ قبل، بزمِ اقبال کے زیر اہتمام، آپ نے مسلسل اظہار خیال فرمایا۔ یہ تمام گفتگو ہمارے پاس ریکارڈ تھی، خیال آیا، اسے کیوں نہ کتابی شکل میں پیش کر دیا جائے، چنانچہ اس کی املا کرائی گئی، پھر تمام مسودہ آفاقی صاحب کو نظر ثانی کے لئے پیش کیا گیا جو انہوں نے ایک ہلکا سا جائزہ لے کر بہت جلد مجھے لوٹا دیا، اور اس طرح یہ قیمتی باتیں کتابی شکل میں شائع ہو کر اہلِ ذوق کے سامنے آ سکیں۔ یقیناً نوجوانوں کے لئے اقبالؒ کو سمجھنے میں یہ کتاب بہت مددگار ثابت ہوگی۔

..... مقصود پرویز (پروفیسر)

دستیابی: جہانِ حمد پبلی کیشنز، نوشین سینٹر، دوسری منزل، کمرہ ۱۹، اردو بازار، کراچی۔ قیمت: ۵۰۰ روپے

..... زمیں اور زماں اور .....

ضیاء حسین ضیاء کی شخصیت کا مضبوط ترین حصہ اس کی نثر ہے۔ اس کے ہاں الفاظ کا انتخاب اور استعمال مثالی اور حیران کن ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اس کی نثر بھی شاعری سے الگ کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ذخیرۂ الفاظ کا یہ عالم ہے کہ اسے ایک ''چلتی پھرتی لغت'' کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ شاعری سے بھی باز نہیں آیا۔ نظمیں لکھیں تو کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ اسے بھی کافی نہ سمجھا تو آستینیں چڑھا کر غزل کا رخ کر لیا۔ یہ ایک بڑی تبدیلی ہے کیونکہ نظم گو شعراء غزل کو کچھ زیادہ منہ نہیں لگاتے۔

ضیاء حسین ضیاء کے بارے میں پوری سہولت سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ مضمون کا شاعر ہے اور اپنے فلسفیانہ تفکّر کی وجہ سے دل کو پگھلا دینے والے اشعار اس کے ہاں کم کم ہی دستیاب ہیں۔ چنانچہ پہلی قرأت میں تن آساں قاری کو گوہرِ مقصود ہاتھ نہ بھی آئے تو دوسری بار پڑھنے سے یہ شاعری اپنا آپ کھولنا شروع کر دیتی ہے اور پھر چل سو چل۔ بیشک یہ شاعری ایسی ہے کہ محبوبہ کو خط لکھنے کے لیے اس میں سے اشعار نہ بھی ملتے ہوں، یہ آپ کو سوچ اور سمجھ کے ایک اور ہی راستے پر ضرور ڈال دیتی ہے۔

چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ نام نہاد تغزل کی بیوست زدہ فضا میں یہ شاعری ایک تازہ ہوا کے جھونکے کی حیثیت کی حامل ہے۔ یہ شاعری عام آدمی کے لیے نہیں ہے۔ شاعری عام آدمی کے لیے ہوتی بھی نہیں۔ اس کا ڈکشن انوکھا ہے نہ پیرائیہ اظہار۔ یہ اگر انوکھی ہے تو اپنے مواد اور موضوعات کے حساب سے۔ فیضؔ نے ن۔م۔ راشد کے بارے میں کہا تھا کہ اس کا دماغ مجھ سے بڑا ہے۔ چنانچہ ضیاء کی شاعری بڑے دماغ کی شاعری ہے اور اس کا ذائقہ فیضؔ سا نہیں بلکہ راشدؔ کی طرح کا ہے۔

''زمیں اور زماں اور'' آپ کے سامنے ہے۔ ضیاء حسین ضیاء کے اشعار میں لفظ کا غیر معمولی استعمال اور تصرف کی غیر متوقع صورت حال دیکھیں کہ اسے اس پر کتنا کمال حاصل ہے۔

..... ظفر اقبال

دستیابی: زرنگار ہاؤس، P.148.149 عمران روڈ، خیابان کالونی، (مدینہ ٹاؤن) فیصل آباد۔ قیمت: ۳۰۰ روپے

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
بیاض عمر اور دوسری نظمیں
ستیہ پال آنند
ستیہ پال آنند کے کچھ انگریزی شعری مجموعے
ستیہ پال آنند کے کچھ شعری مجموعے